فقہ المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

۳ جلد یکجا مجلّد

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 2631861

فقه المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے
شرعی احکام

کامل ۳ جلد یکجا

جلد اوّل

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی واستاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دار الاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی

طباعت : فروری ۲۰۰۷ء علمی گرافکس

ضخامت : 291 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

……ملنے کے پتے……

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی

بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور

بیت العلوم 20 نابھ روڈ لاہور

مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A.

فہرست مضامین ﴿جلد اول﴾

مصنف کا مختصر تعارف

ابتدائی تعارف:

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی احسان اللہ شائق ارکانی صاحب اطال اللہ بقاءہ یکم شوال ۱۳۸۳ھ بمطابق 1963ء میں پیدا ہوئے، قرآن کریم ناظرہ اور دینیات کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد الحاج مولانا شائق احمد رحمہ اللہ فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور کے پاس پڑھیں، 1977ء میں جامعہ فاروقیہ کراچی میں داخلہ لے کر باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا، یہاں پر ایک ہی سال میں اعدادیہ اور درجہ اولی کی تمام کتابیں پڑھیں، یہاں پر حضرت مولانا محمد یوسف افشانی صاحب زیدہ مجدہ سے خصوصی تعلق رہا، درجۂ ثانیہ کی کتابیں مدرسہ مدینۃ العلوم شمالی ناظم آباد میں پڑھنے کے بعد 1980ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا، یہاں درجہ ثالثہ سے موقوف علیہ تک کی تمام کتابیں پڑھیں۔ اس دوران حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن کاملپوری رحمہ اللہ، حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ اور مفتی عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم سے خصوصی تعلق رہا، اس دوران حضرت اقدس مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ سے خصوصی تعلق پیدا ہو گیا تھا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے اصلاحی تعلق کے علاوہ تلمذ کا شرف بھی حاصل رہا جس سے فقہ میں خاص مناسبت پیدا ہوئی، پھر اپنے شیخ ہی کے مشورہ سے دورۂ حدیث کے لیے جامعہ دارالعلوم کراچی میں داخلہ لیا اور 1986ء میں ممتاز نمبروں کے ساتھ سندِ فراغت حاصل کی، اس کے بعد جامعہ دارالعلوم کراچی ہی سے تخصص فی الافتاء کیا، اس دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمہ اللہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب زید مجدہم سے خاص تعلق رہا، نیز تخصص کے ساتھ سرکاری بورڈ میں امتحان دے کر میٹرک بھی پاس کیا۔

زندگی کا دوسرا دور:

تخصص فی الفقہ سے فراغت کے بعد دو سال تک جامعہ اشرفیہ حقانیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے، اس کے بعد 1990ء سے جامعہ حمادیہ شاہ فیصل کالونی کراچی میں تدریس اور افتاء کے منصب پر فائز ہوئے۔ 13 سال تک یہاں خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران حضرت مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب زید مجدہم کی نگرانی میں آٹھ سال تک افتاء کا کام سرانجام دیتے رہے، پھر پانچ سال تک دارالافتاء جامعہ حمادیہ کے مستقل ذمہ دار کی حیثیت سے فتویٰ کا کام کرتے رہے ۱۴۲۳ھ بمطابق 2003ء سے تا حال، جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی میں درجہ علیا کی کتابوں کی تدریس کے

ساتھ دارالافتاء سے بھی منسلک ہیں، اس طرح اب تک تین ہزار سے زائد فتاوی تحریر فرما چکے ہیں۔

تصنیفات:

حضرت استاذِ محترم، تدریس وافتاء کے علاوہ ماشاءاللہ صاحبِ قلم بھی ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں اصلاحی مضامین کے علاوہ اب تک چھوٹی بڑی 25 کتابیں بھی تصنیف فرما چکے ہیں، جن میں چند ایک یہ ہیں:

زادِ مسافر، سبق آموز واقعات، خواتین کی نماز کے احکام، اسلام کے پانچ بنیادی ارکان، گانا، بجانا قرآن وحدیث کی روشنی میں، تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام، داڑھی اور بالوں کے احکام، عطر ہدایہ کی تسہیل، حلال وحرام کے احکام، حیاۃ المسلمین کی تسہیل۔

جامعہ حمادیہ میں قیام کے دوران ایک رسالہ بنام ''بچوں کی ابتدائی دینی تعلیمات'' لکھ کر اپنے پیر ومرشد حضرت فقیہ العصر مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں جمعہ کے دن پیش کیا۔ اگلے جمعہ کو حضرت رحمہ اللہ نے حلقۃ العلماء میں تبصرہ فرمایا: ''کہ انہوں نے ایک رسالہ مجھے دیا کچھ دن تک تو یہ رسالہ میرے سرہانے رکھا رہا، میں سوچتا تھا کہ یہ تو بچوں کے لیے ہے اور میں بچہ تو ہوں نہیں، اسے پڑھ کر کیا کروں گا، لیکن یوم الثلاثہ کے دن اسے اٹھا کر پڑھا تو ماشاءاللہ بہت خوب۔ یہ تو بڑوں کے لیے ہونا چاہیے تھا۔''

پھر حضرت نے اس کا کچھ حصہ اہل مجلس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد بہت سے مہتمم حضرات نے اسے اپنے اپنے مدرسوں کے مکاتب میں باقاعدہ داخل نصاب کرلیا۔

کچھ مصنف کے بارے میں:

زیرِ نظر تصنیف ''جدید معاملات کے شرعی احکام'' یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے، جس میں جدید دور کے مسائل کا قرآن وحدیث، فقہ کی قدیم وجدید کتابوں سے نہایت آسان حل پیش کیا گیا ہے، خرید وفروخت کے احکام، کرایہ، شرکت، کفالت، رہن، سونے چاندی کی تجارت، درآمد وبرآمد، وقف وغیرہ کے تمام ہی مسائل کا حل اس میں موجود ہے، یہ کتاب جہاں مفتیانِ کرام کے لیے رہنمائی کا کام دے گی وہاں عام پڑھا لکھا طبقہ، علماء وخطباء، اسکول وکالج اور مدارسِ دینیہ کے طلبہ سب کے لیے یکساں مفید ہوگی۔ ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ استاذ محترم کی حیات دراز فرمائیں، مزید خدماتِ دینیہ کے لیے قبول فرمائیں، خصوصاً اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور امت کے لیے نافع بنائیں۔ آمین

بندہ احمد افنان

استاذ جامعۃ الرشید

احسن آباد کراچی

عرضِ مؤلف

الحمد لله رب العلمين، والصلوٰة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين، امام الحنفاء، وسيد الانبياء نبينا محمد وعلى آله وصحبه اجمعين، والتابعين لهم باحسان الى يوم الدين.

ہر مسلمان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دین صرف عبادات تک محدود نہیں ہے کہ انسان نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی پابندی کرے اور سمجھ لے کہ دین پر عمل کرنے کی ذمہ داری پوری ہوگئی ہے، بلکہ مکمل دین تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی پابندی کرے، چاہے وہ احکام عقائد سے متعلق ہوں یا اخلاق سے، عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، آدمی جس طرح مساجد میں اللہ تعالیٰ کی عبادات کو انجام دیتا ہے، اسی طرح بازاروں، دفاتر، عدالت، خرید و فروخت اور دیگر لین دین اور معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگے یعنی تمام معاملات احکامِ شرع کے مطابق انجام دے۔ اسی سے دنیا و آخرت کی کامیابی نصیب ہوگی۔

اس لیے عبادات کی طرح معاملات کے شرعی احکام کو سمجھنا بھی انتہائی اہم ہے، کیونکہ لوگوں کے درمیان جو معاملات انجام پاتے ہیں، بیع و شراء، اجارہ، شراکت داری، کفالت و وکالت، سونے چاندی کے کاروبار، قرض، ادھار، رہن وغیرہ سب معاملات کے متعلق شریعتِ مطہرہ کے واضح احکام موجود ہیں، ان کی پابندی نہ کرنے سے انسان حرام خوری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معاملات کو حلال طریقہ سے انجام دہی کا حکم فرمایا ہے:

قوله تعالىٰ: ﴿ يايها الذين آمنوا اوفوا بالعقود ﴾ (سورة المائدة)

قوله تعالىٰ: ﴿ واوفوا المكيال والميزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشياء هم ﴾ (١١-٨٥)

یعنی ناپ تول پورا کرو اور لوگوں کے لیے ان کی چیزوں میں کمی مت کیا کرو اور اللہ تعالیٰ نے حرام خوری کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ سمعون للكذب اكلون للسحت ﴾ (٥-٤٢)

یعنی یہ لوگ غلط باتوں کے سننے کے عادی ہیں اور بڑے حرام کھانے والے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات و احادیث میں حلال کھانے کا اور حرام خوری سے بچنے کا حکم فرمایا ہے اور حرام خوری پر سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں:

كقوله عليه السلام : " اتقوا الظلم فإن الظلم ظلمات يوم القيامة واتقوا الشح فإن الشح أهلك من كان قبلكم حملهم على أن سفكوا دمائهم واستحلوا محارمهم ." (رواه مسلم)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ظلم سے بچوں کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی ظلمتوں کا باعث ہوگا اور حرص سے بچو کیونکہ حرص ہی نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا انہیں خون بہانے اور حرام کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔

وقوله عليه السلام : " ألا لا تظلموا . ألا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه ." (رواه البيهقي)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سنو! ظلم مت کرو، سنو! کسی کا مال اس کی دلی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔ (بیہقی)

بہر حال معاملات شریعت کے مطابق انجام نہ دینا یہ عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ اس سے انسان دانستہ و نادانستہ طور پر حرام خوری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے خیال پیدا ہوا کہ حرام و حلال کے متعلق احکام خصوصاً معاملاتِ جدیدہ یعنی نئے پیش آنے والے معاملات مثلاً: تجارت، اجارہ، قرض وغیرہ کے احکام کو قرآن و حدیث، فقہاء متقدمین و متاخرین کے اقوال سے اخذ کر کے امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کیے جائیں اور انداز انتہائی آسان رکھا جائے تا کہ عمل کرنے والوں کے لیے مسائل کو سمجھنا آسان ہو، چنانچہ اب ان مسائل کا مجموعہ کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے جو کہ "جدید معاملات کے شرعی احکام" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں شیخ محمد صابونی زید مجدہم کی کتاب "فقہ المعاملات" سے بھی مدد لی گئی ہے، بلکہ شروع کی ابتدائی مباحث اسی کتاب سے ماخوذ ہیں، اس کے علاوہ فقہ حنفی کی قدیم و جدید کتب سے مدد لی گئی، نیز استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم اور میرے مربی و مرشد حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق کتاب "احسن الفتاویٰ" سے خصوصی رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان اکابر کی طرح بندہ کے "جہدِ مقل" کو بھی قبول فرمائیں اور امتِ مسلمہ کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنائیں۔ آمین

راقم الحروف
احسان اللہ شائق عفا اللہ عنہ
خادم افتاء و تدریس
جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی
1427/6/6ھ

الفصل الاوّل

خرید وفروخت کے احکام

یہ کتاب لوگوں کے آپس کے لین دین مثلاً: بیع و شراء، اجارہ، رہن، وکالت، کفالت، شراکت، وغیرہ مختلف معاملات کے احکام پر مشتمل ہے جو انسانی زندگی کی ضروریات میں داخل ہیں، اسی وجہ سے اس کا نام ''جدید معاملات کے شرعی احکام'' رکھا گیا ہے، تاکہ ہر انسان شریعت کے مطابق عبادات ادا کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلقات استوار کرے، اسی طرح لوگوں کے ساتھ بھی اس کا لین دین شریعت کے مطابق ہو، اس طرح وہ بیک وقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کرنے والا بن جائے۔

امام محمد رحمہ اللہ کا ارشاد:

فقہ حنفی کے مشہور امام، امام محمد شیبانی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ جس طرح آپ نے فقہ کو مدون فرمایا اور اس پر کتابیں لکھیں تو زہد یعنی تصوف کے بارے میں کچھ تصنیف نہیں فرمائیں گے، تو ارشاد فرمایا کہ میں نے اس موضوع پر ''کتاب البیوع'' لکھ دی ہے۔

(المبسوط للإمام السرخسی : ۱۲/ ۱۱۰)

اس جواب سے امام موصوف کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے کتاب البیوع تالیف فرمائی اس میں حلال وحرام کے احکام ہیں، جن سے لوگوں سے معاملات کے وقت انسان کی دینداری کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حلال وحرام میں کس قدر تمیز کرتا ہے۔ جب درہم و دینار سامنے ہو اس وقت انسان کے زہد وتقویٰ یا لالچ وطمع کا اندازہ ہوتا ہے۔

صرف پھٹے پرانے کپڑے پہننے اور سوکھی روٹی کھانے ہی کا نام تقویٰ نہیں کہ اس کو اختیار کر کے آدمی اپنے آپ کو متقی پرہیزگار سمجھ بیٹھے، بلکہ اصل تقویٰ حرام خوری سے اجتناب کرنے اور رزقِ حلال کو اختیار کرنے کا نام ہے۔

''جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

" اتق المحارم تكن اعبد الناس، وارض بما قسم الله لك تكن اغنى الناس ."

(طرف من حديث صحيح اخرجه الترمذي رقم : ٢٣٠٦ في الزهد)

یعنی حرام اشیاء سے اجتناب کرو، اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے عبادت گزار شمار ہو گے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رزق کا جو حصہ مقدر فرمایا ہے اس پر راضی رہو، لوگوں میں (دلی طور پر) غنی بن جاؤ گے۔

مال کی محبت خطرناک ہے:

مال کی محبت انسان کی دین و دنیا دونوں کو تباہ کر دیتی ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

"یاتي على الناس زمان لا يبالي المرء ما أخذ منه، امن الحلال، ام من الحرام ." (بخاري كتاب البيوع رقم الحديث : ٢٠٥٩)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے پیشن گوئی فرمائی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ حلال وحرام میں تمیز نہیں کریں گے، یہاں تک کہ خالص حرام کو بدونِ خوف وخطر استعمال کریں گے۔ (بخاری)

حالانکہ حرام مال کا استعمال دین و دنیا دونوں کے لیے تباہ کن ہے اور شریعتِ مطہرہ نے تو حرام کے علاوہ مشتبہ چیزوں سے بھی بچنے کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"إن الحلال بين، وإن الحرام بين، وبينهما امور مشتبهات، لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقى الشبهات، فقد استبراء لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام ."

(أخرجه البخاري رقم : ٢٥ ، مسلم : ١٥٩٩)

یعنی بے شک شریعت نے حرام کو بھی واضح کر کے بیان کر دیا اور حلال کو بھی واضح کر کے بیان کیا اور بہت سی چیزوں کے حلال وحرام ہونے میں اشتباہ ہے، جن سے اکثر لوگ واقف نہیں، جو ان مشتبہ چیزوں کے استعمال سے دور رہا اس کا دین اور اس کی عزت دونوں محفوظ رہے اور جو مشتبہ چیزوں کو استعمال کرتا ہے وہ حرام کا بھی مرتکب ہوگا۔ (بخاری)

غرضیکہ جب شریعتِ مطہرہ نے مشتبہ چیزوں سے بچنے کا حکم فرمایا ہے تو حرام چیزوں سے بچنا کتنا لازم اور ضروری ہوگا؟

مال کی غلامی:

رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو دنیا سے انتہائی محبت رکھتے ہیں اور

ان کو دنیوی زندگی میں مال جمع کرنے کے سوا کوئی اور غم وفکر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو "درہم اور دینار کے بندے" قرار دیا۔

چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

" تعيس عبد الدينار والدرهم، القطيفة والخميصه إن اعطى رضي، وإن لم يعط لم يعرض.

(أخرجه البخاري: ٢٨٨٦)

"یعنی ارشاد فرمایا کہ ہلاک و ناکام ہوا ایسا شخص جو درہم و دینار اور لباس و کھانے کا غلام بنا رہتا ہے، اگر مل جائے تو خوش ہے، اگر محروم رہے تو ناراض رہتا ہے۔"

لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ حلال وحرام کو پہچانے، تا کہ اپنے آپ کو مہلک چیزوں سے بچائے اس طرح وہ اللہ قہار و جبار کے عذاب سے بچ جائے اور یہ بھی جان لے کسی کا مال باطل طریقہ سے کھانا کبیرہ گناہوں میں ایک کبیرہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حرام سے بچنے کی توفیق بخشے۔

تجارت کا شرعی حکم:

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو مباح قرار دیا ہے اور کمائی حلال اور پاکیزہ ذریعہ قرار دیا، اگر یہ آپس کی رضامندی اور خوش دلی سے ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی تجارت میں برکت نازل فرماتے ہیں، جس بیع میں آپس کی رضامندی اور خوش دلی شامل نہ ہو وہ حرام ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يايها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارةً عن تراض منكم ﴾ (سورة النساء: ٢٩)

"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو باہمی رضامندی سے تو مضائقہ نہیں۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے تاجر کی فضیلت بیان فرمائی ہے، جو اپنی تجارت میں سچائی اور امانت داری سے کام لے، مال کو بیچنے کے لیے نہ جھوٹ بولے اور نہ ہی دھوکہ دے، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

" التاجر الصدوق الامين، مع النبيين والصديقين والشهداء."

(أخرجه الترمذي رقم : ١٢٠٩ وقال هذا حديث حسن)

یعنی ارشاد فرمایا کہ سچے امانت دار تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

خلافِ شرع تجارت کرنے والوں کے لیے وعید:

جو لوگ تجارت میں خوفِ خدا سے کام نہیں لیتے اور سچائی کو اختیار نہیں کرتے ان کو رسول اللہ ﷺ نے فاجر قرار دیا ہے "التاجر الفاجر" یعنی ایسا تاجر جس کا مقصد محض نفع خوری ہو، حلال وحرام میں بالکل تمیز نہ کرتا ہو، تجارت کے سلسلہ میں شریعتِ مطہرہ کے کسی حکم کی پابندی نہ کرتا ہو اور صرف خرید وفروخت میں مگن رہتا ہو۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ عید گاہ کی طرف نکلے۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ نے لوگوں کو خرید وفروخت کرتے ہوئے دیکھا، تو پہلے آواز دے کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جب لوگ متوجہ ہو گئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" إن التجار يبعثون يوم القيامة فجاراً الا من اتقى الله وبر وصدق." (ترمذی کتاب البیوع : ١٢١٠)

"یعنی قیامت کے دن تاجروں کو فاجروں کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا مگر جو تاجر تقویٰ، نیکی اور سچائی کو اختیار کرے۔" (وہ اس ذلت سے محفوظ ہوگا)

بڑا ظالم وہ تاجر ہے جو اپنے سامانِ تجارت کو بیچنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھائے اور دنیا کے معمولی نفع کی خاطر اللہ جل جلالہٗ کے نام کی توہین کرے۔ اس بے چارے کو یہ معلوم نہیں کہ وہ اس طرح دنیا و آخرت دونوں کو تباہ وبرباد کر رہا ہے:

عن أبي ذر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال : " ثلاثة لا ينظر الله إليهم يوم القيامة، ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم ." قلنا : من هم يا رسول الله ؟ فقد خابوا وخسروا فقال : " المنان، والمسبل إزاره، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب ."

(مسلم كتاب الإيمان رقم ١٧١ ترمذی بیوع رقم ٢٣٢٦)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان کی طرف دیکھیں گے، نہ ان کو گناہوں سے پاک فرمائیں گے اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہوگا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ کون لوگ ہوں گے؟ یقیناً یہ لوگ تو ہلاک ہو گئے اور تباہ و برباد ہو گئے، تو ارشاد فرمایا:

(۱) کسی پر احسان کرنے کے بعد احسان جتانے والا

(۲) ٹخنوں سے نیچے شلوار (پاجامہ یا ازار) لٹکانے والا

(۳) اپنے سامانِ تجارت کو جھوٹی قسم کے ذریعہ بیچنے والا

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی ہے کہ تاجروں کو کثرت سے صدقہ خیرات کرنا چاہیے، تاکہ تجارت و معاملات میں جو کمی کوتاہی ہو جاتی ہے اس کا کفارہ ہو جائے، کیونکہ نیکیاں برائیوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہیں۔

حضرت قیس بن ابی غرزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے ہم ان دنوں خرید و فروخت کے دلال (ایجنٹ) کے طور پر کام کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے تاجروں کی جماعت! (یہ بات یاد رکھو) کہ خرید و فروخت کے وقت شیطان حاضر ہوتا ہے اور گناہ ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے، اس لیے اپنی تجارت کو صدقہ خیرات کے ساتھ مخلوط رکھو۔'' (یعنی صدقہ کیا کرو، تاکہ تجارت و خرید و فروخت میں جو کچھ گناہ سرزد ہو جائے اس کا اثر ختم ہو جائے) (ابو داؤد کتاب البیوع حدیث: ۲۳۲۶)

مالِ حرام سے بچنے کی تاکید:

اب تک کچھ بیان ہوا یہ تجارت کے متعلق شرعی نقطہ نگاہ کی مختصر تشریح ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رزقِ حلال نصیب فرمائے اور رزقِ حرام سے حفاظت فرمائے۔ اب ہم اس سلسلہ کو اختتام تک پہنچانے کے لیے آخری حدیث ذکر کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی حقارت اور دین کی عظمت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(1) اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہارے لیے اخلاق کو تقسیم فرمایا ہے، اسی طرح تمہارے رزق کو بھی تقسیم فرمایا۔ (یعنی ہر انسان کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے لیے رزق مقرر کر لیا جاتا ہے)

(2) اللہ تعالیٰ دنیا ہر شخص کو دیتا ہے چاہے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، لیکن دین صرف اسی شخص کو دیتا ہے جس سے محبت ہوتی ہے، لہٰذا کسی کو دین عطا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ

تعالیٰ کو اس سے محبت ہے۔

(3) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے جو شخص حرام مال کماتا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت نازل نہیں فرماتے۔

(4) جو شخص اپنے پیچھے حرام مال چھوڑ کر جاتا ہے، وہ اس کے لیے قیامت کے دن جہنم کا ایندھن ہوگا۔

(5) اللہ تعالیٰ خبیث کو خبیث مال سے نہیں مٹائے بلکہ خبیث کو حلال مال سے ہی مٹاتا ہے۔(مسند امام احمد، ترغیب و ترهیب : ۲ / ۵۰۰)

بیع وشراء کی تعریف

بیع:

البيع : هي مبادلة المال بالمال بالتراض .

انسان کا اپنی مملوکہ چیز دوسرے کے قبضہ میں دینا۔ آپس کی رضامندی سے چنانچہ مؤمنین کی تعریف میں قرآن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿ رجال لا تلهيهم تجارة و لا بيع عن ذكر الله ﴾

(سورة النور: ۳۷)

ترجمہ: ''ایسے لوگ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ وہ مرد جن کو اللہ تعالیٰ کی یاد، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے خرید فروخت غفلت میں نہیں ڈالتی۔ وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس میں بہت سوں کے دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔''

شراء:

قیمت ادا کر کے چیز کو قبضہ میں لینا۔ یہ لفظ بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے:

﴿إن الله اشترى من المؤمنين انفسهم و أموالهم بأن لهم الجنة﴾

(سورة توبة : ۱۱۱)

بیع و شراء کا لفظ کسی صفت کو دوسری صفت کے ساتھ تبدیل کرنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں اس معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے:

﴿ أولئك الذين اشتروا الضلالة بالهدىٰ فما ربحت تجارتهم ﴾

(سورة البقرة : ١٦)

بیع کا مشروع ہونا:

بیع وشراء کی مشروعیت قرآن، حدیث، اجماعِ امت اور قیاس سے ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واحل اللّٰه البيع و حرم الربوا ﴾ (سورة البقرة : ٢٧)

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب سے پاکیزہ کمائی کون سی ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی خود اپنے ہاتھ سے کمائے، ہر تجارت برکت والی ہے۔ (مسند احمد، بزار)

یعنی ہر تجارت جو شریعت کے موافق ہو اس میں اللہ رب العزت کی طرف سے برکت نازل ہوتی ہے۔

اسی طرح رسول ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں لوگ بیع وشراء اور تجارت کے پیشے سے منسلک تھے آپ نے منع نہیں فرمایا، آپ ﷺ کی موجودگی میں کوئی کام انجام دیا جائے اور آپ منع نہ فرمائیں یہ اس کام کے شرعاً جائز ہونے کی دلیل ہے۔ (کیونکہ صاحبِ شریعت کے لیے خلافِ شرع کام کو روکنا لازم ہوتا ہے، دیکھ کر نکیر کیے بغیر خاموش رہنا جائز نہیں)

اجماعِ امت:

تمام مسلمانوں کا سلفاً وخلفاً بیع کے جواز پر اجماع ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے اب تک لوگ خرید وفروخت اور تجارت میں مشغول ہیں کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تجارت کی مشروعیت پر امت کا اجماع ہے۔

قیاس:

قیاس وعقل کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ بیع وشراء مشروع ہو کیونکہ انسان اپنی ہر حاجت کو خود پورا نہیں کر سکتا ہے، وہ غذا، لباس اور دواء وغیرہ اور بہت سی حاجاتِ ضروریہ کا محتاج ہے۔ اب وہ تن تنہا ان تمام حوائج کو پورا نہیں کر سکتا کہ وہ کھیتی بوئے پھر خود ہی کاٹے، پھر آٹا پیسے اور اور گوندھے پھر خود ہی روٹی پکائے۔ اسی طرح کپڑا بھی خود بنے، نجار اور لوہار اور فٹنگ وغیرہ کا کام بھی خود

کرے، اسی طرح کان سے لوہا اور دیگر دھات بھی نکالے، غرضیکہ ہر انسان اپنی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں دوسرے بہت سے انسانوں کا محتاج ہے جب وہ دوسروں کے ہاتھ کی چیزوں کا محتاج ثابت ہوا تو اس کو حاصل کرنے کے لیے ضرور اس کو عوض ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ بلا عوض غصب یا چوری کے ذریعہ حاصل کرنے میں عظیم فساد برپا ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔

اسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ذات نے اپنے بندوں کو تجارت کرنے کا حکم فرمایا، خرید وفروخت کو مباح قرار دیا تا کہ منافع کا تبادلہ ہوتا رہے اور دنیوی زندگی کے اسباب کے سلسلہ میں آپس میں تعاون جاری رہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ واحل اللہ البیع و حرم الربوا ﴾ (سورۃ البقرۃ : ۲۷)

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تعاونوا علی البر و التقویٰ و لا تعاونوا علی الإثم و العدوان ﴾

(سورۃ المائدۃ : ۲)

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیع کا حاصل یہی ہے کہ اپنی مملوکہ چیز کو قیمت کے عوض میں دوسروں کی طرف منتقل کیا جائے، چونکہ یہ دوسروں کے ہاتھ کی چیزوں کا محتاج ہے اور وہ بلا عوض دیتا نہیں لہٰذا اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ بیع وشراء کا راستہ اختیار کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم فرمایا ہے:

﴿ لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم ﴾

بیع کی تعریف سمجھ لینے کے بعد اب ہم بیع کی چند اقسام کا ذکر کریں گے۔

بیوع کی اقسام:

بیع کی چار اقسام ہیں ہر قسم کا ایک خاص نام ہے:

1- بیع المقایضہ
2- بیع المال بالمال یعنی بیع صرف
3- بیع مطلق سونے اور چاندی یعنی نقود کے ذریعہ خرید وفروخت

4- بیع سلم

بیع مقایضہ کی تعریف:

بیع مقایضہ کی تعریف یہ ہے کہ سامان کو سامان کے عوض فروخت کیا جائے، مثلاً: گندم کو تیل کے عوض، کھجور کو جو کے عوض، تیل کو گھی کے عوض، گھوڑے کو گھر کے عوض، وغیرہ۔

پہلے زمانہ میں یہی طریقہ زیادہ رائج تھا، کیونکہ اس زمانہ میں درہم ودینار وغیرہ سکوں کا رواج کم تھا، اس لیے وہ ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض میں بیچتے تھے، اس کا نام مقایضہ یعنی مبادلہ رکھا گیا کیونکہ اس میں سامان کو نقود کے عوض فروخت کرنے کے بجائے سامان کا تبادلہ سامان سے ہوتا تھا۔ بیع کا یہ طریقہ بھی بلا اختلاف جائز ہے کیونکہ اس بیع کے جواز میں بندوں کی مصلحت ہے۔ بیع مقایضہ کے جواز پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ حنین کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے، تو میں نے ایک زِرہ (جنگی لباس) کے عوض بنی سلمہ میں ایک باغ خریدا۔ کیونکہ یہ پہلا مال ہے جو میں نے اسلام لانے کے بعد خریدا۔

(بخاری کتاب البیوع : ۲۱۰۰)

اب اس روایت میں جلیل القدر صحابی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ میں نے زِرہ کے عوض باغ خریدا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عقد کو برقرار رکھا اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی یہ اس کے جواز کی دلیل ہے۔

اسی طرح حدیثِ صحیح میں ہے:

"إذا زنت الأمة فتبين زناها فليجلدها و لا يثرب ثم قال : فليبعها ولو بحبل من شعر." (بخاري كتاب البيوع : ۲۱۵۲)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم میں سے کسی کی باندی زِنا کا ارتکاب کرے تو لازم ہے کہ اس کو حد لگائے، پھر فرمایا کہ اس کو فروخت کردے اگرچہ بالوں کی ایک رسی کے عوض ہی کیوں نہ ہو۔

اس روایت میں جو رسی کے عوض فروخت کرنے کا ذکر ہے اس سے ثابت ہوا کہ باندی کو رسی کے عوض فروخت کرنا جائز ہے، یہی بیع مقایضہ ہے کہ عین کو عین کے عوض فروخت کیا جائے۔

بیع صرف کی تعریف:

بیع صرف فقہاء کی اصطلاح میں ثمن کو ثمن کے عوض فروخت کرنے کو کہا جاتا ہے یعنی سونے چاندی اور ان کے سکوں کو آپس میں فروخت کرنا، اس زمانے میں کرنسی نوٹوں کے کاروبار چاہے ملکی کرنسی ہو یا مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ ہو، ان پر بھی بیع صرف کا حکم لاگو ہوتا ہے یہ بیع بھی شرعاً کچھ شرائط کی پابندی کے ساتھ جائز ہے۔ کرنسی کے کاروبار کرنے والوں کو عربی میں ''صراف'' کہا جاتا ہے۔

اس کے جدید احکام کے متعلق ہم آئندہ گفتگو کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بیع مطلق:

بیع مطلق یعنی سامان کو نقود کے عوض میں فروخت کرنا، یعنی کیلی اور وزنی اشیاء کو ثمن (نقدی) کے عوض فروخت کرنا، خرید و فروخت کا یہی طریقہ ہر زمانہ میں رائج رہا ہے تجارت کا اصل مدار اسی پر ہے، مثلاً: گھی، تیل، گاڑی، گھر، زمین اور باغ وغیرہ اپنے علاقہ میں رائج کرنسی کے ذریعہ خریدا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إلا أن تكون تجارة حاضرة تديرونها بينكم ﴾

(سورة بقرة : ٢٨٢)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم ﴾ (سورة نساء : ٢٩)

سے یہی تجارت مراد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس تجارت کو حلال فرمایا ہے، بشرطیکہ آپس کی رضامندی کے ساتھ ہو، غصب، زوروز بردستی اور دھمکی کا راستہ اختیار نہ کیا جائے۔

حرام اشیاء کی تجارت:

بعض اشیاء ایسی ہیں جن کی تجارت کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، کیونکہ ان سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً: شراب، خنزیر اور نشہ آور اشیاء کی تجارت، اسی طرح وہ چیز جو انسان کے قبضہ نہ ہو اور مشتری کے حوالہ کرنے پر قدرت نہ ہو ایسی اشیاء کا فروخت کرنا بھی شرعاً حرام ہے۔ مثلاً: ہوا میں اڑتا ہوا پرندہ جو ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا یا شکار کرنے سے پہلے مچھلی فروخت کرنا وغیرہ، یہ

بھی باطل طریقہ سے لوگوں کے مال کھانے کے حکم میں داخل ہے۔ اس کی تفصیلات بھی ہم آئندہ ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

بیع سلم:

بیع سلم یا سلف، فقہاء کی اصطلاح میں اس بیع کو کہا جاتا ہے جس میں قیمت پہلے ادا کی جاتی ہے اور سامان ایک مہینہ یا اس سے زائد مدت کے بعد ادا کیا جاتا ہے، مثلاً: کوئی شخص کسانوں سے گندم یا جو خریدتا ہے، گھی یا تیل خریدتا ہے، قیمت اسی مجلس میں ادا کر دیتا ہے اور سامان ادا کرنے کے لیے ایک مدت مقرر کر لی جاتی ہے، مثلاً: فصل کٹنے کے بعد، بیع سلم کا اصل حکم تو یہی ہونا چاہیے کہ یہ ناجائز ہو کیونکہ یہ معدوم اشیاء کی بیع ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! لوگ میرے پاس آکر ایسی چیز کی بیع کا مطالبہ کرتے ہیں جو میری ملک میں نہیں ہوتی، پھر میں بازار سے خرید کر ان کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، کیا یہ صحیح ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو چیز تمہارے ملک میں داخل نہیں اس کو مت فروخت کرو۔

(ترمذی کتاب البیوع ۱۲۳۲)

تاہم شریعت نے کسان، مزارع اور دوسرے لوگوں کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے۔

کیونکہ شریعت لوگوں کی ضرورتوں کا لحاظ کرتی ہے، بلکہ شریعت کا حاصل یہی ہے اس میں انسانوں کے لیے دینی و دنیوی فلاح کا طریقہ مذکور ہے، شریعت کی پابندی سے دونوں میں فلاح و کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نقصان دہ اشیاء کے استعمال سے اور لوگوں کو نقصان پہنچانے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

" لا ضرر و لا ضرار."

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم فرمانے والے بلکہ انسان کے اپنے نفس سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ و لا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيما ﴾

(سورۃ النساء: ۲۹)

امام قدوری رحمہ اللہ کی رائے:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''مختصر قدوری'' میں مذکور ہے، کہ ''سلم'' لغت میں ایسے عقد کو کہا جاتا ہے، جو عوضین میں سے ایک نقد دوسرے کے ادھار پر مشتمل ہے یہ عقد خلافِ قیاس مشروع ہوا ہے، کیونکہ معدوم چیز کی بیع ہے، تاہم کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ سے جواز ثابت ہونے کی بناء پر، ہم نے قیاس کو ترک کردیا۔

دلیل قرآنی:

قوله تعالىٰ: ﴿ يأيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه ﴾ (سورة بقرة: ٢٨٢)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعادِ معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو، یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والے انصاف کے ساتھ لکھیں۔''

دلیل حدیث سے:

قوله عليه السلام: "من اسلف في شئ فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى اجل معلوم."

(بخاری كتاب السلم: مسلم مساقات ١٢٧، ترمذي كتاب البيوع: ١٣١١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص بیع سلم کرنا چاہے، اس کا کیل اور وزن معلوم ہونے کے علاوہ مدت بھی معلوم ہونی چاہیے۔''

اس حدیث کے شان ورود کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے لوگوں میں اس وقت کھجور وغیرہ میں بیع سلم کا رواج تھا تو آپ ﷺ نے اس عقد کو شرائط کے ساتھ جائز رکھا۔

اسی طرح "الاختيار لتعليل المختار: ٣٤/٢ " میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معدوم (جو موجود نہ ہو) چیز کو فروخت کرنے سے منع فرمایا البتہ بیع سلم کی اجازت دی ہے اسی پر اجماع منعقد ہوا ہے، اس کو ''بیع المفالس'' کہا جاتا ہے یعنی مفلس لوگوں کی بیع کیونکہ درحقیقت یہ عقد وہی شخص کرتا ہے جو رقم کا محتاج ہو، بندوبست کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو آئندہ ملنے والے مال کو سستے دام فروخت کرتا ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوتا تو کم قیمت پر فروخت نہ کرتا۔

بیع سلم کی شرائط، ارکان اور وہ اشیاء، جن میں سلم جائز نہیں ہے ان کی تفصیلات ہم آئندہ مستقل طور پر بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بیع منعقد کرنے کے طریقے

(۱) ایجاب وقبول کا طریقہ:

بیع کی پہلی قسم جو معروف اور مشہور ہے، وہ یہی ہے کہ بائع اور مشتری میں سے ایک کی طرف سے ایجاب ہو اور دوسرے کی طرف سے قبول اور الفاظ ایسے ہوں جو پختہ بیع پر دلالت کریں، مثلاً: میں نے بیچ دیا، میں نے خرید لیا یا میں نے آپ کو اتنی قیمت پر اس چیز کا مالک بنا دیا تو دوسرا کہے: میں نے لے لیا یا قبول کر لیا وغیرہ۔

صرف وعدہ کے الفاظ سے بیع منعقد نہیں ہوتی، مثلاً: یہ کہے کہ میں فروخت کروں گا، دوسری طرف سے کہا جائے: میں خریدوں گا وغیرہ۔

اسی طرح صرف سوال و جواب سے بھی بیع منعقد نہیں ہوتی، مثلاً: ایک کہے آپ یہ گاڑی فروخت کریں گے؟ دوسرا جواب میں کہے، ہاں ارادہ ہے، اس سے بھی عقد منعقد نہیں ہوگا۔

(۲) بیع تعاطی:

فقہاء کے نزدیک بیع تعاطی اس بیع کو کہتے ہیں کہ عاقدین عقد بیع کے وقت زبان سے ایجاب یا قبول نہ کریں، بلکہ ایجاب یا قبول کیے بغیر مشتری چیز کی قیمت بائع کو پکڑا دے اور بائع وہ چیز مشتری کو دیدے، نہ بائع یہ کہے کہ میں نے یہ چیز فروخت کی اور نہ مشتری یہ کہے کہ میں نے یہ چیز خریدی۔

بیع تعاطی کی دو قسمیں ہیں:

ایک یہ کہ عاقدین میں سے ایک زبان سے ایجاب کا تلفظ کرے اور دوسرا شخص قول کی بجائے عملاً اس بیع کو قبول کرلے، مثلاً: مشتری یہ کہے کہ مجھے دو روپے کی روٹی دے دو، اس کے جواب میں بائع اس کو خاموشی سے روٹی اٹھا کر دے دے اور اس سے پیسے وصول کرلے اور زبان سے کچھ نہ کہے۔ اس صورت میں ایجاب لفظاً اور قبول عملاً پایا گیا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ عاقدین میں سے کوئی بھی زبان سے کچھ نہ کہے۔ مثلاً: ایک شخص دکان

میں داخل ہوا، دکان میں ہر چیز پر اس کی قیمت لکھی ہوئی تھی، اس نے اپنی مطلوبہ اشیاء اٹھائیں اور ان پر لکھی ہوئی قیمت دکاندار کو دے کر وہ اشیاء لے کر چلا گیا۔ اس صورت میں عاقدین کے درمیان کسی بھی قسم کی بات چیت زبان سے نہیں ہوئی۔

فقہاء کی اصطلاح میں دونوں قسموں کو ''بیع تعاطی'' یا ''بیع معاطاۃ'' کہا جاتا ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک تمام اشیاء میں بیع تعاطی کی دونوں قسمیں جائز ہیں، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مشہور مذہب کے مطابق بیع تعاطی جائز نہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک بیع ایجاب وقبول پر موقوف ہوتی ہے اور بیع تعاطی کے اندر ایجاب وقبول دونوں یا ایک موجود نہیں۔ لیکن کتبِ شافعیہ کی طرف مراجعت کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان نزدیک بیع تعاطی کے حکم کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

١۔ ایک قول یہ ہے کہ شوافع کے نزدیک بیع تعاطی تمام اشیاء میں باطل ہے اور اس کے ذریعہ بیع منعقد نہیں ہوتی۔ یہی ان کا مشہور مذہب ہے۔

٢۔ دوسرا قول یہ ہے کہ معمولی اشیاء میں بیع تعاطی جائز ہے لیکن قیمتی اور نفیس اشیاء میں بیع تعاطی جائز نہیں۔ یہ علامہ ابن سریج اور رویانی رحمہما اللہ کا قول ہے۔

(مغنی المحتاج للشربینی فتح : ٢/ ٤)

٣۔ جن چیزوں میں بیع تعاطی کا عرف جاری ہے، ان میں بیع تعاطی جائز ہے، ان کے علاوہ دوسری چیزوں میں جائز نہیں۔

٤۔ چوتھا قول یہ ہے کہ جو لوگ ''بیع معاطاۃ'' سے واقف ہیں، جیسے: عام آدمی اور تاجر وغیرہ ان کا بیع معاطاۃ کرنا جائز ہے اور جو لوگ بیع معاطاۃ سے پوری طرح واقف نہیں، ان کو تلفظ کے بغیر بیع کرنا درست نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج : ٢/ ٤)

البتہ جمہور فقہاء کا مذہب راجح یہ ہے کہ تمام اشیاء میں تعاطی کے ذریعہ بیع منعقد ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ یہ عقد آپس کی رضامندی کے ساتھ طے پائے۔ مذہب جمہور کی دلیل کے طور پر یہاں ہم صرف علامہ ابن قدامۃ رحمہ اللہ کی عبارت نقل کرتے ہیں، جو انشاء اللہ کافی وشافی ہوگی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا اور اس کی کیفیت بیان نہیں فرمائی،

چنانچہ جس طرح دوسرے معاملات مثلاً: ’’قبض‘‘ اور ’’احراز‘‘ اور ’’تفرق‘‘ کے سلسلے میں عرف کی طرف رجوع کیا تھا، اسی طرح بیع کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے بھی عرف کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، چنانچہ عرف کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مسلمان اپنے بازاروں میں اس طرح سے بیع کا معاملہ کرتے ہیں اور بیع کا یہ طریقہ ان کے درمیان معلوم اور مشہور ہے۔ البتہ بیع کی اس قسم پر شریعت کے بعض احکام کا دارومدار ہے اور ان کو شریعت نے اپنی جگہ برقرار بھی رکھا ہے، لہٰذا اپنی رائے سے بیع کی اس قسم میں تغییر اور تبدیلی کرنا جائز نہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اس بیع کا کثرت سے شیوع کے باوجود اس میں ایجاب وقبول کا استعمال ثابت اور منقول نہیں، اگر ایجاب وقبول اس بیع میں استعمال کرتے تو یہ بات ضرور مشہور ہو جاتی اور اگر ایجاب وقبول کا تلفظ بیع کے اندر شرط کا درجہ رکھتا تو اس صورت میں اس حکم کو آگے دوسروں تک پہنچانا واجب ہو جاتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جو بات آگے پہنچانا واجب ہو اس کو نقل کرنے میں سستی اور غفلت سے کام لیتے۔

دوسری طرف بیع ان معاملات میں سے ہے، جن میں عموم بلویٰ پایا جاتا ہے، لہٰذا اگر بیع کے اندر ایجاب وقبول کا تلفظ شرط کے درجے میں ہوتا تو حضورِ اقدس ﷺ اس کو ضرور اس طرح واضح کر کے بیان فرماتے کہ وہ حکم مخفی نہ رہتا، اس لیے کہ اگر یہ ایجاب وقبول کا تلفظ بیع کے اندر شرط ہوتا تو پھر اس کے نہ پائے جانے کی صورت میں بہت سے معاملات فاسد ہو جاتے اور پھر اس کے نتیجے میں باطل طریقے پر مال کھانے کی نوبت آجاتی اور ہمارے علم کی حد تک حضورِ اقدس ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

اور چونکہ ہر زمانے میں لوگ بازاروں کے اندر بیع تعاطی کے معاملات کرتے آرہے ہیں اور ہمارے مخالفین میں سے پہلے کسی نے بھی بیع کے اس طریقے کی مخالفت نہیں کی، اس لیے اس کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ہبہ، ہدیہ، صدقہ وغیرہ میں بھی ایجاب وقبول کا یہی حکم ہے کہ زبان سے ان کا تلفظ ضروری نہیں، چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی ان معاملات میں ایجاب وقبول کا استعمال کرنا منقول نہیں ہے، حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حبشہ اور دوسرے مقامات کے بہت سے ہدایا پیش کیے گئے اور اسی طرح لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باری کے دن حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں ہدیہ پیش کرنے کو

اوّلیت دیتے تھے۔

(متفق علیه)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں کوئی شخص کھانا لاتا تو آپ لانے والے سے سوال کرتے کہ یہ ہدیہ ہے یا صدقہ ہے؟ اگر لانے والا جواب میں کہتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ اپنے صحابہ کرام سے فرماتے کہ آپ لوگ تناول فرمالیں اور آپ ﷺ خود تناول نہ فرماتے اور اگر جواب میں یہ کہا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے تو اس وقت آپ اپنے ہاتھ سے لوگوں کو اس کے کھانے کا اشارہ فرماتے اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کچھ کھجوریں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں لائے اور آ کر کہا کہ میں نے یہ دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ اس کھجور کے زیادہ حق دار ہیں، اس لیے میں صدقہ کی کچھ کھجوریں آپ کی خدمت میں لایا ہوں، حضورِ اقدس ﷺ نے ان کی بات سن کر صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ لوگ کھالیں، آپ نے وہ کھجوریں نہیں کھائیں۔ پھر دوبارہ کھجوریں آپ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے دیکھا کہ آپ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، اس لیے یہ کھجوریں آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں، اس وقت حضورِ اقدس ﷺ نے ''بسم اللہ'' پڑھی اور ان کو کھایا۔

دیکھیے: ان احادیث میں نہ تو حضورِ اقدس ﷺ سے قبول کا تلفظ کرنا منقول ہے اور نہ یہ منقول ہے کہ آپ نے ''ایجاب'' کے تلفظ کا حکم دیا ہو، بلکہ آپ نے صرف یہ معلوم کرنے کے لیے سوال کیا کہ وہ صدقہ ہے یا ہدیہ ہے؟ اور اکثر روایات میں ایجاب وقبول کا تلفظ منقول نہیں، بلکہ ''معاطاۃ'' کے طور پر وہ معاملہ مکمل ہو گیا اور فریقین کے درمیان رضامندی کے ساتھ جدائی ہونا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ معاملہ درست ہو گیا، اس لیے کہ اگر ان معاملات میں ایجاب و قبول کا تلفظ شرط ہوتا تو اس صورت میں لوگوں کو دشواری پیش آ جاتی اور مسلمانوں کے بہت سے معاملات فاسد ہو جاتے، جس کے نتیجے میں ان کے اکثر اموال حرام ہو جاتے۔ دوسرے اس لیے کہ ایجاب وقبول کا مقصد تو فریقین کی رضامندی کا اظہار ہے، لہٰذا جب ایجاب وقبول کے علاوہ دوسری چیز مثلاً: تعاطی وغیرہ پائی جائے جو آپس کی رضامندی پر دلالت کرنے والی ہو تو اس

صورت میں بھاؤ تاؤ یا تعاطی اس ایجاب وقبول کے قائم مقام ہو کر اس کی طرف سے کافی ہو جائے گی، اس لیے کہ رضامندی کے اظہار کا ذریعہ صرف ایجاب وقبول نہیں ہے۔

(المغنی لابن قدامة : ۳ / ۵٦۱) (ماخوذ از فقهی مقالات)

بائع ومشتری میں اہلیت کی شرائط

شرعاً عقدِ بیع منعقد ہونے کے لیے بائع اور مشتری میں درجِ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

عاقل ہونا:

عاقل ہونا ضروری ہے، پاگل، مجنوں کا عقد بھی شرعاً غیر معتبر ہے۔

قوله علیه السلام : " رفع القلم عن ثلث : عن النائم حتی یستیقظ، وعن الصبی حتی یحتلم، ای یبلغ وعن المجنون حتی یعقل ." (رواه احمد واصحاب السنن والحاکم)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ احکامِ شرع کے مکلّف نہیں، سویا ہوا شخص بیدار ہونے تک، بچہ بالغ ہونے تک، پاگل دماغی توازن ٹھیک ہونے تک۔

تو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب یہ احکامِ شرع کے مکلّف نہیں تو ان کے الفاظ سے عقد بھی منعقد نہیں ہوگا، البتہ بچہ سمجھدار ہو، معمولی اشیاء کی خریداری کے لیے سرپرست اجازت دیں تو ان کی اجازت سے عقد منعقد ہوگا۔

بے وقوف کم عقلی کی وجہ سے فضول خرچی کی وجہ سے اس پر عدالت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہ ہو، اگر ایسا ہوا تو جب تک پابندی ختم نہ ہو جائے اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے عقد منعقد نہ ہوگا۔

قوله تعالیٰ : ﴿ ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التی جعل الله لكم قياماً فإن أنستم منهم رشداً فادفعوا إليهم أموالهم ﴾

(سورة النساء : ۵ ـ ٦)

شیخ صابونی صاحب فرماتے ہیں اگرچہ بعض فقہاء آزاد، بالغ پر تجارتی پابندی لگانے کو ناجائز قرار دیتے ہیں، تاہم فقہاء کی ایک جماعت جن میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام اسحاق شامل

ہیں، وہ فرماتے ہیں: اگر کوئی آزاد آدمی ضعیف العقل ہو، جو تجارت میں اکثر نقصان کرتا ہو، جس کی وجہ سے اس کا اپنا بھی نقصان ہوتا ہے اور گھر کے دیگر افراد کا بھی تو اس پر پابندی لگائی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابوخلابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر والوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

" إذا بايعت فقل هاء وهاء ولا خلابة ."

(ترمذی : ۱۲۵، ابو داؤد کتاب البیوع رقم : ۳۵۰۱)

یعنی کسی بھی چیز کو خریدتے وقت کہہ دو میں ناواقف ہوں اس لیے دھوکہ سے اجتناب کرو۔

اس شرط کی وجہ سے دھوکہ کی صورت میں بیع ان کو ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا تھا۔

نابالغ کی بیع وشراء:

عقد بیع منعقد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عاقدین بالغ ہوں، نابالغ بچوں کی بیع وشراء منعقد نہیں ہوتی، البتہ جو بچے اور بچیاں نفع اور نقصان کی تمیز کر سکتے ہوں، باپ، دادا یا جو بھی اس وقت ولی ہو، اس کی اجازت سے ان بچوں کی بیع وشراء نافذ ہوگی، اجازت صراحۃً ہو یا دلالۃً دونوں طرح درست ہے، بچوں کو کوئی چیز خریدتے یا فروخت کرتے دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا بھی سرپرست کی طرف سے اجازت سمجھی جاتی ہے۔

قال في الهندية : " إذا اذن لصبي يعقل البيع و الشراء يجوز يريد به أنه يعقل معنى البيع و الشراء بأن عرف أن البيع سالب للملك و الشراء جالب عرف الصبن اليسير من الفاحش لا نفس العبارة كذا في الصغرى ." الفتاوى الهندية : ٥/١١٠

نقد وادھار کا ضابطہ

نقد:

1 - ہر وہ عقد نقد ہے، جس میں ایجاب وقبول کرتے وقت نقد کا لفظ بولا جائے، جیسے یہ گھوڑا نقد سو روپے میں لیا ہے۔

2 - یا لیتے وقت قیمت پیش کر دی جائے کہ یہ ہزار روپے لو اور تھان کپڑے کا دیدو۔

3. یا مال کسی کے ہاتھ بھیجا جائے کہ قیمت لے کر واپس آنا۔

4. کچھ تصریح نہ کرے، مثلاً: یوں کہے کہ یہ گھوڑا سو کا خریدا۔

5. جو مال، ریلوے، ٹرک، ڈاک یا بائع کے نمائندہ کے ہاتھ منگوایا جائے۔

6. مطلقاً عقد کر کے مال لے لیا، مثلاً: ایک تھان پانچ سو روپے میں طے کر کے مال اٹھا لیا اور چلا گیا، بائع نے کچھ مزاحمت نہ کی، پہلی تین صورتیں یقینی طور پر نقد ہیں اور آخری تین نقدیت پر محمول ہیں۔ پس اگر اسی مجلس میں قیمت کا ذکر ہوا کہ بائع نے پوچھا قیمت کب دیں گے؟ یا خریدار نے خود ہی کہا: مہینہ کے آخر میں دوں گا تو ادھار ہو جائے گا ورنہ نقد ہی رہے گا، لہٰذا ایسی صورت میں مدت کے مذکور نہ ہونے میں کوئی نقصان نہیں اور بائع کو ہر وقت مطالبہ کا حق ہوگا۔

مسئلہ: زید نے مال خریدا اور کہا کہ جب تم آدمی بھیجو گے یا حساب کر کے دو گے رقم بھیج دی جائے گی تو یہ نقد ہے۔

ادھار:

1. ہر وہ عقد جس کے ایجاب وقبول میں ادھار کا ذکر آ جائے۔

2. یا طریقہ لین دین سے ادھار ہونا معلوم ہو جائے یا مذکورہ بالا صورت نمبر ٤، ٥، ٦ میں دین کی بات مجلس عقد ہی میں ہوگئی، البتہ مدت اداء کو ذکر کرنا ضروری ہے۔ ورنہ بیع فاسد ہو جائے گی۔

مسئلہ: صورت ٤، ٥، ٦ میں مجلس عقد ختم ہونے کے بعد اداء کی بات ہوئی یا ایجاب و قبول کے بعد قیمت ادا نہیں کی لیکن وعدہ ہوا اب مدت فاسدہ کا فساد اصلی عقد کے ساتھ ملحق نہ ہوگا اس لیے کہ عقد تمام ہو گیا۔

مسئلہ: نقد معاملہ ہوا، مگر قیمت مجلس عقد میں ادا نہیں کی یا قیمت کی ادائیگی کے لیے جو وعدہ کیا تھا وعدہ کو پورا نہیں کیا تو وعدہ خلافی کا تو گناہ ہوگا، لیکن عقد میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

بیع کی شرائط:

عقدِ بیع کے صحیح ہونے کے لیے مبیع / مال کے اندر درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ بائع کی ملک میں موجود ہونا:

وہ مال بائع کی ملک میں موجود ہو، لہٰذا معدوم چیز کی بیع باطل ہے، مثلاً: درخت میں پھل لگنے

سے پہلے فروخت کردینا یا کھیتی ظاہر ہونے سے کھیتی فروخت کرنا یا فلیٹ کی تعمیر سے پہلے اس کو فروخت کرنا یا گاڑی بک کروانے کے بعد تیار ہو کر قبضہ میں آنے سے پہلے آگے فروخت کردینا وغیرہ۔

۲۔ مقدور التسلیم ہو:

یعنی مال ایسا ہو کہ بائع اس کو خریدار کے حوالہ کرنے پر قدرت رکھتا ہو، اب جن صورتوں میں بائع مال خریدار کے حوالہ کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو، مثلاً: کوئی جانور بھاگا ہوا ہو، جب تک قبضہ میں نہ آجائے یا مچھلی شکار کرنے سے پہلے فروخت کرنا، وغیرہ ناجائز وحرام ہے۔

۳۔ مبیع کی مقدار معلوم ہو:

جب تک مبیع کی مقدار معلوم نہ ہو، عقد بیع نافذ نہ ہوگا، بلکہ جہالت کی وجہ سے فاسد ہوگا، مثلاً: تقسیم سے قبل ایک وارث اپنے حصہ غیر معینہ کو فروخت کردے۔

۴۔ مال کا متقوم ہونا:

یعنی جو مال فروخت ہو رہا ہے وہ قابل قدر قیمت والا مال ہو، حقیر اور بے قیمت چیز نہ ہو۔

۵۔ شرعاً وہ مال مباح ہو:

یعنی شریعت نے اس مال سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہو، لہٰذا شراب، خنزیر، مردار اور جانور کا بہتا ہوا خون وغیرہ، ایسی چیزیں ہیں جن سے شریعت نے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، ان کی خرید وفروخت شرعاً حرام ہے، لہٰذا ان کی بیع باطل ہے۔

۶۔ مدت کا متعین ہونا:

صحت عقد کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر ادھار چیز خریدی جائے تو اداء قیمت کا وقت متعین ہو، مثلاً: مہینہ دو مہینہ یا کوئی ایسا وقت جو بائع اور مشتری دونوں کے نزدیک متعین ہو، تاکہ بعد میں اس کی بنیاد پر کوئی جھگڑا نہ ہو، اگر مدت متعین نہ ہو تو عقد فاسد ہوگا۔

۷۔ بیع بالشرط کا حکم:

خرید وفروخت میں ایسی شرط لگانا جس سے بائع یا خریدار میں سے کسی ایک کو کوئی خاص فائدہ ہو یا جس شرط کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو، یہ شرعاً ناجائز ہوگا، اس سے عقد فاسد ہو جائے گا، مثلاً: میں تمہیں گھر فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ تمہارے گھر میں ایک ماہ کرایہ پر رہوں گا یا یہ کہ

تمہیں مکان کی قیمت کے علاوہ مجھے ایک لاکھ قرض بھی دینا ہوگا، وغیرہ، البتہ اگر عقد میں اس طرح مشروط نہ ہو کہ اس شرط کو پورا نہ کرنے سے مال فروخت نہ کرے بلکہ ایک وعدہ کے طور پر ہو، مثلاً: میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کرایہ پر دوں گا جس میں مشتری کو اختیار ہے کہ کرایہ دے یا نہ دے، تو ایسی شرط کی وجہ سے عقد فاسد نہ ہوگا، البتہ وعدۂ خلافی کا گناہ ہوگا، عقد صحیح ہو جائے گا۔

مسئلہ: جو شرط عقدِ بیع کے موافق و مناسب ہو، نیز وہ شرط جس سے بائع اور خریدار میں سے کسی ایک کا فائدہ ہوتا ہو، لیکن اس قسم کی شرط لگانے کا رواج ہو گیا ہو اور اس کی وجہ سے بعد میں جھگڑا نہ ہوتا ہو تو ایسی شرط لگانا جائز ہے، جیسے: آج کل الیکٹرونکس کی خریداری میں فری سروس کی شرط، زیادہ مقدار میں مال خریدنے کی صورت میں قیمت میں خصوصی کمی کرنے کی شرط، قیمت کی وصولی کے لیے امین کے ضامن کی شرط، جو شرطِ صحیح ہے وہ معتبر ہے اگر شرط پوری نہیں ہوگی تو اس سے دوسرے فریق کو سودا ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط . (أخرجه النسائی : ٣٢/١، موطأ ٦٩)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے بیع میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے

عن عائشه رضى الله تعالىٰ عنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ! اما بعد ما بال رجال يشترطون، شروطا ليست فى كتاب الله، ما كان من شرط ليس فى كتاب الله يعنى يخالف الشرع فهو باطل، وإن كان مائة شرط قضاء الله أحق و شرط الله اوثق وانماء الولاء لمن اعتق .

(بخارى رقم : ٢١٦٨، باب إذا شرط شروطا فى البيع)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک باندی خریدی تو مالک نے خلافِ شرع شرط رکھی کہ ولاء مالک بائع کے لیے ہوگا، اس پر آپ ﷺ ناراض ہوئے اور خطبہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ لوگ بیع شراء کے وقت خلافِ شرع شرط رکھتے ہیں، اگر ایسی شرط رکھی جائے تو شرط باطل ہوگی اور جو شریعت کا حکم ہے اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ولاء آزاد کرنے والے کا

حق ہے۔اس روایت سے بعض نے استدلال کیا کہ اگر کوئی ایسی شرط ہو جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوتو شرط کو باطل قرار دے کر عقد کو نافذ سمجھا جائے گا۔

قبضہ کی تعریف:

چیز پر قبضہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ بائع خریدار کے ہاتھ میں چیز دے دے یا چیز کو خریدار کے تصرف میں اس طرح دے دے کہ خریدار اسے کسی روکاٹ کے بغیر اٹھا سکے اور ساتھ میں بائع یہ بھی کہہ دے کہ یہ چیز لے لو۔ (شامی و شرح المجلة)

قبضہ ثابت کرنے والے افعال:

مسئلہ: سودا مکمل ہو جانے کے بعد خریدار کے مندرجہ ذیل افعال سے خریدار کا چیز پر قبضہ ثابت ہو جاتا ہے۔ (شامی)

(۱) چیز کو استعمال کرلیا۔

(۲) چیز کو ضائع کردیا یا اسے عیب دار کردیا۔

(۳) خریدار نے بائع کو سامان کے لیے کوئی برتن یا تھیلا وغیرہ دیا اور بائع نے وہ سامان خریدار کے برتن یا تھیلے میں ڈال دیا۔

(٤) خریدے ہوئے جانور کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے ہنکایا اور جانور کچھ دور خریدار کے ساتھ چلا، گاڑیوں کا بھی یہی حکم ہے۔

(٥) خریدار کے وکیل نے چیز پر قبضہ کرلیا۔

(٦) خریدی ہوئی چیز کسی کو تحفہ میں یا قرض میں دے دی یا صدقہ کردی یا گروی رکھ دی یا کسی عوض کے بغیر فائدہ اٹھانے کے لیے دے دی۔

(۷) بائع نے خریدار کے حکم سے مذکورہ بالا افعال کیے، مزید یہ کہ خریدار کے حکم سے وہ چیز امانت رکھوادی یا کرایہ پر دے دی، واضح رہے کہ بائع کے پاس امانت رکھوانے سے قبضہ ثابت نہیں ہوگا، نیز قبضہ کیے بغیر خود وہ چیز کرایہ پر نہیں دے سکتا اور یہ ناجائز ہوگا۔

(۸) خریدار کے حکم سے بائع نے مال خریدار کے گھر یا گودام میں پہنچا دیا۔

(۹) خریدا ہوا مال بائع کے گودام میں ہے، لیکن خریدار نے اپنا مال بائع کے دیگر اموال سے الگ کرلیا اور اس پر اپنا نام یا کوئی مخصوص نشان لگا دیا تو اس سے بھی قبضہ مکمل ہو جاتا

ہے۔

مذکورہ تمام افعال سے چیز پر خریدار کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ: جن جن صورتوں میں خریدار کا قبضہ ثابت ہو جائے تو ان میں قبضہ کے بعد چیز خریدار کی ضمان (Risk) میں آ جائے گی اور اس کے بعد خریدار کے لیے اس چیز کو فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا جائز ہوگا اور اگر ضائع ہوگئی تو خریدار کا نقصان ہوگا۔

جن افعال سے قبضہ ثابت نہیں ہوتا:

سودا مکمل ہو جانے کے بعد خریدار کے مندرجہ ذیل افعال سے قبضہ ثابت نہیں ہوگا۔ (شامی)

(۱) چیز بائع کے پاس امانت رکھوا دی۔

(۲) بائع کو بلاعوض فائدہ اٹھانے کے لیے دے دی۔

(۳) بائع یا کسی دوسرے کو کرایہ پر دے دی۔ (اور قبضہ سے پہلے کرایہ پر دینا ناجائز بھی ہے)

(٤) بائع کو وہ چیز تحفہ میں دے دی۔

(٥) وہ چیز بائع کے پاس گروی رکھ دی۔

مسئلہ: خریدار کے قبضہ سے پہلے اگر بائع فروخت کی ہوئی چیز کو خود استعمال کر لے یا گروی رکھ دے یا کرایہ پر دے دے یا امانت رکھوا دے اور خریدار نے اس کی اجازت نہیں دی، پھر وہ ضائع ہوگئی تو بائع اور خریدار کے درمیان جو سودا ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا اور خریدار بائع سے یا کسی دوسرے سے کوئی تاوان بھی وصول نہیں کرے گا۔

بائع کی طرف سے بھیجا ہوا مال راستہ میں ضائع ہونا:

مسئلہ: بائع کی جانب سے مال روانہ کرنے سے خریدار کا قبضہ ثابت نہیں ہوتا خواہ خریدار نے یہ کہا کہ مال میری طرف سے روانہ کر دو، میں اس کا ذمہ دار ہوں، بلکہ جب تک مال خریدار کے پاس یا اس کے گودام وغیرہ میں نہیں پہنچے گا تو اس وقت تک خریدار کا قبضہ ثابت نہیں ہوگا، لہٰذا اگر مال راستہ میں ضائع ہو گیا یا چوری ہو گیا اور خریدار تک نہیں پہنچا تو یہ بائع کا نقصان ہوگا۔ (شامی)

اسی طرح اگر خریدار بائع سے کہے کہ تم اپنے آدمی کے ہمراہ یا میرے آدمی کے ہمراہ مال روانہ کردو، لیکن خریدار اپنے آدمی کو اپنا وکیل نہ بنائے پھر بائع اپنے آدمی یا خریدار کے آدمی کے ہمراہ مال روانہ کردے اور مال راستہ میں ضائع ہوجائے تب بھی بائع کا مال ضائع ہوگا۔

البتہ اگر خریدار اپنے آدمی کو اپنا وکیل مقرر کردے اور بائع، مال خریدار کے وکیل کے حوالہ کر دے تو خریدار کا قبضہ ثابت ہوکر مال خریدار کے (Risk) میں آجائے گا اور اب اگر راستہ میں ضائع ہوگا تو خریدار کا مال ضائع ہوگا اور اگر خریدار نے اس مال کی قیمت ادا نہیں کی تھی تو اس کی ادائیگی بھی اس کے ذمہ (Due) ہوگی۔ (شامی)

بیع کرتے وقت مبیع (چیز) کی حوالگی (Delivery) کو مؤخر کرنے کی شرط نہ لگانا، اسی طرح اگر ثمن کوئی سامان ہو تو اس کی ادائیگی کو بھی مؤخر کرنے کی شرط نہ لگانا۔

مسئلہ: بیع کرتے وقت مبیع کی حوالگی کو مؤخر کرنے کی شرط نہیں لگائی لیکن بیع کرنے کے بعد بائع و خریدار اس پر راضی ہوگئے کہ مبیع بعد میں حوالہ کی جائے گی یا بائع اس سے کچھ مدت فائدہ اٹھائے گا تو اس طرح کرنا جائز ہے اور اس سے بیع فاسد نہیں ہوگی۔ (شامی)

ایجاب و قبول رضامندی کے ساتھ ہو، اگر جبر کر کے ایجاب یا قبول کرایا گیا تو اس سے بیع فاسد ہوجائے گی اور بعد میں مجبور شخص کو یہ سودا ختم کرنے یا باقی رکھنے کا اختیار ہوگا۔

بیع کرتے وقت ہر ایسی شرط اور کام سے بچنا جس کا انجام بائع اور خریدار کے درمیان جھگڑا ہو۔

بیع کو سود کے شبہ سے بھی خالی کرنا۔

جس چیز کو اکیلے فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، فروخت کرتے وقت اس کا استثناء کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

کسی چیز کو فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت وصول کرنے سے پہلے وہی چیز خریدار سے کم قیمت پر خریدنا جائز نہیں۔ (جدید تجارت: صـ ۳۹)

بیع فضولی کا حکم:

بیع فضولی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دوسرے کی چیز کو اس امید پر فروخت کردے کہ وہ اس بیع پر راضی ہوجائے گا یا کسی کے لیے اس امید پر مال خریدا کہ وہ اس سودے پر راضی ہوجائے گا، یہ عقد

اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر اصل شخص نے اجازت دے دی تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔ ائمہ فقہ میں سے اگر چہ امام شافعی رحمہ اللہ بیع فضولی کے باطل ہونے کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی رائے یہی ہے کہ اصل فریق کی اجازت سے بیع نافذ ہوجائے گی۔

كما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم : بعث حكيم بن حزام، يشتري له أضحية بدينار فاشترىٰ اضحية فأربح فيها ديناراً (اي اعطى فيها ربحا ديناراً فباعها) فاشترىٰ اخرىٰ مكانها فجاء بالأضحية والدينار إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم . فقال عليه الصلاة والسلام : " ضح بالشاة وتصدق بالدينار ."

(اخرجه ابو داوٗد رقم : ٣٣٨٦، والترمذي رقم : ١٢٥٧)

یعنی نبی کریم ﷺ نے حکیم بن حزام کو ایک دینار دے کر قربانی کی بکری خریدنے بھیجا تو انہوں نے ایک بکری خریدی اور اس کے بعد ایک دینار نفع لے کر فروخت کردی اس کے بعد ایک دینار کی دوسری بکری خرید لی پھر خدمتِ اقدس میں ایک دینار اور بکری لے کر حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بکری کی قربانی کرو اور دینار کو صدقہ کردو۔

ہر دو ائمہ استدلال فرماتے ہیں کہ یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وکیل تھے، بکری خریدنے کے بعد اس کو فروخت کیا پھر دوسری خریدی، نفع اور بکری لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے بیع کو نافذ فرمایا اور بلا اجازت فروخت کرنے اور خریدنے پر کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ان کے حق میں برکت کی دعا دی جس کی وجہ سے بڑے مالدار بن گئے، اس سے ثابت ہوا کہ اگر اصل مالک بیع کی اجازت دے دے تو فضولی کی بیع نافذ ہوگی۔

تحریر اور فون کے ذریعہ خرید وفروخت:

خرید وفروخت جس طرح زبان کے ذریعہ ہوسکتی ہے اسی طرح بوقتِ ضرورت مراسلت اور خط وکتابت کے ذریعہ بھی کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ بیچی جانے والی چیز اور اس کی قیمت تحریر کے ذریعہ مناسب طور پر متعین کردی جائے اور معاملہ میں ایسا ابہام باقی نہ رہے کہ آئندہ نزاع کا اندیشہ رہ جائے، البتہ ضروری ہے کہ اس صورت میں خریدی اور بیچی جانے والی چیز سونے، چاندی کے قبیل سے نہ ہو یا دونوں کی ایک نہ ہو کہ ہم جنس چیزوں کی خرید وفروخت میں سامان اور

قیمت پر ایک ہی مجلس میں قبضہ ہونا ضروری ہے۔

تحریر کے ذریعہ خرید وفروخت کی بابت علامہ شامی رحمہ اللہ کا بیان ہے:

ویکون بالکتابة من الجانبین فإذا کتب اشتریت عبدك فلانا بکذا وکتب إلیه البائع قد بعت فهذا بیع. (ردالمحتار: ٤/٥١٢)

''اور خرید وفروخت کا معاملہ فریقین کی جانب سے تحریری شکل میں ہو سکتا ہے تو اگر خریدنے والے نے یہ لکھ دیا کہ میں نے اتنے میں تیرے فلاں غلام کو خرید لیا اور بیچنے والے نے بھی تحریری شکل میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو اس معاملہ پر بیع کا اطلاق ہوگا۔''

جس طرح تحریر کے ذریعہ خرید وفروخت درست ہے اسی طرح ٹیلی فون کا حکم بھی ہوگا۔ اس لیے کہ تحریر اور ٹیلی فون دونوں میں قریبی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اسی طرح فیکس کے ذریعہ بھی خرید وفروخت کا معاملہ جائز ہوگا۔ فی زمانہ فون، فیکس اور مراسلت کے ذریعہ بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک ایک شہر سے دوسرے شہر جو خرید وفروخت کی جاتی ہے وہ جائز و درست ہے۔ (جدید فقہی مسائل: ١/٣٧٠)

گونگے کی خرید وفروخت کے احکام:

گونگے کے لیے اشارہ کے ذریعہ خرید وفروخت کرنا جائز ہے، اسی طرح لکھ کر بھی وہ معاملہ کر سکتا ہے، اس کے حق میں اشارہ، زبانی ایجاب وقبول کے قائم مقام ہے، بیع تعاطی کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے جبکہ اس میں قدرت کے باوجود زبانی ایجاب وقبول نہیں ہوتا گونگا تو زبان سے بولنے پر قادر ہی نہیں جبکہ انسان ہونے کے ناطے اس کو بھی معاملات خرید وفروخت وغیرہ کی ضرورت ہے، لہٰذا اس کے حق میں یہی اشارہ یا لکھائی کو فقہاء نے گویائی کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

احکام کے لحاظ سے بیع کی اقسام

احکام کے لحاظ سے بیع کی پانچ قسمیں ہیں:

صحیح:

یعنی جو بیع تمام شرائط پوری ہونے کی بناء پر شرعاً جائز ہو، یہ بیع نافذ ہے۔

۲۔ بیع باطل:

یعنی جو بیع اصلاً و وصفاً مشروع نہ ہو، جیسے مردار، خنزیر، شراب وغیرہ کی خرید وفروخت، یہ بیع باطل ہے۔

بیع باطل کا حکم یہ ہے کہ خریدار چیز کا اور بائع قیمت کا مالک نہیں بنتا اور دونوں کے لیے چیز اور قیمت کا استعمال ناجائز ہے۔ اگر خریدار نے چیز پر قبضہ کرلیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس چیز کو واپس کردے، اگر وہ چیز خریدار کے پاس ضائع ہوگئی تو اس کا ضمان اس پر لازم ہوگا، اسی طرح بائع پر لازم ہے کہ وہ قیمت خریدار کو واپس کردے ناجائز چیز فروخت کر کے آدمی اس کی قیمت کا مالک نہیں بنتا ہے۔ (درمختار وعطر الہدایۃ)

۳۔ بیع فاسد:

یعنی بیع اصل کے لحاظ سے مشروع ہے، البتہ اوصاف کے لحاظ سے غیر مشروع ہے، جیسے: کسی غیر معین چیز کی بیع، مثلاً: بکری کی ریوڑھ میں سے کوئی غیر متعین بکری دو ہزار میں فروخت کر دی۔

بیع فاسد کا حکم:

بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ مبیع پر قبضہ نہ کیا جائے اور اگر بائع کی اجازت و رضامندی سے اسی مجلس میں مبیع پر قبضہ کرلیا تو خریدار اس مبیع کا مالک ہوجائے گا لیکن یہ ملکیت حرام ہوگی، قبضہ کرنے کے بعد اگر مبیع موجود ہو تو اسے واپس کرنا واجب ہے اور اگر وہ چیز ضائع ہوگئی یا اس کی ملکیت سے نکل گئی تو اس کی بازار میں رائج قیمت کے مطابق قیمت دینا واجب ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: بیع فاسد سے جو مبیع خریدار کے قبضہ میں آئے اسے کھانا، پینا اور پہننا جائز نہیں ہے، نیز اگر اسے فروخت کردیا اور نفع حاصل ہوا تو یہ نفع بھی حلال نہیں ہے اور اس کا صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ بیع فاسد کے ذریعہ بائع کو جو قیمت یعنی کرنسی نوٹ حاصل ہوئے اس کے لیے ان کا استعمال جائز ہے اور ان کے ذریعہ کوئی چیز بیع صحیح کے ساتھ خرید وفروخت کرنے سے جو نفع حاصل ہوگا وہ بھی جائز ہے لیکن بیع فاسد کرنے کا گناہ ضرور ہوگا۔ (درمختار ومحلہ)

٤۔ بیع موقوف:

یعنی جس بیع کا حکم موقوف ہو، جیسے: بیع فضولی ہے یعنی دوسرے کے مال کو اس کی اجازت

کے بغیر اس کے نام پر فروخت کر دیا ہے، اب یہ بیع شرعاً مالک کی اجازت پر موقوف ہے، جیسا کہ پہلے یہ بات تفصیل سے گزر چکی ہے۔

۵۔ بیع مکرَہ:

کسی انسان کو ڈرا دھمکا کر کسی مال کے بہت کم دام کے ساتھ فروخت کرنے پر یا زیادہ قیمت کے ساتھ خریدنے پر مجبور کیا جائے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے بعد میں جبر و اکراہ ختم ہونے کے بعد اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیع کو برقرار رکھے چاہے تو ختم کر دے۔

۶۔ بیع مکروہ:

مثلاً: جمعہ کی پہلی اذان کے بعد سے نمازِ جمعہ ختم ہونے تک خرید و فروخت مکروہِ تحریمی ہے۔

بیع مکروہ کا حکم:

بیع مکروہ کا حکم یہ ہے کہ اگر سودا مکمل ہو چکا ہے تو خریدار چیز کا مالک بن جائے گا اور ملکیت حرام نہیں ہوگی، نیز بائع قیمت کا مالک بن جائے گا لیکن بیع مکروہ کرنے کا گناہ ہوگا اس پر توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔

اقالۂ بیع کا حکم:

''اقالہ'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جو عقد بیع ہوا ہے اس کو ختم کر دیا جائے، مال بائع کو واپس کر دیا جائے اور قیمت مشتری کو واپس دی جائے، اس کی بعض دفعہ سخت ضرورت پڑتی ہے، مثلاً: خریدنے کے بعد خریدار قیمت ادا کرنے پر قادر نہیں رہا یا بائع کو مکان فروخت کرنے پر پشیمانی اور ندامت ہے، مثلاً: اس جیسا اس کو دوسرا مکان نہیں مل رہا یا ایک سامان خریدا گھر کا کوئی دوسرا فرد بھی وہی سامان خرید کر لے آیا جس کی وجہ سے ڈبل ہو گیا، ان حالات میں اگر طرفین پہلا سودا ختم کرنے پر رضامند ہو جائیں تو شرعاً جائز ہے اس سودا کو ختم کر دیا جائے، البتہ قیمت میں کمی زیادتی جائز نہیں بلکہ جتنی قیمت ادا کی گئی تھی وہی پوری واپس کی جائے گی۔

(ردالمحتار: ۴/۱۰۶، بیوع)

رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کے وقت اقالہ کرنے کی ترغیب دی اس کو باعثِ ثواب قرار دیا۔

كما روي أنه عليه السلام قال : " من اقال نادماً بيعته اقال الله عثرته يوم القيامة ."

(أخرجه ابو داؤد : ٢/٢٤٦، ابن ماجه في كتاب التجارة : ٧٤١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے بیع پر ندامت کی وجہ سے اقالہ کر لیا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی لغزشوں کو معاف فرما دیں گے۔

ہاں! اگر اقالہ کرنے سے پہلے خریدا ہوا مال تلف ہو جائے تو اب اقالہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ اصل مدار مال پر ہے، البتہ قیمت اگر ہلاک ہو جائے اس کے بعد بھی اقالہ ہو سکتا ہے۔

خریدے ہوئے مال کو قبضہ سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا:

کوئی چیز خریدنے کے بعد اس پر قبضہ سے پہلے آگے فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ جب تک قبضہ میں نہ آجائے اس کے ہلاک ہونے، گم ہونے وغیرہ کا خطرہ باقی ہے، اس طرح مشتری کے ساتھ دھوکہ ہو سکتا ہے اور جس بیع میں دھوکہ ہو وہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

لحديث ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما نهى النبي صلى الله عليه وسلم ان يباع الطعام حتى يقبض، قال ابن عباس ولا احسب كل شيء الا مثله . (بخاری رقم : ٢١٣٥)

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کھانے کی اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں میرے خیال میں ہر چیز کا یہی حکم ہے۔

وفي رواية لمسلم من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه ويقبضه . (أخرجه مسلم رقم: ١٥٢٦ باب بطلان البيع قبل القبض)

گوبر اور پاخانہ کی خرید و فروخت:

گوبر کی بیع ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، البتہ پاخانہ کی بیع جائز نہیں الا یہ کہ مٹی ملی ہوئی ہو اور مٹی غالب ہو۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ پاخانہ بالاتفاق نجاستِ غلیظہ ہے اور گوبر میں اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے ہاں نجاستِ غلیظہ ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کے ہاں نجاستِ خفیفہ ہے اگر

ترجیح نجاستِ غلیظہ کے قول کو ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ پاخانہ زیادہ متعفن ہوتا ہے اور گوبر میں تعفن کم ہے۔

قال في التنوير وشرحه: "وبطل بيع قن ضم الى حر وذكية ضمت إلى ميتة ماتت حتف انفها (إلى قوله) ورجيع آدمي لم يغلب عليه التراب فلو مغلوبا به جاز كسرقين وبعر.

(ردالمحتار: ٤/١١٦، احسن الفتاویٰ: ٦/٥٢١)

خون کی بیع وشراء حرام ہے:

حلال جانوروں کا وہ خون جو ذبح کے وقت نکلتا ہے اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، اگر کسی نے فروخت کر دیا اس سے ملنے والی رقم کا استعمال جائز نہیں، اسی طرح انسانی خون فروخت کرنا اور اس کی قیمت کا استعمال کرنا بھی حرام ہے، البتہ خون کا عطیہ دینا جائز ہے۔

یعنی جس طرح بوقتِ ضرورت دوسرے کی اولاد کو دودھ پلانا جائز ہے، اسی طرح ضرورت کے وقت خون کا عطیہ دے کر جان بچانا بھی جائز ہے، بلکہ بعض اوقات حالات کے لحاظ سے ضروری بھی ہو جاتا ہے۔

شراب کی خرید وفروخت حرام ہے:

شراب نجس چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے اس کی تجارت کرنا اس کو استعمال کرنا دونوں حرام ہیں۔

قوله تعالىٰ: ﴿حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما اهل لغير الله به والمنخقة والموقوذة والمتردية﴾

(سورة المائدة: ٣)

تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرجائے اور جو اونچے سے گر کر مرجائے اور جو کسی کی ٹکر سے مرجائے۔

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم بائع الخمر، وشاربها، وعاصرها، ومعتصرها، وحاملها، والمحمولة إليه.

(أخرجه الترمذي: ١٢٩٥، وابن ماجه ٣٣٨١ باب لعنت الخمر في عشرة)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، شراب فروخت کرنے والے پر اور شراب پینے والے پر، شراب نچوڑنے والے پر، اٹھانے والے پر اور اس پر جس کے لیے اٹھا کر لے جائی گئی۔

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أنها قالت : لما نزلت آيات سورة البقرة من اخرها، خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال حرمت التجارة في الخمر . (أخرجه البخارى رقم : ٢٢٢٦)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب شراب کے متعلق سورۂ بقرہ کی آیات نازل ہوئیں تو آپ ﷺ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور اعلان فرمایا: ''شراب کی تجارت حرام ہوگئی ہے۔''

جانوروں کے حمل کو بیچنے کا حکم:

بعض لوگ جانوروں کے حمل کو فروخت کر دیتے ہیں، چونکہ اس کے بارے میں بہت سارے احتمالات ہیں، مردہ پیدا ہو یا زندہ، دبلا ہو یا تروتازہ، نر ہو یا مادہ، جس میں دھوکہ ہونے کا قوی امکان ہے اور بیع میں دھوکہ حرام ہے، لہٰذا حمل کی بیع حرام ہے۔

وقد كانت هذه البيوع مشهورة في الجاهلية، يتعامل بها الناس فحرمها الإسلام لما فيها من الغدر أو الضرر، ووقوع الخلافيات والمخاصمات، وذلك مما يكره الإسلام .

(فقه المعاملات : صـ ٤٦)

شراب ملی ہوئی اشیاء کی خرید وفروخت:

شراب شرعاً حرام اور نجس ہے، جس چیز میں شراب شامل ہو جائے وہ چیز حرام اور نجس ہو جاتی ہے، اگرچہ قلیل مقدار میں کیوں نہ ہو، اس بناء پر جن ادویات میں شراب شامل ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو اور علاج دیگر متبادل داوؤں سے ممکن ہو تو ان کی خرید وفروخت اور استعمال ناجائز ہوگا اور دیگر اشیاء کا حکم یہ ہے کہ شراب ملی ہوئی اشیاء کا استعمال حرام ہے۔

لما ورد في الحديث : فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا ابا عامر إن الله قد حرم الخمر فلا حاجة لنا في خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها على حاجتك فقال يا أبا عامر إن الله تعالىٰ قد

حرم شربها و بيعها و أكل ثمنها .

(المسند للإمام لاعظم : صـ ۳۷۳ كتاب البيوع)

پھل ظاہر ہونے سے پہلے باغات کو فروخت کرنا:

اس وقت عام دستور ہو گیا ہے کہ باغات کے پھلوں کو موسم کے شروع میں کسی ٹھیکیدار کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں، پھر وہ خریدار پھل تیار ہونے کے بعد قسط وار آگے مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے، پھل ختم ہونے تک باغ اس کے قبضہ میں رہتا ہے۔

ایسا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ معاملہ ہونے کے بعد کسی آفتِ سماویہ سے پھل تیار ہونے سے پہلے برباد ہو گیا جس سے خریدار کا نقصان ہوا، بعض دفعہ جتنے پھل کا اندازہ لگایا گیا تھا اس سے کم پیدا ہوا جس سے معاملہ کرنے والوں میں نزاع پیدا ہوا، آپ ﷺ نے ان باتوں کو دیکھ کر پھل تیار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کو منع فرمادیا۔

كما روي بخاري و مسلم عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما قال : نهى رسول الله صلى الله عليه و سلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها نهى البائع و المبتاع .

(أخرجه البخاري رقم : ۲۱۹٤ ومسلم ۱٥٤۳)

وفى رواية لمسلم : قال صلى الله عليه و سلم لو بعت من اخيك ثمراً، فاصابته عاهة، اي آفة و عيب، فلا يحل لك أن تاخذ منه شيئا بم تأخذ مال أخيك بغير حق . (أخرجه مسلم : ۱٥٥٤)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو اپنے مسلمان بھائی کے ہاتھ پھل فروخت کرے اور پھل حاصل ہونے سے پہلے کسی آفت سے برباد ہو جائے تو تمہارے لیے قیمت وصول کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ اگر تم اس صورت میں کچھ وصول کرو گے تو اپنے بھائی کا مال ناحق کھانے والے ہو گے۔

اسی قسم کی اور بہت سی روایات ہیں جن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک باغات میں پھول پھل کی صورت اختیار نہ کرلیں اس کی بیع بالاتفاق جائز نہیں، البتہ پھل لگنے کے بعد کھانے کے قابل ہونے سے پہلے فروخت کرنے کا کیا حکم ہے اس کے بارے میں تفصیل ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''بیع الثمرۃ قبل بدوالصلاح'' کی تین صورتیں ممکن ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ بیع میں یہ شرط لگائی جائے کہ مشتری پھل کو فورا کاٹ لے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ شرط لگائی جائے کہ بیع کے بعد پھل پکنے تک درخت پر لگا رہے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شرط نہ لگائی جائے۔

امام ابی لیلیٰ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کے نزدیک تینوں صورتیں ناجائز ہیں، کیونکہ حدیث میں مطلقاً ممانعت ہے، جبکہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ پہلی صورت کے جواز اور دوسری صورت کے عدم جواز پر اتفاق کرتے ہیں، تیسری صورت میں اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہے، احناف کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، لیکن مشتری پر لازم ہوگا کہ فوراً پھل کاٹ لے اِلا یہ کہ بائع اپنے طور پر پھل کو درختوں پر چھوڑنے کی اجازت دے دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پھل لگنے سے پہلے باغات فروخت کرنا کسی حال میں جائز نہیں، چاہے لوگوں میں اس کا تعامل ہو چکا ہو یا نہ ہو، البتہ اگر بعض پھل ظاہر ہو چکا ہو اور بعض ظاہر ہونا باقی ہو تو ایسی صورت میں درخت پر چھوڑنے کی شرط کے بغیر فروخت کرے اس میں مشایخ احناف میں اختلاف ہے، ظاہر مذہب عدم جواز کا ہے۔ لیکن شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر اکثر پھل ظاہر ہو چکے ہوں تو تبعاً سب کی بیع جائز ہوگی۔ چنانچہ خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں عموم بلویٰ کی وجہ سے اس کو بیع سلم کے ساتھ لاحق کر کے جائز قرار دینا مناسب ہے۔ البتہ بعض فقہاء نے پہلی صورت یعنی پھل لگنے سے پہلے باغ فروخت کرنے کو ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے تاہم مولانا دامت برکاتہم فرماتے ہیں: اس کو جائز قرار دینے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی ایسی ضرورت متحقق نہیں ہوئی جتنی کہ دوسری صورت کی ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ کسی حرام کو حلال قرار دینے کے لیے مطلقاً ضرورت کا تحقق کافی نہیں بلکہ کسی اصل شرعی کے تحت اس کا داخل ہونا ضروری ہے۔ اصل شرعی بعض پھل کے ظاہر ہونے کی صورت میں یہ ہے کہ جو پھل ظاہر ہو چکا ہے اسی میں اصلاً بیع منعقد ہوگی اور جو معدوم ہے ان میں تبعاً، پہلی صورت میں چونکہ سب معدوم ہے اور بیع معدوم حرام ہے، لہٰذا پھل لگنے سے پہلے باغ فروخت کرنا حرام ہے۔

(هذا ملخص ما في تكملة فتح الملهم : ١/٣٨٣_٣٩٤)

حضرت اقدس مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے:

سوال: باغوں کے پھل کی بیع جبکہ بور میں پھل اس قدر نکلا ہو کہ کالی مرچ یا چنے کے برابر ہو تو اسے قابل انتفاع کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور ایسے وقت اس کی بیع درست ہے یا نہیں؟ نیز بعض پھل یک لخت نہیں نکلتے، مثلاً: کیلا تھوڑا تھوڑا نکلتا ہے، اس کی بیع کب درست ہوگی؟ اگر جائز نہیں ہے تو جواز کے لیے کوئی حیلہ کارگر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس سے قبل آنجناب سے استفتاء کیا گیا تھا مگر جواب مختصر ہونے کی وجہ سے خلجان دور نہ ہوا، مقامی علماء میں مسئلہ کے جواز وعدم جواز میں اختلاف چل رہا ہے، عنقریب فریقین کے دلائل آپ کے پاس بھی آئیں گے، امید ہے کہ قدرے تفصیل سے بیان فرمائیں گے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اس معاملہ میں ابتلاء عام اور اس سے احتراز کے تعسر بلکہ تعذر کے پیش نظر اہل فتویٰ پر لازم ہے کہ اس کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرما کر اس کا کوئی حل نکالیں۔

بعض اہل تقویٰ آم سے پرہیز فرماتے ہیں مگر اس پرہیز سے عامۃ المسلمین کے لیے تو کیا سبیل نکلتی خود ان کے لیے بھی کارآمد نہیں، اس لیے کہ یہ معاملہ صرف آم کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اس کے ترک سے تقویٰ محفوظ رہے بلکہ سب پھلوں کی بیع میں یہی دستور ہے بالخصوص کیلے کا مسئلہ تو اور بھی زیادہ کٹھن ہے، اس لیے کہ اس کے تو بہت سے پودے ہی بیع کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

ایسی ضرورتِ شدیدہ کے مواقع میں عمل بالمرجوح بلکہ عمل بمذہب الغیر کی بھی گنجائش دی جاتی ہے، بلکہ بعض مواقع میں عمل بمذہب الغیر واجب ہو جاتا ہے، حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے مواقع ضرورت کو کسی بعید سے بعید تاویل کے ذریعہ کسی کلیہ شرعیہ کے تحت لا کر گنجائش نکالنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے بیع ثمار کی گنجائش نکالنے کی اہمیت و ضرورت پر بہت زور دیا ہے اور طویل بحث فرمائی ہے، بالآخر اس کو بیع سلم سے ملحق

قرار دے کر جواز کا فتویٰ تحریر فرمایا ہے۔

التحریر المختار میں علامہ رافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تحقیق پر کوئی اعتراض نہیں کیا، مگر حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے امداد الفتاویٰ میں مندرجہ ذیل اشکالات تحریر فرمائے ہیں:

(۱) وقت عقد میں مسلم فیہ کا وجود ضروری ہے۔

(۲) مقدار ثمار متعین نہیں۔

(۳) کوئی اجل متعین نہیں۔

(٤) اجل پر مشتری بائع سے مطالبہ نہیں کرتا۔

(٥) اکثر ثمار عددی متقارب یا وزنی متماثل نہیں۔

(٦) اکثر پورا ثمن پیشگی یکمشت تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اشکالِ اوّل کا جواب تو حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے خود ہی تحریر فرما دیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بوقتِ عقد مسلم فیہ کا وجود شرط نہیں۔

ثانی سے خامس تک کے اشکالات کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اشتراط امور مذکورہ کے مفسد ہونے کی علت جہالۃ مفضیۃ الی المنازعۃ ہے، مگر بسبب تعارف احتمال نزاع منقطع ہو گیا۔

فارتفع الفساد لارتفاع العلة كما قالوا فی اشتراط الآلة علی الاجیر والصبغ علی الصباغ والخیط علی الخیاط .

اشکالِ سادس کا حل یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تاخیر الثمن بالاشتراط تین یوم تک اور بدونِ اشتراط زیادہ مدت تک بھی جائز ہے۔

(بداية المجتهد : ٢ / ٢٠٢، اقرب المسالك مع الشرح الصغير : ٣/٢٦٢)

ائمۂ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس پر متفق ہیں کہ بوقتِ عقد وجود مسلم فیہ شرط نہیں، اس لیے مسئلہ زیر بحث میں قول مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اختیار کرنا چاہیے۔

للزوم التلفيق علی اختيار قول الشافعی رحمه الله تعالیٰ .

متعاقدین بوقتِ ضرورت تین روز سے زائد شرط تاخیر ثمن کے فساد سے احتراز کی یہ تدبیر کر سکتے ہیں کہ مشتری کل ثمن بروقت ادا کرنے پر قادر نہیں تو بائع ہی سے قرض لے کر اس کو بطورِ ثمن

واپس کردے۔

یہ تدبیر متعاقدین کے فائدہ کے لیے لکھ دی ہے، ورنہ عوام پر یہ تجسس وتحقیق لازم نہیں بلکہ یہ تعمق جائز ہی نہیں کہ باغ کی بیع مطلق ہوئی ہے یا بشرط تأخیر ثمن؟ پھر شرط تأخیر تین روز تک ہے یا اس سے زائد؟

ہاں جہاں بدونِ تجسس تین روز سے زائد شرط تأخیر محقق ہو جائے یا اس کا دستور عام معروف ہو جائے وہاں احترام لازم ہے۔

فائدہ:

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابتلاء عام وضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے الحاق بالسلم کی بحث بروز البعض کے بیان میں لکھی ہے مگر اس پوری بحث سے ظاہر ہے کہ قبل بروز الثمار بلکہ قبل بروز الازہار کا بھی یہی حکم ہے، جہاں اس میں ابتلاءِ عام کی وجہ سے ضرورتِ شدیدہ کا تحقق ہو جائے، وہاں مذہب مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مطابق اس کو بیع سلم میں داخل کر کے جائز قرار دیا جائے گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کا حل خود فقہ حنفی میں موجود ہے، لہٰذا دوسرے مذاہب کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ آم اور اس قسم کے دوسرے پھلوں کی بیع درختوں پر پھول آنے کے بعد ہوتی ہے، اگر بعض ثمر بھی ظاہر ہو چکا ہو تو کوئی اشکال ہی نہیں اور اگر ثمر بالکل ظاہر نہ ہوا ہو تو یہ بیع الاثمار نہیں بلکہ بیع الازہار ہے اور یہ ازہار مال متقوم منتفع بہ للدواب بل لبعض حاجات الناس بھی ہے، بالفرض فی الحال منتفع بہ نہ بھی ہو تو فی ثانی الحال منتفع بہ ہے:

كما نقل العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ عن الإمام ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ فى صحة بيع الثمار بعد البروز قبل أن تكون منتفعابها. (ردالمحتار: ٤/٤٢)

حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیع الثمر قبل انفراک الزہر کو بالاتفاق ناجائز قرار دیا ہے مگر خود بیع الزہر کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ بیع قبل ظہور الازہار کی صورت میں عمل بمذہب مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے سوا چارہ نہیں اور یہ جب جائز ہوگا کہ اہل بصیرت اس میں ابتلاءِ عام اور

ضرورتِ شدیدہ کا فیصلہ کر دیں۔

کیلے کے باغ کی بیع اس لیے جائز ہے کہ یہ بیع الاشجار مع الاصول ہوتی ہے، لہٰذا بیع کے بعد پیدا ہونے والے درخت مشتری کی ملک ہیں، اگر اس بیع میں مدتِ معینہ کے بعد ترک الاصول للبائع مشروط ہو تو یہ بیع فاسد ہوگی۔

وهو يثبت ملك المشترى بعد القبض فيحل اكله لمشترى الثانى.

اس سے بھی بہتر حل یہ ہے کہ یہ بیع الاشجار بدونِ الاصول ہے، اشجار موجودہ کی بیع میں کوئی کلام نہیں اور اشجار غیر موجودہ کی بیع بتبع الاشجار الموجودہ درست ہے۔

وله نظائر فى كتب المذهب خصوصا فى مبحث بيع الاثمار والازهار من رد المحتار .

شبہہ: بعض حضرات کو شبہہ ہوا ہے کہ بیع بشرط التبقیۃ فاسد ہے اور معاملہ معہودہ میں اگرچہ بیع مطلقاً ہے مگر عرفاً تبقیہ لازم ہے، والمعروف کالمشروط۔

جواب: بحث مذکور میں اس شبہہ کا جواب ہو چکا ہے، یعنی یہ شرط مفضی الی النزاع ہونے کی وجہ سے مفسد تھی، مگر عرفِ عام سے احتمال نزاع منقطع ہو گیا۔

فارتفع الفساد وانظر تفصيله فى اجارات كتب المذهب ـ فاغتم هذا التحرير الفريد وتشكرو اياك والتعمق فى الدين واقتحام المضيق ولن يشاد الدين احد الاغلبه . والله سبحانه وتعالىٰ اعلم

(أحسن الفتاوى: ٤ /٤٨٧)

بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے:

''بیعانہ'' جس کو عربی میں ''عربون'' کہا جاتا ہے، جائیداد یا جانور وغیرہ کے فروخت کرتے وقت یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ جو قیمت طے ہوئی ہے اس کا کچھ متعین حصہ مثلاً: دس ہزار، ابھی دے دیں اگر بعد میں سودے سے مکر گئے تو یہ دس ہزار بائع کا ہو جائے گا مشتری کو واپس نہیں ملے گا، اس شرط کے ساتھ سودا کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ شرطِ فاسد ہے، اگر کسی نے ایسا کرلیا تو اس عقد کو ختم کرنا ضروری ہے اور بیعانہ بھی واپس کرنا ضروری ہے۔ اگر عقد بیع کے وقت ایسی شرط نہیں

لگائی بلکہ قیمت میں سے کچھ حصہ پہلے ادا کردیا، بعد میں مشتری کی وجہ سے اس سودا سے انکار کرتا ہے تو بائع پر شرعاً لازم ہے کہ بیعانہ کی اس رقم کو واپس کردے اس کو روکنا حرام ہے۔

کما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم : انه نهى عن بيع العربون . وفي رواية النسائي نهى عن بيع العربان ومعناهما واحد.

(ابن ماجة رقم : ٢١٩٢ ، ابو داود : ٣٥٠٢)

البتہ اس زمانہ میں بکثرت ایسا ہونے لگا ہے کہ لوگ سودا کرکے کچھ دنوں کے بعد انکار کر دیتے ہیں جس سے بائع کا نقصان ہوجاتا ہے تو تلافی نقصان کے لیے احسن الفتاویٰ میں مندرجہ ذیل تجاویز مذکور ہیں:

(۱) مشتری پوری قیمت ادا کرکے مبیع پر قبضہ کرلے پھر بائع بقدر بیعانہ کم قیمت پر مشتری سے واپس خرید لے۔

(۲) بائع مشتری کی اجازت سے مبیع کو دوسری جگہ فروخت کردے اگر پہلی قیمت سے کم قیمت پر فروخت ہوئی تو یہ نقصان بیعانہ سے وصول کرے اور زیادہ قیمت مل گئی تو زیادتی مشتری اوّل کو واپس کردے۔

(۳) اگر مشتری کسی طرح بھی قابو نہ آئے تو بائع حاکم مسلم کو درخواست دے وہ مال کو فروخت کرکے نمبر۲ میں مذکور تفصیل کے مطابق فیصلہ کرے۔

ومن اشترى عبدا فغاب فبرهن البائع على بيعه وغيبته معروفة لم يبع بدين البائع والابيع بدينه . (كنز الدقائق : صـ ٢٤١)

اگر حاکم مسلم سے یہ کام نہ لیا جاسکے تو علماء کی مجلس میں پیش کرکے تفصیل مذکور کے مطابق فیصلہ کروایا جاسکتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ٦/٥٠١)

بیع بالشرط کا حکم:

''بیع بالشرط'' کی وہ صورت جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''صفقة فی صفقة'' کہا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی چیز متعین قیمت پر اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا کہ خریدار بھی کوئی چیز بائع کے ہاتھ فروخت کرے گا، مثلاً: میں آپ کو یہ مکان دس لاکھ میں اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ آپ اپنا باغ مجھے پانچ لاکھ میں فروخت کریں گے۔ یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں شرط لگا کر

ایک عقد کو دوسرے عقد کے ساتھ معلق کر دیا گیا جبکہ ایسی شرط ممنوع ہے۔

لحديث : نهي النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط .

(أخرجه المالك في المؤطاء : ٦٩ نسائي في سنن : ٧/ ٣٠٠)

بیع عینہ کا حکم:

بیع عینہ کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو رقم کی ضرورت ہے وہ دوسرے شخص کے پاس جاتا ہے وہ قرض دینے کی بجائے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ اپنا کوئی مال اس کے ہاتھ مہنگے دام ادھار پر فروخت کر دیتا ہے، مثلاً: اپنا مکان ہے اس کو ادھار پانچ لاکھ میں فروخت کر دیا ایک سال کے بعد ادائیگی کے وعدہ پر پھر بائع ایک شخص سے یہ مکان چار لاکھ میں نقد خرید لیتا ہے، اس طرح اس شخص کو چار لاکھ روپے ہاتھ آ گئے اور بائع کو ایک سال کے بعد پانچ لاکھ وصول ہوگا۔ شریعتِ مطہرہ نے اس صورت کو سود کھانے کا ایک حیلہ قرار دیا ہے اور اس بیع کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہاں مکان کی خرید و فروخت مقصود ہی نہیں تھی، بلکہ یہ سودی قرضہ لینے دینے کا ایک حیلہ ہوا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے سخت وعید بیان فرمائی ہے:

عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إذا تبايعتهم بالعينة واخذتم اذناب البقر ورضيتم بالزرع، وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم الذلة ، لا ينزعه حتى ترجعوا إلى دينكم . (أخرجه ابو داود رقم : ٣٤٦٢)

یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم بیع عینہ کرو گے اور جانوروں کی دُم کے ساتھ (یعنی ان کی دیکھ بھال میں) مشغول ہو جاؤ گے اور کھیتی باڑی ہی کو پسند کرو گے، اس طرح جہاد کو چھوڑ بیٹھو گے۔ تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط فرما دیں گے اور اس وقت تک ذلت مسلط رہے گی یہاں تک کہ تم دوبارہ دین (یعنی جہاد کے راستہ) کی طرف واپس لوٹ آؤ۔

قال محمد بن الحسن : هذا البيع في قلبي كا مثال الجبال ذميم، أخترعه اكلة الربا . (ردالمحتار : ٤/ ٢٤٤)

یعنی امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیع عینہ گناہ میں پہاڑوں سے بھی بڑی ہے اس کو سود

خوروں نے ایجاد کیا ہے۔

ومما یوئد الحرمة ما رواه البیهقي في السنن الکبری عن ' العالیة بنت ریفع" انها قالت : دخلت انا وام ولد زید بن ارقم . وأمرأته علی عائشة رضي اللّٰه تعالیٰ عنها، فقالت ام ولد زید بن ارقم انی بعت غلاما من زید بن ارقم بثمانمائة درهم إلی العطاء أی إلی ان بافیه عطاؤه من بیت المال ثم اشتریته منه بست مائه درهم، فقالت لها عائشة بئس ما بعت بئس مَا اشتریت ابلغی زید بن ارقم أنه قد ابطل جهاده مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إلا أن یتوب .

(بیهقی سنن کبری : ۵/ ۳۳۰ مصنف عبد الرزاق ۸/ ۱۸٤ ورواه أحمد فی المسند)

حضرت عالیہ بنت ایفع فرماتی ہیں کہ میں اور زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ام ولد اور ان کی بیو ی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو زید بن ارقم کی ام ولد نے کہا کہ میں نے زید بن ارقم کے ساتھ ایک معاملہ اس طرح کیا ہے کہ میرا ایک غلام تھا میں نے اس کو 800 روپے میں ادھار پر اس شرط پر فروخت کیا ہے کہ بیت المال سے عطایا ملنے کے بعد قیمت ادا کرے گا، پھر میں نے ان سے وہی غلام چھ سو روپے نقد میں خرید لیا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا تمہارا یہ بیچنا اور خریدنا بہت برا ہوا ہے یعنی حرام ہوا ہے اور فرمایا کہ میرا یہ پیغام زید بن ارقم کو پہنچا دو کہ اگر تم اس عقد سے توبہ نہیں کرو گے تو تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد جیسی جو عظیم عبادت انجام دی ہے اس کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔

آزاد انسانوں کی خرید وفروخت:

اس وقت انسانی اسمگلنگ (یعنی انسانوں کی خرید وفروخت) میں بہت سے لوگ ملوث ہیں بلکہ بہت سے بین الاقوامی گروہ باقاعدہ اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں، اس کے سد باب کے لیے بین الاقوامی قوانین ہونے کے باوجود اس کی روک تھام مشکل ہوگئی ہے۔

شرعاً کسی بھی آزاد آدمی کی خرید وفروخت حرام ہے، عورت ہو یا مرد، جوان ہو یا بچہ، اگر کسی نے ایسا معاملہ کیا تو اس کے عوض ملنے والی رقم حرام ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ ولقد کرمنا بنی ادم ﴾

''ہم نے بنی آدم کو باعزت بنایا۔''

علامہ صابونی صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہم نے بنی نوع انسان کو آزاد پیدا کیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا غلام نہیں، اب اگر کوئی انسان اس کو گرفتار یا اغواء کر کے تاوان وصول کرتا ہے یا دوسرے کے ہاتھ فروخت کر کے قیمت وصول کرتا ہے تو شرعاً یہ نا قابل معافی جرم ہے اور وہ مال حرام ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال : قال الله تعالىٰ أي في الحديث القدسي، ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة ومن كنت خصمه خصمته . رجل اعطى بى ثم غدر اي عاهد وحلف بالله ثم نقض عهده ورجل باع حراً فأكل ثمنه، ورجل استاجر أجيراً فاستوفىٰ منه ولم يعطه أجره .

(بخاري كتاب البيوع رقم : ٢٢٢٧ باب اثم من باع حرا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں قیامت کے دن تین آدمیوں کی طرف سے مخاصمت کروں گا جس کی طرف سے میں مخاصمت کروں گا اس کو غالب کروں گا:

(۱) وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا، یعنی اللہ کے نام کی قسم اٹھائی اور پھر اس عہد کو توڑ دیا۔

(۲) اور وہ شخص جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی۔

(۳) اور وہ شخص جس نے کسی شخص کو بطورِ مزدور لیا اور اس سے کام کروایا لیکن اس کو اجرت نہیں دی۔

مسجد میں خرید وفروخت کرنا:

معتکف کے لیے مسجد میں اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت کی چیزیں خریدنا جائز ہے کوئی بڑی چیز ہو تو اس کو مسجد میں لانا جائز نہیں، ہاں کوئی ایسی چھوٹی چیز جو زیادہ جگہ نہیں گھیرتی مثلاً: کوئی کتاب، درہم وغیرہ تو اس کو مسجد میں لانا جائز ہے، لیکن مسجد کے اندر تجارت کرنا تو معتکف کے لیے بھی جائز نہیں اور معتکف کے علاوہ عام لوگوں کے لیے تو مسجد کے اندر ہر قسم کی خرید وفروخت

مکروہِ تحریمی ہے۔ چاہے اپنے اور گھر والوں کی ضرورت کی چیزیں ہوں یا یہ کہ کوئی تجارتی سامان اور سامان مسجد میں لاکر بیچا یا سامان لائے بغیر ہی مسجد میں بیٹھ کر خرید وفروخت کا معاملہ کیا جائے تو ہرصورت میں یہ بیع مکروہِ تحریمی ہوگی اور ایسے معاملے کو ختم کرنا شرعاً واجب ہے۔

لقوله عليه السلام : إذا رائتم من يبيع او يبتاع فى المسجد فقولوا: لا اربح الله تجارتك . (أخرجه الترمذى رقم : ١٣٨١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مسجد میں خرید وفروخت والوں کو دیکھو تو یوں بددعاء دو" کہ اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں برکت نہ دے۔"

ذلك لإن المساجد بيوت الله عزوجل، بنيت للعبادة وليست اسواقا للبيع والشراء والتجارة . (فقه المعاملات)

وعقد احتاج إليه لنفسه أو عياله فلو لتجارة كره اي وان لم يحضر السلعة واختاره قاضيخان ورجحه الزيلعي لانه منقطع إلى الله فلا ينبغي له أن يشتغل بامور الدنيا .

(وكره) اي تحريما لانها محل اطلاقهم احضار مبيع فيه كما كره فيه مبايعة غير المعتكف مطلقا نهى، (قوله مطلقا) اي سواء احتاج إليه لنفسه أو عياله أو للتجارة احضره اولا كما يعلم مما قبله ومن الزيلعى والبحر .

(ردالمحتار : ٢/٤٤٨ـ ٤٤٩ كتاب الاعتكاف)

مجسمہ فروش کا حکم:

کسی جاندار کی تصویر بنانا، وہ مجسمہ، مورتی کی شکل میں ہو جس کو عربی میں "تمثال" کہا جاتا ہے یا ایسی تصویر جو کسی کپڑے، کاغذ یا دیوار وغیرہ میں بنی ہوئی ہو، چاہے ہاتھ سے بنائی ہو یا جدید مشینی آلات سے بنی ہو، جس کو عربی میں "صورة" کہا جاتا ہے سب حرام ہیں۔

حرمت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دنیا میں بت پرستی کی بنیاد تصویر سازی اور اس کا احترام بنی ہے جس کی تفصیل کتبِ تاریخ میں موجود ہے اور بت پرستی ہی شرک کی بنیاد ہے جبکہ شرک کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نا قابل معافی جرم قرار دیا ہے:

لقوله تعالیٰ: ﴿ إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء ﴾

یعنی اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو ہرگز معاف نہیں فرمائیں گے اس کے علاوہ جو گناہ چاہیں گے معاف فرمادیں گے۔

اور فرمایا:

قوله تعالیٰ: ﴿ إن الشرك لظلم عظيم ﴾

''شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

حرمت کی دوسری وجہ ''تشبہ بخلق اللہ'' یعنی صفتِ تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مشابہت اختیار کرنا، یہ بھی جرمِ عظیم ہے۔

قوله عليه السلام: إن من اشد الناس عذابا يوم القيامة المصورون. (صحيح بخاری و مسلم)

یعنی قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو دیا جائے گا۔

قال ابو ذرعه: دخلت مع ابي هريرة رضي الله تعالیٰ عنه فی دار مروان فرای فيها التصاوير فقال سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول قال الله عزوجل ومن اظلم ممن ذهب يخلق خلقا كخلقی فليخلقوا ذرة وليخلقوا حبه أو ليخلقوا شعيرة.

(صحيح بخاري باب نقض الصور)

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مروان کے گھر داخل ہوا، انہوں نے اس کے گھر میں تصاویر دیکھیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرتا ہے، پس اس کو چاہیے کہ وہ ایک ذرّہ پیدا کر کے دکھائے کوئی دانہ پیدا کر کے دکھائے یا کوئی جو پیدا کر کے دکھائے۔

وقوله عليه السلام: لا تدخل الملائكة بيتا فيه تماثيل او تصاوير. (صحيح مسلم)

یعنی جس گھر میں مورتی یا تصویر، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

چونکہ تصویر سازی حرام ہے، اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے، لہذا جانداروں کی مجسمہ سازی یا فوٹوگرافی کا پیشہ، اسی طرح پروگراموں کی مووی وغیرہ بنانا اس کو پیشہ کے طور پر اختیار کرنا حرام ہے اور اس سے حاصل ہونے والی کمائی حرام ہے، لہذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تصویر بنانا، بنوانا، خریدنا، فروخت کرنا، قلمی ہو یا عکسی، منقش ہو یا مجسمہ، صرف چہرہ ہو یا پوری، یہ بڑے گناہ کا کام ہے اور حرام ہے، لہذا اگر کسی نے تصویریں بنالیں تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ (عطر: صـ ١٦١)

عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما قال : سمعت محمداً صلى الله عليه وسلم يقول : من صور صورة في الدنيا كلف يوم القيامة ان ينفخ الروح وليس بنافخ .

(صحیح بخاری، باب من صور صورة الخ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں کوئی تصویر بنائے گا تو قیامت کے روز اس کو اس بات کا مکلف کیا جائے گا کہ وہ اس کے اندر روح ڈالے اور وہ اس کے اندر روح نہیں ڈال سکے گا۔

قال سعيد بن أبي الحسن : كنت عند ابن عباس إذ جاء ه رجل فقال : يا ابن عباس ! انى رجل انما معيشتي من صنعة يدى وإنى اصنع هذه التصاوير، فقال ابن عباس : لا أحدثك الا ما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم، سمعته يقول : من صور صورة فإن الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابداً . فربا الرجل ربوة شديدة واصفر وجهه، فقال : ويحك ان أبيت الا ان تصنع فعليك بهذا الشجر، كل شئ ليس فيه روح .

(صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع التصویر)

حضرت سعید بن ابی الحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تھا، اتنے میں ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے آکر کہا کہ اے ابن عباس! میری

معیشت کا دارومدار میرے ہاتھ کی صنعت پر ہے اور میں یہ تصاویر بناتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے وہ بات بیان کرتا ہوں جو جناب رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنی ہے، میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے کوئی تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے والے ہیں یہاں تک کہ وہ اس تصویر میں روح ڈال دے اور وہ شخص کبھی بھی اس میں روح نہیں ڈال سکے گا، یہ سن کر اس شخص نے ایک لمبی سانس لی اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: ارے بھائی! اگر تو بنانا ہی چاہتا ہے تو اس جیسے درخت کی تصویر بنا اور ہر اس چیز کی تصویر بنا جس میں روح نہ ہو۔

''نجش''، یعنی گاہک کو دھوکہ دینے کی حرمت:

بعض تاجر نیلامی کے وقت یا کسی کے ساتھ سودا طے کرتے وقت کچھ دلال رکھتے ہیں اور ان دلالوں کا مقصد خریداری نہیں ہوتا بلکہ وہ محض گاہک کو دھوکہ دے کر چیز کو زیادہ قیمت پر فروخت کروانے کے لیے رکھے جاتے ہیں، شرعاً یہ فعل حرام ہے۔

روي ابن عمر رضي الله عنهما: "نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن النجش." (بخاری رقم: ٢١٤٤، مسلم: ١٥١٦)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ''نجش'' سے منع فرمایا ہے، ''نجش'' کا مفہوم یہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

البتہ اگر کسی نے دلال سے دھوکہ کھا کر زیادہ قیمت پر خرید لیا تو (دھوکہ حرام ہونے کے باوجود) یہ بیع نافذ ہوگی، بعد میں خریدار کو معلوم ہونے کے باوجود سودا واپس کرنے کا حق نہ ہوگا کیونکہ اس نے خود دیکھ کر سودا طے کیا ہے۔

دوسرے کا سودا خراب کرنے کی ممانعت:

دو آدمیوں میں سودا طے ہو رہا ہو بائع نے ایک قیمت پر رضامندی ظاہر کر دی ہو، درمیان میں ایک تیسرا آدمی آ کر کہے میں اس سے زیادہ قیمت پر خریدوں گا، اس طرح دونوں کا سودا خراب کر دے چاہے بعد میں خود خریدے یا نہ خریدے، اس کو عربی میں ''سوم علی سوم الغیر'' کہا جاتا ہے، دوسری صورت یہ ہے ایک شخص نے کوئی مال خرید لیا ابھی قیمت کی ادائیگی باقی تھی، ایک تیسرا شخص آ کر گاہک سے کہتا ہے کہ میں ایسی چیز اس سے کم قیمت پر دیتا ہوں، اب مشتری پہلا سودا ختم کر کے

اس تیسرے شخص سے خریدتا ہے، یہ دونوں فعل حرام ہیں۔

عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال : لا يبيع بعضكم على بيع بعض، ولا يخطب بعضكم على خطبة بعض، ولا يسوم الرجل على سوم اخيه .

(أخرجه الترمذي رقم : ١٢٩٢ والبخاري ٢١٤٠ باب لا يبيع على بيع اخيه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے اور دوسرے کے پیغامِ نکاح پر پیغام نہ بھیجے اور دوسرے کے بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے۔ (بخاری / ترمذی)

کتے کی خرید وفروخت کا حکم:

کتا ایک نجس جانور ہے، اس کو گھر میں رکھنا اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا۔اس کو اپنے ساتھ گھمانا پھرانا جیسا کہ مغرب زدہ طبقہ میں رائج ہے۔یہ شرعاً ممنوع ہے، اس مقصد کیلئے کتے کی خرید وفروخت بھی حرام ہے اور اس سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے، البتہ گھر، شکار یا کھیتی وغیرہ کی حفاظت کیلئے کتا رکھا جائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے اور اس مقصد کیلئے خرید وفروخت بھی جائز ہے اور قیمت بھی حلال ہے۔

روي عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال : من اقتنىٰ كلب الا كلب صيد أو ما شية، نقص من اجره كل يوم قيراطان .

(بخاري ١٢/٧ اسلم ١٢٠١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کتا پالا (سوائے شکاری اور چوکیدار کتے کے) روزانہ اس کے ثواب میں سے دو قیراط کم ہو جائیں گے۔(بخاری و مسلم)

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ثمن الكلب . وقال إن جاء يطلب ثمن الكلب فاملا كفه ترابا . (ابو داؤد رقم : ٣٤٨٢)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت کھانے سے منع فرمایا اور فرمایا اگر وہ قیمت کا مطالبہ کرنے آئے تو اس کے منہ پر مٹی ڈالدو۔

عن عکرمة عن ابن عباس قال : رخص رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ثمن کلب الصید .

(مسند إمام اعظم بالرخصة فی ثمن کلب الصید)

مال پہنچنے سے پہلے اس کی بیع:

سوال: ایک تاجر مال باہر سے منگواتا ہے اور مال پہنچنے سے پہلے ہی منافع پر فروخت کردیتا ہے، یہ منافع اس کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ مال پیشگی فروخت کرنے کا سبب یہ ہے کہ اسے خوف لاحق ہے کہ مال پہنچنے کے بعد کہیں خسارہ نہ اٹھانا پڑے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

مال پر قبضہ کرنے سے قبل اس کی بیع جائز نہیں، لہٰذا یہ منافع بھی حلال نہیں۔

اس کی تصحیح کی دو صورتیں ہیں:

(۱) جہاں مال خریدا ہے وہاں کسی کو یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنادے، اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے۔

(۲) مال پہنچنے سے قبل بیع نہ کرے بلکہ وعدۂ بیع کرے، بیع مال پہنچنے کے بعد کرے، اس صورت میں جانبین میں سے کوئی انکار کردے تو صرف وعدۂ خلافی کا گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اگر مال پہنچانے کا کرایہ خریدار ادا کرتا ہے تو اس کے اذن سے بائع کا کسی بھی مال بردار کمپنی کی تحویل میں مال دے دینا مشتری کا قبضہ شمار ہوگا، اگرچہ مشتری نے کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو، کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہے۔

قال فی الهندیة : " إذا قال المشتری للبائع ابعث الی ابنی واستأجر البائع رجلا یحمله الی ابنه فهذا لیس بقبض والاجر علی البائع الا ان یقول استأجر من یحمله فقبض الاجیر یکون قبض المشتری ان صدقه انه استأجره ودفع إلیه وان انکر استیجاره ودفع إلیه فالقول قوله کذا فی التتارخانیة . (عالمگیریة : ۳/ ۱۹)

(أحسن الفتاوی : ٦/ ٥٢٥)

نمک لگائے ہوئے چمڑے کی خرید وفروخت:

بحمد للہ چمڑے کی تجارت میں آج بھی مسلمانوں کا بہتر تناسب ہے، چمڑا اگر ایسے جانور سے حاصل کیا گیا ہو جس کو شرعی طور پر ذبح کیا تھا تب تو کوئی قباحت نہیں، ایسے چمڑے پاک اور قابل خرید وفروخت ہیں، لیکن اگر مردار کے چمڑے ہوں تو گوشت کی طرح یہ چمڑے بھی ناپاک ہیں اور ان کی خرید وفروخت جائز نہیں، مسلمان تاجرانِ چرم کے لیے یہ پہلو ہندوستان کے ماحول میں خاصا دشوار ہے، کیونکہ ایک کثیر تعداد مشرکین کے ذبیحوں سے حاصل ہونے والے چمڑوں کی ہوتی ہے، اس لیے مسلمان تاجرانِ چرم کو چاہیے کہ ایسے چمڑوں کو اولاً ان کے مالک سے کچھ اجرت لے کر نمک لگا دیں اور پھر انہیں خرید لیں، کیوں کہ مردار کے چمڑے بھی دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں اور دباغت کے لیے نمک لگانا کافی ہے اور دار قطنی رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> استمتعوا بجلود الميتة إذا هي دبغت ترابا كان اورمادا او ملحا او ما كان بعد ان يزيل صلاحه . (فتح القدير : ۱/۹۵) وفي هذا الحديث كلام .

ترجمہ: ”مردہ جانوروں کے ایسے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ جن کو مٹی، راکھ، یا نمک یا کسی اور شئی سے دباغت دے دی جائے، بشرطیکہ اس سے اس کے باقی رہنے کی صلاحیت بڑھ جائے۔“

چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

> ثم الدباغ هو ما يمنع عود الفساد الى الجلد عند حصول الماء فيه والدباغ على ضربين حقيقي وحكمي فالحقيقي هو ان يدبغ بشئ له قيمة كالشب والقرظ والفص وفشور الرمان ولحى الشجر والملح وما اشبه ذالك . (البحر الرائق : ۱/۹۹)

یعنی فقہاء نے فرمایا ہے کہ دباغت ایسے عمل کا نام ہے کہ پانی لگنے کے بعد چمڑا دوبارہ خراب نہ ہو۔ دباغت کی دو قسمیں ہیں دباغتِ حقیقی، دباغتِ حکمی۔

دباغتِ حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز سے دباغت دی جائے کہ جس کی کوئی قیمت ہو، جیسے شب قرظ، عفص، انار کے چھلکے، درخت کی کھال، نمک یا اسی طرح کی دوسری چیزوں سے

دباغت کا عمل انجام دیا جائے۔ (جدید فقهي مسائل : ۱/ ۳۷٤)

تلقی الجلب اور بیع حاضر لباد کی ممانعت:

عن ابي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن التلقي، وأن يبيع حاضر لباد .

(أخرجه البخاري رقم : ۲۱٦۲، مسلم : ۱۵۲۱)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو معاملات سے منع فرمایا ہے ایک ''تلقی الجلب''، جس کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتی لوگ سامان فروخت کرنے کے لیے شہر لا رہے ہوں، کوئی شہری شہر سے باہر نکل کر ان سے سستے داموں خرید لے اور شہر میں لاکر مہنگے داموں فروخت کرے۔ دوسرا ''بیع حاضر لباد'' دیہاتی شہر میں آ کر کم قیمت پر سامان فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اب کوئی دلال اس سے کہے آپ سامان میرے پاس رکھوائیں میں آپ کو یہ چیز زیادہ قیمت پر فروخت کر کے دیتا ہوں، ان دونوں صورتوں میں عام شہریوں کا چونکہ نقصان ہے کہ ان کو زیادہ قیمت پر خریدنی پڑے گی۔ حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ معیشت کو آزاد چھوڑا جائے کہ لوگ اپنے حساب سے فروخت کریں چنانچہ دوسری روایت میں ہے:

لا يبيع حاضر لباد، دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض .

(مسلم رقم : ۱۵۲۲)

مطلب یہ ہے کہ شہری دیہاتی کا دلال بن کر مال فروخت نہ کرے بلکہ ان کو اپنے طور پر فروخت کرنے دیں تاکہ اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے وسیلہ سے رزق عطا فرمائے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک دونوں قسم کی بیع مطلقاً ناجائز اور حرام ہے۔

فقہاءِ احناف فرماتے ہیں کہ یہ دلال دیہات سے لانے والے کو قیمت کے بارے میں دھوکہ دے اور اس کے فعل کی وجہ سے شہر والوں کو نقصان بھی نہ پہنچتا ہو تو اس طرح کی بیع جائز ہے اگر کوئی ایک خرابی بھی لازم آئے تو احناف کے نزدیک ایسا کرنا ممنوع ہے، مکروہِ تحریمی ہے۔

وقال البارقی فی العنايه شرح الهداية : صورته المصرى اخبر بمجئی قافلة عيرة فتلقاهم واشترى الجميع وأدخله المصر يبيعه على ما إراده، فذالك لا يخلوا اما يضر باهل البلد او لا، والثاني لا يخلو من

أن يلبس السعر على الواردين أولا، فإن كان الاوّل بان كان اهل المصرفي قحط وضيق فهو مكروه باعتبار قبح التضييق المجاور المنفك، وإن كان الثاني فقد لبس السعر على الواردين فقد غر وضر وهو قبيح فيكره والا فلا بأس . (العناية : ٥/ ٢٤٠)

قرض کے ساتھ مشروط بیع کا حکم:

روي عن مالك أنه بلغه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع وسلف . (أخرجه مالك في المؤطاء بلاغا)

رسول اللہ ﷺ نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے جو قرض کے ساتھ مشروط ہو۔

اس کی دو صورتیں بنتی ہیں:

(۱) خریدار یوں کہے کہ میں آپ کی چیز مثلاً: ہزار روپے میں اس شرط پر خریدوں گا کہ آپ مجھے دس ہزار روپے قرض بھی دیں گے۔

(۲) دکاندار یوں کہے کہ مثلاً: میں آپ کو یہ چیز ہزار روپے میں اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ اس ہزار کے علاوہ آپ مجھے پانچ ہزار روپے قرض بھی دیں گے۔ یہ بھی بیع فاسد ہے اور ناجائز ہے، کیونکہ اس میں قرض کے ذریعہ سے ایک گونہ نفع حاصل کیا جارہا ہے کیونکہ وہ اس لیے قیمت کم کررہا ہے کہ قرض ملے گا، تو یہ کل قرض "جر نفعا فهو رباً" کے زمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

وروى الترمذي في سننه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم يضمن ولا بيع ما ليس عندك . (ترمذی رقم : ١٢٣٤، ابو داؤد رقم : ٣٥٠٤)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسی بیع حلال نہیں ہے جو قرض کے ساتھ مشروط ہو، اسی طرح بیع میں دو شرطیں لگانا بھی جائز نہیں اور جو چیز ضمان میں داخل نہ ہو اس سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہیں اور جو چیز ملک میں موجود نہ ہو اس کو بیچنا بھی جائز نہیں۔

بیع الوفاء کا حکم:

آج کل بعض لوگ قرض کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس طرح کرتے ہیں کہ اپنا مکان

یا دکان یا زمین اس شرط پر فروخت کر دیتے ہیں کہ (مکان کی قیمت قرض) چھ مہینے یا سال کے بعد مشتری کو واپس کر کے اپنا مکان واپس لے لیں گے پھر وہ مکان بدستور مقروض (بائع) کی ملک میں آجائے گا۔فقہاء اس کو ''بیع الوفاء'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس میں بائع راہن ہے اور خریدار ''مرتہن'' ہے، لہٰذا اس پر رہن ہی کے تمام احکام جاری ہوں گے تو خریدار (مرتہن) کے لیے اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں اگر فائدہ اٹھایا تو سود کے حکم میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا۔ (ماخوذ از عطر هدایه)

البیع الذی تعارفه اهل زمننا احتیالا لربا و سموه بیع الوفاء وهو رهن فی الحقیقة لا یملکه ولا ینتفع به الا باذن مالك وهو ضامن لما اکل من ثمرة و اتلف من شجرة . (ردالمحتار : ۳٤٦/۲)

حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بیع اس وقت فاسد ہوگی جب بیع کے اندر شرط ہو اور وہ دونوں اس کو عقد لازم سمجھ رہے ہوں اگر بیع کے اندر شرط نہ ہو بلکہ بیع کے بعد واپسی کی شرط لگائی ہو تو بیع صحیح ہے البتہ اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے۔

قال فی العلائیة : قیل بیع یفید الانتفاع به وفی إقاله شرح المجمع عن النهایة وعلیه الفتوی وقیل إن بلفظ البیع لم یکن رهنا ثم إن ذکرا لفسخ فیه أو قبله او زعماه غیر لازم کان بیعا فاسدا ولو بعد علی وجه المعیاد جاز ولزم الوفاء به .

(أحسن الفتاوی : ٥٠٧/٦ بحواله ردالمحتار : ٣٧٤/٤)

نیلام کے ذریعہ خرید و فروخت:

اگر کوئی شخص حلال مال کو نیلام کے ذریعہ فروخت کرنا چاہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے بازار میں سامان رکھ کر بولی لگائی جاتی ہے کوئی شخص ایک قیمت پر خریدنے کے لیے تیار ہو جائے تو دوبارہ اس سے زیادہ کے لیے بولی لگائی جاتی ہے آخری قیمت والے کے ہاتھ چیز فروخت کر دی جاتی ہے۔

قال عطاء : ادرکت الناس لا یرون بأسا ببیع المغانم فیمن یزید .

(صحیح البخاری : ٤١٥/٤ باب بیع المزایده)

وروي الترمذی عن انس بن مالك أن رسول الله صلی الله علیه وسلم باع حلسا ـ هو ما یوضع فوق ظهر الدابة وقدحاً وقال: من یشتری هذا الحلس والقدح ؟ فقال رجل : اخذهما بدرهم . فقال النبي صلی الله علیه وسلم : من یزید علی درهم ؟ من یزید علی درهم ؟ فاعطاه رجل درهمین فباعهما منه .

(أخرجه الترمذی رقم : ۱۲۱۸)

آلاتِ موسیقی کی خرید وفروخت

گانے گانا، سننا، سنانا، موسیقی اور دیگر ساز باجے، سننا، سنانا یہ انسانی اخلاق کے بگاڑ کے اسباب ہیں ان کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اس لیے گانا بجانا وغیرہ باتفاقِ امت حرام ہیں، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں ذکر کی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله بغیر علم ویتخذها هزوا ط أولئك لهم عذاب مهین ﴾

''ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تاکہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اس کی ہنسی اڑادے ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔''

(معارف القرآن)

اس کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام قرطبی نے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ سے یہی منقول ہے کہ یہ آیت گانے بجانے اور لغو کہانیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

(قرطبی : ۱۵ / ۱٤)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، مکحول، عمرو بن شعیب، علی بن بذیمہ اور حسن بصری رحمہم اللہ (علماء تابعین) سے بھی یہی منقول ہے کہ یہ آیت غنا ومزامیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر : ۳/۲٤۲)

اور جو گانا تحریکِ اصوات اور تحسین نغمات کے ساتھ برعایت قواعد موسیقی ہو وہ بالاتفاق حرام

ہے۔غرض یہ کہ اس آیت میں لہوالحدیث سے قصے، کہانیاں اور گانے بجانے کا سامان مراد ہے۔ جیسے باجا، بانسری، موسیقی ستار، سارنگی، خرافات ومضحکہ خیز باتیں ناول وافسانہ جات اور گانے بجانے والی لڑکیاں، یہ سب چیزیں لہوالحدیث کے عموم میں داخل ہیں اور یہ سب چیزیں باجماع صحابہ وتابعین وباتفاق ائمہ مجتہدین حرام ہیں جن کے حرام ہونے میں ذرہ بھر شبہ نہیں اور گانا بجانا تو تمام ادیان وملل میں حرام رہا ہے۔ یہ نفسانی وشہوانی چیزیں کسی دین میں کبھی بھی جائز نہیں ہوئیں اور غنا ومزامیر کی حرمت میں بے شمار احادیث آئی ہیں۔ جن کو علامہ ابن حجر مکی نے ''کتاب الزواجر'' میں ذکر کیا ہے لہٰذا اس قسم کے ہفوات وخرافات سے بھرے ہوئے ناولوں اور افسانوں کا پڑھنا بلاشبہ حرام ہے اور اگر اس سے مقصود حق کی طرف کان لگانے اور قرآن سننے سے روکنا ہو تو پھر یہ بلاشبہ کفر ہے۔ دشمنانِ اسلام کا طریقہ یہی ہے کہ حق بات کو توجہ کے ساتھ سننے سے باز رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ تلاش کرتے رہتے ہیں ہیں اور حق کا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر ان کو حق بات سنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں گویا کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں اور مغرورانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے چلتے ہو جاتے ہیں۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں کا حال بیان فرمایا اور وعید وعذاب کی بشارت دی ہے۔

(معارف القرآن ٥١/٤٢٣)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واستفزز من استطعت بصوتك ﴾ (١٧ـ ٦٤)

''اور پھسلا ان میں سے جس کو تو پھسلا سکے اپنی آواز کے ذریعہ سے۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں شیطانی آواز سے گانا بجانا مراد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے ابلیس!) تو انہیں کھیل تماشوں اور گانے بجانے کے ساتھ مغلوب کر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ہر وہ آواز مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف دعوت دے۔ یہی قول حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا ہے اسی کو مفسرِ قرآن ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ٣/٥٠)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ والذین لا یشھدون الزور وإذا مروا باللغو مروا کراما ﴾

(۲۵۔ ۷۲)

''اور وہ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر بیہودہ مشغلوں کے پاس ہوکر گزریں تو سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔''

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''زور'' کے معنی گانا بجانا (احکام القرآن) اور حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ بیہودہ باتوں اور گانے بجانے کی مجلس میں شامل نہیں ہوتے۔(معالم التنزیل : ۴/ ۲۵۱)

ان جریر رحمہ اللہ مختلف اقوال کو جمع کر کے فرماتے ہیں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ یوں کہا جائے: وہ (رحمٰن کے بندے) کسی قسم کے باطل کام میں شریک نہیں ہوتے۔ نہ شرک میں اور نہ گانے بجانے میں اور نہ جھوٹ میں اور اس کے علاوہ بھی کسی ایسے عمل میں جس پر زور کا اطلاق ہو، شریک نہیں ہوتے۔

گانا بجانے کی حرمت پر احادیث مبارکہ:

(۱) عن ابن عباس رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ حرم الخمر والمیسر والکوبة وکل مسکر حرام . (رواہ احمد وابی داؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، جوئے، طبلہ اور سارنگی کو حرام کیا اور فرمایا ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔

(۲) عن ابی ھریرة رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال : استماع الملاھی معصیة والجلوس علیھا فسق والتلذذ بھا کفر .

(قال فی الدرالمختار وغیرہ اي بالنغمة) (کذا فی نیل الأوطار)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گانا سننا گناہ ہے اور ان کے پاس بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت حاصل کرنا کفر ہے، پھر آگے درمختار وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ گانے سے تلذذ مراد ہے اور اس کے نغمہ سے لذت

حاصل کرنا ہے۔

(٣) عن علی رضی اللّٰه تعالیٰ عنه قال ان النبي صلی اللّٰه علیه و سلم بعثت بکسر المزامیر.

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو مزامیر (یعنی گانے بجانے کے آلات) کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

(٤) وعن علی رضي اللّٰه تعالیٰ عنه أن النبي صلی اللّٰه علیه و سلم نهی عن ضرب الدف و الطبل و الصوت و الزمارة.

(کذا في نیل الأوطار)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی ﷺ نے منع فرمایا ڈھول اور طبلہ بجانے اور بانسری کی آواز سننے سے۔ موجودہ زمانے کی موسیقی اسی میں داخل ہے۔

گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے:

(٥) وعن ابن مسعود رضي اللّٰه تعالیٰ عنه أن النبي صلی اللّٰه علیه و سلم قال: الغناء ینبت النفاق في القلب کما ینبت الماء البقل.

(رواه البیهقی و ابن الدنیا و ابی داؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گانا دل میں نفاق کو یوں اُگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اُگاتا ہے۔

گانا بجانے اور سننے پر سخت وعیدیں:

(٦) وعن ابي مالك الاشعری رضي اللّٰه تعالیٰ عنه قال قال: رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم لیشربن ناس من أمتی الخمر یسمونها بغیر اسمها یعزف علی رؤسهم بالمعازف و المغنیات یخسف اللّٰه بهم الأرض ویجعل اللّٰه منهم القردة و الخنازیر.

(رواه ابی داود ابن ماجه ابن حبان)

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پئیں گے اور ان کے سامنے

معازف ومزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے اندر دھنسا دے گا اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا۔

(۷) وعن ابی هريرة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال : يمسخ قوم من أمتي في آخر الزمان قردة والخنازير قالوا يا رسول اللّٰه المسلمون هم ؟ قال نعم يشهدون أن لا إله الا اللّٰه وانى رسول اللّٰه ويصومون . قالوا فما بالهم يا رسول اللّٰه ؟ قال اتخذوا المعازف والقينات والدفوف وشربوا هذه الاشربة فباتوا على شرابهم ولهوهم فاصبحوا وقد مسخوا . (رواه مسدد وابن حبان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخری زمانہ میں میری امت کے کچھ لوگوں کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دیا جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا وہ مسلمان ہی ہوں گے؟ تو ارشاد فرمایا کہ ہاں بلکہ وہ اس بات کی گواہی دینے والے ہوں گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ (یعنی مسلمان ہوں گے) اور روزہ بھی رکھتے ہوں گے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! پھر ان کا قصور کیا ہوگا؟ تو ارشاد فرمایا کہ وہ گانے بجانے کے آلات اور گانے بجانے والی عورتوں اور ڈھول بجانے میں مشغول ہوں گے اور شراب پیا کریں گے۔ وہ رات اسی طرح شراب پینے اور دوسرے کھیل کود میں گزار دیں گے جب صبح کو اٹھیں گے تو ان کے چہرے مسخ ہو چکے ہوں گے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گانا بجانا سننا سنانا شرعاً حرام ہے اور گانا بجانے کے آلات باجا، گٹار، ہارمونیم وغیرہ اور سننے اور دیکھنے کے آلات ٹی وی، وی سی آر، وی سی ڈی، ڈی وی ڈی وغیرہ اور دیگر وہ آلات جو محض موسیقی سننے سنانے دیکھنے کے لیے ہی استعمال ہوتے ہوں اور ان سے کوئی اور کام نہ لیا جاتا ہو تو ایسے آلاتِ معاصی کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ آلاتِ معصیت ہونے کی وجہ سے جواز کی گنجائش نہیں رکھتے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه : ويكره تحريماً بيع السلاح من اهل الفتنة لانه اعانة على المعصية ...... وقلت وإفاد

کلامهم ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما وإلا تنزيها، نهر، ونظيره كراهة بيع المعازف لان المعصية تقام بها .

(ردالمحتار: ۱/۲٦۸ كتاب السير)

وقال العلامة ابن نجيم: نظيره بيع المزامير يكره هنا إن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه وإلا فلا .

(البحر الرائق ٥/١٤٣، بتغيير بسير آخر كتاب البغاة)

حضرت اقدس مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مالا تقوم المعصية بعينه" کا مطلب یہ ہے کہ معصیت سے قبل اس چیز میں صنعت وغیرہ کے ذریعہ کوئی تغیر آ گیا ہو۔ كبيع الحديد من اهل الفتنة وبيع العصير اور ما تقوم المعصية بعينه سے مراد یہ ہے کہ بدونِ تغیر کے اسی حالت میں اس کو معصیت میں استعمال کیا جاتا ہو، كبيع السلاح من اهل البغى . نیز تحریر فرماتے ہیں مزامیر وغیرہ آلات لہو ولعب کے بارے میں مشائخ رحمہم اللہ نے بالاتفاق صاحبین رحمہم اللہ کے قول کے مطابق خرید وفروخت کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ (أحسن الفتاوىٰ: ٦/٥٤٩)

ویڈیو، فلم اور کیسٹ کی بیع:

سادہ کیسٹوں یا جن کیسٹوں میں قرآن کریم، وعظ، تقریر یا اور کوئی دینی، مذہبی یا اصلاحی پروگرام ٹیپ ہو یا اور کوئی ایسی چیز ریکارڈ جو خلافِ شرع نہ ہو تو ان کیسٹوں کا کاروبار بلاشبہ جائز ہے اور آمدنی بھی حلال ہے اور جن کیسٹوں میں گانے، ساز، ڈھولک، سارنگی، ہارمونیم اور میوزک وغیرہ ٹیپ ہوں، ان کیسٹوں کا کاروبار اعانتِ معصیت کی بناء پر ناجائز اور حرام ہے اور اس کی اسی لیے آمدنی بھی حلال نہیں۔

اسی طرح فلم جو کسی کاغذ یا کسی اور مادّے پر اس طرح ثبت ہو کہ اسے معمولی آنکھ سے بھی دیکھا جا سکے، اس کے تصویر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لیے اس کی تجارت ناجائز ہے اور آمدنی حرام ہے۔

البتہ ویڈیو کیسٹ کے حکم میں یہ تفصیل ہے کہ ویڈیو کیسٹ بذاتِ خود کوئی حرام چیز نہیں ہے، اس میں جائز چیز بھی بھری جا سکتی ہے اور ناجائز چیز بھی، مثلاً: بے جان اشیاء کی تصاویر، مناظر

قدرت جو بے جان ہوں، ان کی تصویر یا تعلیمی پروگرام جس میں جاندار کی تصاویر نہ ہوں، اس صورت میں ویڈیو کیسٹ اور اس میں بھری ہوئی چیز دونوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور آمدنی بھی حلال ہے۔

البتہ اگر ویڈیو کیسٹ میں کوئی غیر شرعی، منکر اور فحش پروگرام محفوظ کیا جائے، مثلاً: گانے، فلم، جاندار کی تصاویر وغیرہ تو اس کا حکم بھی کیسٹ کی طرح ہے، یعنی محفوظ شدہ غیر شرعی چیز کی خرید و فروخت نا جائز ہے اور اس کی قیمت بھی حرام ہے، البتہ اصل کیسٹ کی قیمت نا جائز نہیں کہلائے گی۔

گناہ سے بچنے کے لیے ٹی وی فروخت کرنا:

آج کل لوگ اپنے گھروں میں ٹی وی رکھتے ہیں، لیکن اب اگر کسی کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ کیا اس کو دوسرے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہوگا اور اس کی قیمت اس کے لیے حلال ہوگی؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ ٹی وی کا غالب استعمال چونکہ نا جائز طریقوں سے ہو رہا ہے اور وہ اس وقت بے شمار دینی اور دنیاوی خرابیوں اور مفاسد پر مشتمل ہے اس لیے اصل حکم تو یہی ہے کہ ٹی وی نہ گھر میں رکھنا جائز ہے اور نہ اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔

تاہم موجودہ دور میں اس کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، مثلاً: یہ کہ اس کو غیر جاندار اشیاء جیسے عمارتوں، مقامات، پارکوں، سمندروں وغیرہ کی نقل وحرکت یا طلوع وغروب وغیرہ کے مناظر اور تصاویر دیکھنے کے لیے استعمال کیا جائے یا سامان وغیرہ کی چیکنگ اور ہوائی جہاز وغیرہ کے نظام الاوقات بتلانے اور اعلانات کے لیے استعمال کیا جائے یا دیگر سیکورٹی وغیرہ کے انتظامات میں استعمال کیا جائے، لہٰذا اگر مذکورہ بالا جائز مقاصد کے لیے خریدنے والے شخص کو ٹی وی فروخت کیا جائے تو بیع جائز ہے اور اس کی قیمت بھی بلا شبہ حلال ہے۔

البتہ ٹی وی اگر ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے جس کے متعلق غالب گمان یہ ہو کہ خریدنے والا اسے نا جائز کاموں میں استعمال کرے گا تو اس کو اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں گناہ ہے، کیونکہ اس میں گناہ کے کاموں میں اعانت ہے اور اس صورت میں فروخت شدہ قیمت کراہت کے ساتھ حلال ہے۔

فی خلاصة الفتاویٰ : (۳/ ۱۰۰) " وبیع الغلام الأمرد ممن یعلم انه ممن یعصی اللّٰه یکره، لانه اعانة علی معصیة ."

نیز ٹی وی فروخت کرنے کی ایک جائز صورت یہ بھی ہے کہ اس کے تمام پرزے الگ کر لیے جائیں اور ان پرزوں کو فروخت کر دیا جائے تو یہ طریقہ بھی درست ہے۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کو اس گناہِ کبیرہ سے توبہ کی توفیق ہو وہ ٹی وی کو توڑ پھوڑ کر ضائع کرے، ہاں اس میں کوئی پرزہ اس قسم کا موجود ہو جو کسی دوسرے مباح کام میں آسکتا ہو تو اس کے نکال لینے میں مضائقہ نہیں، نیز جس شخص یا کمپنی سے ٹی وی خریدا تھا قیمتِ خرید یا اس سے کم پر اسے بھی واپس کیا جا سکتا ہے۔

(أحسن الفتاویٰ : ۸/ ۳۰۶)

بھنگ اور افیون کی تجارت اور کاشت کا حکم:

بھنگ اور افیون کی کاشت اور خرید و فروخت کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس میں قدرے تفصیل ہے: خلاصہ یہ ہے کہ بھنگ اور افیون سے متعلق دو مسئلے الگ الگ ہیں:

(۱) بھنگ اور افیون کے استعمال کا مسئلہ

(۲) بھنگ اور افیون کی زراعت و تجارت کا مسئلہ

پہلا مسئلہ جامد مسکرات جیسے: افیون وغیرہ کی اتنی مقدار جو بالفعل نشہ کرے یا اس میں ضرر شدید ہو اس کا استعمال بہر صورت ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح مقدارِ نشہ سے کم صرف لہو ولعب اور تلہی کے طور پر استعمال کرنا بھی حرام ہے، البتہ مقدارِ قلیل جو حدِ نشہ سے کم ہو کو دواء کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے، اگرچہ اضطراری حالت نہ ہو۔

قال إبن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ تحت قوله : " ویحرم اکل البنج والحشیشة " : أقول هذا غیر ظاهر لان ما یخل العقل لا یجوزا ایضا بلا شبهة فکیف یقال انه مباح ؟ بل الصواب ان مراد صاحب الهدایة وغیره اباحة قلیله للتداوي ونحوه، ومن صرح بحرمته اراد به القدر المسکر منه، یدل علیه ما فی غایة البیان عن شرح شیخ الإسلام : " أکل قلیل السقمونیا والبنج مباح للتداوي " وما زاد علی ذلك إذا

کان يقتل أو يذهب العقل حرام آهـ فهذا صريح فيما قلناه و مؤيد لما سبق بحثناه من تخصيص ما مرَّ من ان ما اسكر كثيره حرام قليله بالمائعات، و هكذا يقول فى غيره من الأشياء الجامدة المضرة في العقل أو غيره يحرم تناول القدر المضر منها دو ن القليل النافع، لان حرمتها ليست لعينها بل لضررها . وفي أول طلاق البحر: من غاب عقله بالبنج و الافيو ن يقع طلاقه إذا استعمله للهو و إدخال الأفات قصداً لكونه معصية، وإن كان لتداوي فلا لعدمها، كذا فى فتح القدير . وهو صريح فى حرمة البنج و الافيون لا للدواء . وفي البزازية : و التعليل ينادي بحرمته لا للدواء آهـ كلام البحر، و جعل فى النهر هذا التفصيل هو الحق .

و الحاصل ان استعمال الكثير المسكر منه حرام مطلقاً كما يدل عليه كلام العناية، و اما القليل فإن كان للّهو حرام، وإن اسكر منه يقع طلاقه لان مبدأ استعماله كان محظوراً و إن كان للتداوي و حصل منه اسكار فلا، فاغتنم هذا التحرير المفرد .

(ردالمحتار : ٦/٤٥٧، ٤٥٨)

و أيضاً قال العلامة الحصكفي فى بحث الطلاق : (أو سكران) ولو بنبيذٍ أو حشيشٍ أو افيو ن او بنج .

قال إبن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله او افيون او بنج) الافيون ما يخرج من الخشخاش، و البنج نبت مسبت . وصرح فى البدائع وغيرها بعدم وقوع الطلاق باكله معللاً بان زوال عقله لم يكن بسبب هو معصية .

و الحق التفصيل، وهو ان كان للتداوي لم يقع لعدم المعصية، وإن للهو وإدخال الآفة قصداً فينبغي ان لا يتردد فى الوقوع .

(ردالمحتار : ٣/ ٢٤٠)

دوسرا مسئلہ افیون اور بھنگ کی بیع اور زراعت کا ہے تو جس طرح افیون اور بھنگ وغیرہ جامد مسکرات کے استعمال کا حکم نصوصِ شرعیہ میں صراحۃً مذکور نہیں، اسی طرح افیون اور بھنگ وغیرہ جامد مسکرات کی زراعت وتجارت کا حکم بھی قرآن وحدیث میں صراحۃً مذکور نہیں بلکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہا اور مبنی علی العرف ہے، لہٰذا علت حکم کے فقدان اور تبدل عرف کی وجہ سے اس کا حکم بھی بدل سکتا ہے۔

زمانِ سابق میں چونکہ افیون اور بھنگ تداوی میں بکثرت استعمال نہیں ہوتی تھی بلکہ عموماً تلہی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی اس لیے بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کی بیع کو آلاتِ معصیت وآلاتِ لہو ولعب کی بیع کے تحت داخل کر کے اسے ماتقوم بہ المعصیۃ بعینہا قرار دے کر علی الاطلاق مکروہ تحریر فرمایا ہے۔ (انظر ردالمحتار والدر المختار: ٦/٤٠٤) مگر آج کل افیون اور بھنگ دواء کے طور پر کثرت سے استعمال ہونے لگی ہیں اور علاج میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل کر چکی ہیں، بلکہ ضرورتِ شدیدہ کی حد تک پہنچ گئی ہے، لہٰذا ان کی بیع وزراعت قواعدِ فقہیہ کی نظر سے جائز ہے، مثلاً:

" الأمور بمقاصدها، الاحكام تتغير بتغير الزمان، الضرورات تبيح المحظورات وغير ذلك ."

البتہ جس شخص کے بارے میں ظن غالب ہو کہ وہ ان کو تلہی کے طور پر استعمال کرے گا اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں، ان کی بیع زہر کی بیع کی طرح ہوگی کہ زہر فی نفسہٖ طاہر چیز ہے، پسو، کھٹمل، جوؤں وغیرہ کے لیے لوگ اسے گھروں کپڑوں وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں اور زہر کی بیع فی نفسہٖ جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر کسی کے بارے میں ظن غالب ہو کہ وہ یہ زہر خود کھائے گا اور خودکشی کرے گا تو اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں۔

اسی طرح بیع السلاح فی نفسہٖ جائز بیع ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے بيع السلاح من اهل الفتنة اي الفتنة بين المسلمين اور بيع السلاح على أهل الحرب کو مکروہ کہا ہے اور اس کو اعانۃ علی المعصیۃ قرار دیا ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله : وبيع سلاح من أهل الفتنة لان المعصية تقوم بعينه . (ردالمحتار : ٦/٣٩١)

وقال أيضاً : ويكره تحريماً بيع السلاح من أهل الفتنة أن علم، لأنه إعانة على المعصية، وبيع ما يتخذ منه كالحديد ونحوه يكره لأهل الحرب . (ردالمحتار : ٤/٢٦٨)

افیون اور بھنگ کی تجارت وزراعت کے عدم جواز پر احادیث خمر اور کل مسکر حرام اور اس جیسی اور حدیثوں سے استدلال درست نہیں، اس لیے کہ جن احادیث میں مسکرات کو خمر کہا گیا ہے تو ان سے مراد مسکرات مائعہ اور سیال اشربہ ہیں جیسا کہ احادیث کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

قال العلامة بدر الدين العيني في شرح الصحيح البخاري : وقال أهل المدينة وسائر الحجازيين وأهل الحديث كلهم : كل مسكرٍ خمرٌ . فنقول : نحن لا تنازع في هذا لان معناه كل شراب اسكر فحكمه حكم الخمر في الحرمة وبقية الاحكام ..... وبعد ذلك يقول: وملخص الكلام بما فيه الرد على كل من رد على اصحابنا فيما قالوه من إطلاق الخمر حقيقة على النيئ من ماء العنب المشتد وعلى غيره مجازاً او تشبيهاً أبو عمرو القرطبي والخطابي والبيهقي وغيرهم بما رواه الطحاوي عن إبن عباس رضي الله تعالىٰ عنه بإسنادٍ صحيح قال : حرمت الخمر بعينها والمسكر من كل شراب .

(عمدة القاري شرح صحيح البخاري : ٢١/١٧٣،١٧٤)

اسی طرح محرمین اور مانعین افیون کی حرمت پر ایک اور حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں:

"کل ما اسکر کثیره فقلیله حرام ."

لیکن وہ روایت بھی مائع مسکرات یعنی اشربہ کے ساتھ خاص ہے۔

قال محمد : أخبرنا أبو حنيفة عن حماد عن إبراهيم (النخعي) قال : ما اسكر كثيره فقليله حرام خطأ من الناس ، إنما أرادوا السكر حرام من كل شراب قال محمد وهو قول أبي حنيفة .

(كتاب الآثار : ١٨٢)

قال الشيخ ظفر أحمد العثماني رحمه الله تعالىٰ : وليس مراد

النخعي القدح في الرواية لان الراوية صحيحة كما سنذكره بل المراد أن الناس تأولوا على غير تأويله فجعلوا كل ما اسكر كثيره حراماً قليله سواء كان خمراً او غير خمر، وإنما هو مختص بالخمر، والصحيح على العموم هو أن السكر حرام من كل شراب خمراً كان أو غير خمر. (إعلاء السنن: ١٨/ ٣٦)

اوراس روایت کی طرح علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو اشربہ یعنی مائع مسکرات کے ساتھ خاص کیا ہے۔

قال إبن عابدين رحمه الله تعالیٰ: (قوله قال محمد) أقول: والظاهر أن هذا خاص بالأشربة المائعة دون الجامد كالبنج والأفيون فلا يحرم قليلها بل كثيرها المسكر، وبه صرح إبن حجر الهيثمي في التحفة وغيره، وهو مفهوم من كلام ائمتنا لأنهم عدوها من الأدوية المباحة وإن حرم السكر منها بالإتفاق كما نذكره. ولم نراحداً قال بنجاستها ولا بنجاسة نحو الزعفران مع أن كثيره مسكر، ولم يحرموا اكل قليله أيضاً، ويدل عليه أنه لا يحد بالسكر منها كما يأتي، بخلاف المائعة فإنه يحد، ويدل عليه أيضاً قوله في غرر الافكار، وهذا الأشربة عند محمد و موافقيه كخمر بلا تفاوت في الأحكام وبهذا يفتى في زماننا آهـ فخص الخلاف بالاشربة، وظاهر قوله بلا تفاوت أن نجاستها غليظة فتنبه لكن يستثنىٰ منه الحد فإنه لا يجب إلا بالسكر، بخلاف الخمر.

والحاصل أنه لا يلزم من حرمة الكثير المسكر حرمة قليله ولا نجاسته مطلقاً إلا في المائعات لمعنى خاص بها، أما الجامدات فلا يحرم منها إلا الكثير المسكر، ولا يلزم من حرمته نجاسته كالسمّ القاتل فإنه حرام مع أنه طاهر، هذا ما ظهر لفهمي القاصر.

(ردالمحتار: ٦/ ٤٥٥)

وأيضا قال : اقول : المراد بما اسكر كثيره الخ من الاشربة، وبه عبر بعضهم. والالزم تحريم القليل من كل جامدٍ إذا كان كثيره مسكرا كالزعفران والعنبر، ولم ارمن قال بحرمتها، حتى ان الشافعية القائلين بلزوم الحد بالقليل مما اسكر كثيره خصوه بالمائع .

(ردالمحتار : ٤/ ٤٢) (ماخوذ از تبويب جامعة الرشيد)

غصب اور چوری کے مال خریدنے کا حکم:

کسی مال کے متعلق قرائن سے معلوم ہو جائے کہ یہ چوری کا مال ہے یا غصب شدہ مال ہے۔ اس کو خریدنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ گناہ کے کام میں تعاون ہے اور گناہ کے کام میں تعاون کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

قوله تعالىٰ : ﴿ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان ﴾

(سورة المائدة : ٢)

گناہ اور ظلم کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون مت کرو۔

قوله عليه السلام : من اشترى سرقة، وهو يعلم أنها سرقة، فقد اشترك في اثمها وعارها . (جمع الفوائد)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جانتے ہوئے چوری شدہ مال خریدا وہ بھی چور کے ساتھ اس کے گناہ اور عار میں شریک ہوگا۔

اگر کسی شخص نے غلط فہمی میں مال خریدا تو بعد میں حقیقت واضح ہونے کے بعد وہ مال اصل مالک کو واپس کیا جائے اور ادا کردہ قیمت بائع (چور/ غاصب) سے واپس لی جائے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : ولو ظهر غير حلال اي مسروقا أو مغصوبا يرجع عليه المشترى .

(ردالمحتار : ٤/ ١٠٦ كتاب البيوع)

وقال ملك العلماء العلامة الكاساني رحمه الله : ولو باع السارق المسروق من انسان او ملك منه بوجه من الوجوه فإن كان قائما فلصاحبه أن يأخذ لانه عين ملكه وللمأخوذ منه ان يرجع

بالضمان علی السارق . (بدائع الصنائع : ۸۵/۵ کتاب البیوع)

حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنے کا حکم:

اسی طرح کسٹم والے یا حکومت کے دیگر کارندے لوگوں کے مختلف اموال ناحق اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں، بعد میں بذریعہ نیلام سستے دام فروخت کردیتے ہیں چونکہ ان اموال پر حکومت کا قبضہ ظلم ہے، لہٰذا علم ہوتے ہوئے ان اموال کو خریدنا جائز نہیں۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : لا یحل مال امری مسلم الا بطیب نفس . قلت : وکل مال ممنوع حکمہ حکم مال مسلم .

(أحسن الفتاوی : ۹۳/۸)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔

حرام مال سے خریدی ہوئی چیز کا استعمال بھی حرام ہے:

حرام طریقہ مثلاً: بینک یا انشورنس کی ملازمت یا غصب سے حاصل شدہ مال کے عوض کوئی کھانے پینے کی چیز خریدلے تو اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اگر عین غصب شدہ مال دے کر کوئی چیز خریدی اس کا استعمال تو بالاتفاق حرام ہے۔ اگر نقد رقم ہے تو اس میں امام کرخی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اگر خریدتے وقت حرام رقم کی طرف اشارہ کیا اور اسی رقم سے قیمت ادا کی تب تو خریدکردہ اشیاء حرام ہوں گی اور اگر خریدتے وقت اس رقم کی طرف اشارہ نہیں کیا یا اشارہ تو کیا لیکن قیمت اس رقم سے ادا نہیں کی تو ان حالات میں خریدی ہوئی اشیاء میں کوئی کراہت نہیں۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راجح یہی ہے کہ بہر حال حرام مال سے حاصل کردہ اشیاء حرام ہیں خواہ اشارہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اور احتیاط بھی اسی میں ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ : نقل عن الحموی عن صدر الإسلام : إن الصحیح لا یحل لہ الاکل ولا الوطئ لان فی السبب نوع خبیث اھ فلیتأمل . (ردالمحتار : ۱۶۵/۵)

قول کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث اور قیاس وعقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے، بندہ نے اس کا صحیح محمل تلاش کرنے کی کوشش کی اور بعض دوسرے علماء محققین سے بھی دریافت کیا مگر عقدہ

حل نہ ہو سکا۔

البتہ غصب شدہ رقم کی مقدار مالک کو واپس کردے اگر مالک معلوم نہ ہو تو کسی مسکین پر صدقہ کردے تو یہ چیز حلال ہو جائے گی۔ (ماخوذ از احسن الفتاویٰ ۸/۱۰٤)

فارمی مرغیوں کی خوراک اور گوشت کا حکم:

پولٹری فارم والے مختلف قسم کے مردار جانوروں کا خون اور دوسرے بعض اعضاء اور دوائی وغیرہ ملا کر مرغیوں کی غذا تیار کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی خوراک مرغیوں کو کھلانا اور اس خوراک کی خرید وفروخت کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز اس خوراک سے پلی ہوئی مرغیوں کے گوشت کا کیا حکم ہے؟

جواب یہ ہے کہ مرغیوں کو بھی حلال اور پاکیزہ غذا کھلانا چاہیے، ایسی حرام غذا مرغیوں کو کھلانا جائز نہیں، نیز اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں، البتہ گوشت کی حرمت کے لیے یہ شرط ہے کہ ناپاک غذا کی وجہ سے گوشت میں بدبو پیدا ہو جائے، لیکن عام طور پر چونکہ گوشت بدبودار نہیں ہوتا اس لیے فارمی مرغیوں کا گوشت استعمال کرنا شرعاً حلال ہے۔

وقال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : وتحبس الجلالة حتى يذهب نتن لحمها وقدر بثلاثة ايام لدجاجة واربعة لشاة وعشرة لا بل وبقر على الا ظهر ولو اكلت النجاسة وغيرها بحيث لم ينتن لحمها كما حل اكل جدى غذى بلبن خنزير لان لحمه لا يتغير وما غذى به يصير مستهلكا لا يبقى له اثر.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله : (قوله حلت) وعن هذا قالوا لا بأس بأكل الدجاج لانه يخلط ولا يتغير لحمه وروي انه عليه السلام كان يأكل الدجاج وما روي أن الدجاجة تحبس ثلاثة ايام ثم تذبح فذالك على سبيل التنزه وزيلعى . (ردالمحتار : ٥/٢١٧)

زندہ مرغی کو وزن کر کے فروخت کرنے کا حکم:

آج کل زندہ مرغی تول کر فروخت کی جاتی ہے شرعاً اس کا کیا حکم ہے جبکہ صاحبِ ہدایہ کی اس عبارت سے عدمِ جواز معلوم ہوتا ہے۔

ولا یمکن معرفة ثقله بالوزن لانه یخفف نفسه مرة ویثقل اخری

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مرغی کے سانس کی وجہ سے اس کے وزن میں کوئی معتد بہ فرق نہیں آتا لہٰذا جہالت یسیرہ ہے جو مفضی الی المنازعۃ نہیں نیز اس طرح خرید وفروخت کے عرف عام ہو جانے کی وجہ سے اس میں نزاع کا احتمال نہیں اس لیے یہ بیع جائز ہے۔ (أحسن الفتاویٰ : ۶/۴۹۷)

انسانی بالوں کی خرید وفروخت:

بعض عورتیں اپنے بالوں کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے دوسری عورتوں کے بال لے کر اپنے بالوں کے ساتھ ملا لیتی ہیں شرعاً یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ حدیث میں ایسا کرنے والیوں پر لعنت وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یا رسول اللہ (ﷺ) میری بچی کو بخار لاحق ہوا جس کی وجہ سے سر کے بال ٹوٹ کر کم ہو گئے اب اس کی شادی کرنے کا ارادہ ہے تو کیا میں کسی عورت کے بال لے کر اس کے بالوں میں ملا لوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"لعن اللّٰه الواصلة والمستوصلة." (أخرجه البخاری : ۵۹۳۷)

یعنی اللہ تعالیٰ نے "واصلہ" اور "مستوصلہ" دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

"واصلہ" کا معنی ہے جو عورت اپنے بال کاٹ کر فروخت کرے۔

"مستوصلہ" جو دوسرے کے بال خرید کر اپنے بالوں میں ملا لے۔

شرعاً یہ فعل ممنوع اور باعثِ لعنت اس لیے ہے کہ اس میں:

(۱) دھوکہ دہی کے ذریعہ اپنے آپ کو جوان اور حسین ظاہر کیا جاتا ہے۔

(۲) اجنبی مرد بھی یہ بال دیکھیں گے جبکہ شرعاً اجنبیہ عورت کے بال دیکھنا یا اجنبی مرد کو اپنے بال دکھانا جائز نہیں۔

قوله تعالیٰ: ﴿ولا یبدین زینتهن الا لبعولتهن﴾

اس لیے بالوں کی خرید وفروخت بھی ناجائز اور حرام ہے۔

البتہ کسی جانور کے بال ہوں تو اس کو خریدنا اور اپنے بالوں میں ملانا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه : تحت (قوله وشعر الانسان)

ولا یجوز الانتفاع به لحدیث لعن الله الواصلة و المستوصلة وانما یرخص فیها تتخذ من الوبر فیزید فی قرون النساء و ذوائبهن هدایة .

(ردالمحتار: ٤/ ١٠٥)

تجارت میں منافع کی مقدار متعین نہیں:

شریعتِ مقدسہ نے تجارت میں مال میں منافع حاصل کرنے کی کوئی خاص حد متعین نہیں کی کہ کوئی مال خرید کر آپ صرف اتنے فیصد نفع لے کر فروخت کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ بلکہ اس کو عاقدین پر چھوڑ دیا کہ وہ باہمی رضامندی سے جس طرح چاہیں معاملہ طے کر لیں، البتہ اس حد تک منافع لینا جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو یا لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا خلافِ مروّت ہے، اس لیے حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

ہاں البتہ مال کی بے جا تعریف کرنا یا عیب چھپانا یا نقلی اور جعلی مال کو اصلی ظاہر کر کے دھوکہ دے کر زیادہ رقم وصول کرنا یہ گناہِ عظیم ہے۔

قال العلامة علی حیدر رحمه الله : " وجاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقهیه بأنه مبادلة المال بالمال بالرضاء .

(درد الحکام شرح مجلة الأحکام : ١/ ١٠٦)

غبن فاحش کا مسئلہ:

اگر بائع نے کسی بھی طریقہ سے مشتری کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ ویسے دوگنی سہ گنی قیمت وصول کر لی بعد میں مشتری کو اس کا علم ہو جاتا ہے اب کیا اس کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ معاملہ ختم کرے؟ تو جمہور کی رائے یہ ہے کہ چونکہ بائع نے کسی قسم کا دھوکہ نہیں دیا صرف زیادہ قیمت وصول کر کے خلافِ مروت کام کیا تو شرعاً مشتری کو سودا ختم کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ کی رائے:

البتہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مندرجہ ذیل صورتوں میں سودا ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

(١) عاقدین بالغ ہوں وہ کسی نابالغ کی طرف سے وصی یا وکیل ہو تو نابالغ کے حق کو

بچانے کے لیے رد کا اختیار حاصل ہوگا۔

(۲) مشتری نے بائع سے کہا ہو کہ آپ جتنے میں عام لوگوں کو بیچتے ہیں مجھے بھی اتنی ہی قیمت پر دیں اس کے باوجود بائع نے زیادہ قیمت وصول کی۔

(۳) مشتری نے کہا بازاری قیمت پر دیدیں بائع نے بازاری قیمت سے دوگنی قیمت وصول کر لی ان تینوں صورتوں میں حقیقت معلوم ہونے کے بعد مال واپس کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ بشرطیکہ مال موجود ہو۔ (فقه المعاملات للصابوني)

البتہ اگر بیع کے وقت یہ شرط رکھے کہ دھوکہ نہ دیں تو اس صورت میں اگر دھوکہ ثابت ہو جائے تو جمہور کے نزدیک بھی رد کا حق حاصل ہوگا لیکن یہ خیارِ شرط کی وجہ سے ہوگا نہ غبن کی وجہ سے۔

عیب دار چیز عیب بتائے بغیر فروخت کرنا:

دکان میں کوئی عیب دار چیز ہو تو گاہک کو عیب پر مطلع کیے بغیر فروخت کرنا سخت گناہ ہے۔

لقوله عليه السلام : من باع معيبا لم ينبه لم يزل في لعنت الله ويلعنه الملائكة .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے گاہک کو بتائے بغیر عیب دار چیز فروخت کر دی وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت میں گرفتار رہے گا۔ ایسا شخص فاسق ہو جاتا ہے۔ بعد میں عیب پر مطلع ہونے کی صورت میں خریدار کو مال واپس کرنے کا حق ہوگا، تفصیلات خیارِ عیب کے مسئلہ کے ضمن میں بیان ہوں گی۔

مرابحہ:

مرابحہ کا معنی یہ ہے کہ قیمتِ خرید بتا کر اس پر متعین نفع لے کر فروخت کیا جائے، مثلاً: دکاندار گاہک کو یہ کہے کہ یہ چیز دس روپے میں پڑی ہے اور میں آپ کو بارہ روپے میں بیچتا ہوں۔

تولیہ:

تولیہ کا معنیٰ ہے کہ جتنی قیمت پر خریدا ہے، اتنی قیمت میں فروخت کر دے مثلاً: دس کا خریدا دس میں فروخت کر دے۔

وضعیہ:

وضعیہ کا معنیٰ ہے کسی ضرورت سے قیمتِ خرید سے کم پر فروخت کرنا۔

ان تینوں قسموں میں ضروری ہے کہ بائع امانت داری اور سچائی سے کام لے اگر بعد میں جھوٹ ظاہر ہو جائے تو خریدار کو حق حاصل ہوگا کہ سودا ختم کر کے مال واپس کر دے۔

مساومہ:

مساومہ یہ ہے کہ آپس کے بھاؤ تاؤ کے ذریعہ مارکیٹ ریٹ پر سودا طے کیا جائے، اس میں اگر قیمت زیادہ بھی ہو جائے تو بھی واپس کرنے کا حق نہ ہوگا جیسا کہ اوپر کے مسئلہ میں گزرا ہے، کیونکہ خریدار عاقل، بالغ شخص ہے خود دیکھ کر اس نے مال خریدا ہے، البتہ بہت زیادہ قیمت وصول کرنا خلافِ مروّت ہے، مسلمان کو دوسرے مسلمان کا خیال رکھنا چاہیے۔

قسطوں پر خرید و فروخت کا حکم

قسطوں پر بیع کی حقیقت:

قسطوں پر بیع کا مطلب یہ ہے کہ جس میں بیچنے والا اپنا سامان خریدار کو اسی وقت دے دے، لیکن خریدار اس چیز کی قیمت فی الحال ادا نہ کرے، بلکہ وہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کو ادا کرے۔ لہٰذا جس بیع میں مذکورہ بالا صورت پائی جائے اس کو ''بیع بالتقسیط'' کہیں گے، چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم یا زیادہ۔ لیکن ''بیع بالتقسیط'' میں عام معمول یہ ہے کہ اس میں چیز کی قیمت بازار کی قیمت سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے، لہٰذا اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہتا تو وہ اس چیز کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے، لیکن اگر خریدار اس چیز کو ادھار خریدنا چاہے گا تو بیچنے والا اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہوگا جب اس کو نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت وصول ہو۔ اس لیے عام طور پر ''بیع بالتقسیط'' میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

مدت کے مقابلے پر قیمت زیادہ کرنا:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد فروخت کے مقابلے میں قیمت زیادہ مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر قدیم اور جدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے، چنانچہ بعض علماء اس زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں، اس لیے کہ ثمن کی یہ زیادتی ''مدت'' کے عوض میں ہے اور جو ثمن ''مدت'' کے عوض میں دیا جائے وہ سود ہے یا کم از کم سود کے

مشابہ ضرور ہے۔ یہ زین العابدین علی بن الحسین اور الناصر، المصور باللہ اور ہادویہ کا مسلک ہے اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ان فقہاء کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے۔ (نیل الاوطار : ۱۷۲/۵)

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع مؤجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہوگی، لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کر لیں تو یہ بیع جائز ہو جائے گی۔

چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة" کے تحت فرماتے ہیں:

وقد فسر بعض اهل العلم، قالوا بيعتين في بيعة ان يقول ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة، وبنسيئة بعشرين، ولا يفارقه احد البيعين فإن فارقه على احدهما فلا باس إذا كانت العقدة على احد منهما.

(ترمذی، کتاب البیوع، باب نمبر ۱۸، حدیث نمبر : ۱۳۳۱)

"بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح بیان کی ہے کہ "بیعتین فی بیعۃ" سے مراد یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ "میں یہ کپڑا تم کو نقد دس روپے میں بیچتا ہوں اور ادھار بیس روپے میں بیچتا ہوں" اور پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کرنے سے پہلے وہ جدا ہو گئے لیکن اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدا ہوئے تو اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی بیع جائز ہے) کیونکہ معاملہ ایک صورت پر طے ہو گیا ہے۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بیع کے ناجائز ہونے کی علت یہ ہے کہ عقد کے وقت کسی ایک صورت کی عدم تعیین سے ثمن دو حالتوں میں متردد ہو جائے گا اور یہ تردد جہالتِ ثمن کو مستلزم ہے، جس کی بناء پر بیع ناجائز ہوگی مگر مدت کے مقابلے میں ثمن کی زیادتی ممانعت کا سبب نہیں، لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین کر کے جہالتِ ثمن کی خرابی دور کر دی جائے تو پھر اس بیع کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں رہے گی۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا بھی وہی مسلک ہے جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے:

(دیکھئے: المغني لابن قدامة : ٤/ ١٧٧، المبسوط للسرخسي: ١٣/ ٨،

الدسوقي على الشرح الكبير : ٣/ ٥٨، مغني المحتاج للشربيني : ٢/ ٣١)

اور دلائل کے اعتبار سے بھی یہ راجح ہے اس لیے کہ قرآن وحدیث میں اس بیع کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں اور اس بیع میں ثمن کی جو زیادتی پائی جارہی ہے اس پر ربا کی تعریف بھی صادق نہیں آرہی ہے کیونکہ وہ قرض نہیں ہے اور نہ ہی یہ اموالِ ربویہ کی بیع ہو رہی ہے بلکہ یہ ایک عام بیع ہے اور عام بیع میں بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے فروخت کرے اور بائع کے لیے شرعاً یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چیز بازار کے دام پر ہی فروخت کرے اور قیمت کے تعین میں ہر تاجر کا علیحدہ اصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کی قیمت حالات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں ایک مقرر کرے اور دوسری حالت میں دوسری مقرر کرے تو شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی چیز نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچ رہا ہو، اس شخص کے لیے بالاتفاق اسی چیز کو نقد دس روپے میں فروخت کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس میں دھوکہ فریب نہ ہو اور جب نقد دس روپے میں بیچنا جائز ہے تو ادھار دس روپے میں بیچنا کیوں ناجائز ہوگا؟

چونکہ یہ مسئلہ ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے اور اکثر فقہاء اور محدثین نے اس کو بیان کیا ہے اس لیے قرآن وسنت سے اس بیع کے جواز پر دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس بیع کے جواز کے بعد اس سے متفرع ہونے والے مختلف مسائل پر ان شاء اللہ تفصیلی بحث کریں گے۔

دو قیمتوں میں سے کسی ایک کی تعیین شرط ہے:

جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ بائع کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ بھاؤ تاؤ کے وقت مختلف قیمتیں بیان کرے، مثلاً: یہ کہے کہ نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچوں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں متعین کرے؟ مثلاً: وہ کہے کہ ایک ماہ کے ادھار پر دس روپے میں اور دو ماہ کے ادھار پر بارہ روپے میں (اور تین ماہ کے ادھار پر چودہ روپے میں) بیچتا ہوں؟ اس بارے میں فقہاء کی کوئی عبارت تو نظر سے نہیں گزری، البتہ فقہاء کے سابقہ اقوال پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی جائز

ہے، اس لیے کہ جب نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے۔ اس لیے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

البتہ مختلف قیمتوں کا تذکرہ صرف بھاؤ تاؤ کے وقت ہی جائز ہے۔ لیکن عقدِ بیع صرف اس وقت جائز ہے جب عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعیین پر اتفاق ہو جائے، لہٰذا بھاؤ تاؤ میں ذکر کردہ مختلف قیمتوں اور مدتوں میں سے کسی ایک کی تعیین بیع کے وقت ہی ضروری ہے۔ ورنہ بیع جائز نہ ہوگی۔

اور اگر بھاؤ تاؤ کے وقت بائع مشتری سے کہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرو گے تو اس کی قیمت دس روپے ہے اور اگر دو ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت بارہ روپے ہے اور تین ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت چودہ روپے ہے اور پھر مجلس عقد میں کسی ایک شق کی تعیین کے بغیر عاقدین اس خیال سے جدا ہو گئے کہ مشتری ان تین شقوں میں سے ایک شق کو بعد میں اپنے حالات کے مطابق اختیار کر لے گا تو یہ بیع بالاجماع حرام ہے اور عاقدین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کریں اور دوبارہ اَز سرِ نو تجدید عقد کریں۔ جس میں کسی ایک شق کو وضاحت کے ساتھ متعین کریں۔

ثمن میں زیادتی جائز ہے، منافع کا مطالبہ جائز نہیں:

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اوپر اس بیع کے جواز کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس وقت ہے جب نفس ثمن میں زیادتی کر دی جائے، لیکن اگر یہ بیع اس طرح کی جائے جس طرح بعض لوگ کرتے ہیں کہ نقد بیچنے کی بنیاد پر اس چیز کی ایک قیمت مقرر کر لیتے ہیں اور پھر اس قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس کی اصل قیمت پر اضافہ کرتے ہیں، یہ صورت سود میں داخل ہے۔ مثلاً: بائع یہ کہے میں فلاں چیز تم کو آٹھ روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں، لیکن اگر تم نے ایک ماہ تک قیمت ادا نہ کی تو تمہیں دو روپے مزید ادا کرنے ہوں گے۔ اب اس دو روپے کو ''منافع'' کا نام دیا جائے یا کچھ اور لیکن اس کے سود ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے مقرر کر دی اور یہ آٹھ روپے بیع کے نتیجے میں مشتری کے ذمہ دین ہو گئے۔ اب اس آٹھ روپے سے زیادہ مطالبہ کرنا یقیناً سود ہی ہے۔

دونوں صورتوں میں عملی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت اس لیے جائز ہے کہ اس میں فریقین کے درمیان جن مختلف قیمتوں پر بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا ان میں سے ایک قیمت یقینی طور پر فریقین کے اتفاق سے طے ہو جاتی ہے اور بیع مکمل ہونے کے بعد اس قیمت میں اضافہ یا کمی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور مشتری کی طرف سے قیمت کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، مثلاً: اگر مشتری نے وہ چیز دس روپے میں اس شرط پر خریدی کہ ایک ماہ بعد قیمت ادا کرے گا لیکن کسی وجہ سے وہ ایک ماہ کے بجائے دو ماہ میں قیمت ادا کرے تب بھی وہ دس روپے ہی ادا کرے گا اب مدت کی زیادتی کی بنیاد پر قیمت میں زیادتی نہیں ہوگی اور دوسری صورت اس لیے ناجائز ہے کہ اس میں قیمت تو آٹھ روپے متعین ہوگئی اور پھر ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس میں نفع کا اضافہ کیا گیا اور اس کے بعد پھر ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوتی جائے گی نفع میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا مثلاً: اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے متعین ہوگئی اور پھر ادائیگی میں ایک ماہ کی تاخیر کی بنیاد پر دو روپے نفع کا اضافہ ہو جائے گا اور اگر مشتری نے دو ماہ بعد قیمت ادا کی تو اب چار روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور تین ماہ کی تاخیر پر چھ روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح ہر تاخیر پر قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، لہٰذا بیع کی پہلی صورت شرعاً جائز اور حلال ہے اور دوسری صورت ربا میں داخل ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

دَین کی توثیق اور اس کی قسمیں

چونکہ بیع مؤجل میں بیع کے مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ دین ہو جاتا ہے اس لیے بائع کو مشتری سے اس دین پر کسی توثیق کا مطالبہ کرنا یا مقرر وقت پر دین ادا کرنے پر کسی گارنٹی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

رہن کا مطالبہ کرنا:

دین کی ادائیگی پر گارنٹی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک رہن رکھنا، دوسرے یہ کہ تیسرے شخص کا ضمانت دینا۔ پہلی صورت میں مشتری اپنی کوئی مملوکہ چیز بائع کے پاس بطورِ رہن رکھوائے اور بائع گارنٹی کے طور پر اس چیز کو اپنے پاس رکھ لے، لیکن اس شئی مرہون سے منتفع ہونا اس کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں اس لیے کہ اس شئی مرہون سے منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے،

البتہ وہ چیز بائع کے پاس اسی لیے رہے گی تاکہ مشتری اس رہن کے دباؤ کی وجہ سے وقتِ مقررہ پر دین ادا کرنے کا اہتمام کرے، لہٰذا اگر مشتری وقتِ مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو پھر بائع اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے گا، لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ لہٰذا اگر اس شئی مرہون کو بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوئی ہو کہ بائع نے اپنا دین وصول کر لیا اور پھر بھی رقم بچ گئی تو وہ بچی ہوئی رقم مشتری کو واپس لوٹانا ضروری ہے اور جس طرح مشتری کے لیے اپنی مملوکہ اشیاء کو رہن رکھوانا جائز ہے اسی طرح ان اشیاء کی صرف دستاویزات اور کاغذات کو بھی رہن رکھوانا جائز ہے۔

ذخیرہ اندوزی کا شرعی حکم:

ذخیرہ اندوزی کو عربی زبان میں ''احتکار'' کہتے ہیں، لغوی معنی، غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کر لینا کہ جب مہنگا ہو جائے گا فروخت کروں گا اور شرعاً ذخیرہ اندوزی کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان یا حیوان کی غذا ہو اس کو ایسے وقت میں ذخیرہ کر لینا جب شہر والوں کو اس کی ضرورت ہو، مقصد یہ ہے کہ بعد میں خوب زیادہ قیمت لے کر فروخت کروں گا، چونکہ اس سے لوگوں اور حیوانات کو تکلیف پہنچتی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے:

قوله عليه السلام : من احتكر فهو خاطي ...... اخرجه مسلم في باب تحريم الاحتكار . ١٢٢٧

یعنی جو شخص ذخیرہ اندوزی کرے وہ سخت گناہگار ہے اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کے لیے پیش کرنے والا ہے۔

اکثر فقہاء نے اس کو اگرچہ صرف انسانی وحیوانی غذاؤں کے ساتھ خاص فرمایا ہے کہ انہی کو ذخیرہ کر کے تکلیف پہنچانے والے کے لیے یہ گناہ ہے۔

لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا:

" كل ما اضر بالناس حبسه فهو احتكار . "

یعنی ہر وہ ضروریاتِ زندگی کی چیز جس کی ذخیرہ اندوزی سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو وہ احتکار کے حکم میں داخل ہے۔ علامہ صابونی فرماتے ہیں یہی قول مزاج شریعت کے زیادہ موافق معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان کو کسی بھی طریقہ سے تکلیف پہنچانا یہ انسانیت کے خلاف ہے۔

ذخیرہ اندوزی کا شرعی حکم یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی غذاؤں کی ذخیرہ اندوزی کرنا مکروہِ تحریمی ہے، بشرطیکہ اپنی زمین کا غلہ نہ ہو اور اس سے عام لوگوں کو ضرر پہنچتا ہو۔ (عطریہ هدایہ)

لہٰذا حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لیے ایسے نفع خوروں پر پابندی عائد کرے اور تاجر کو مال گودام سے نکال کر بازار میں فروخت کرنے کا حکم دے اور اگر حکم کے باوجود اس حرکت سے باز نہ آئے تو اس کو خاطر خواہ سزا دے اور اس کا ذخیرہ شدہ غلہ نکال کر بازار میں مناسب قیمت پر فروخت کرا دے البتہ حکومت کے لیے اس کے مال پر قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ فروخت کر کے قیمت اسی کو دے دی جائے۔ (فقه المعاملات للصابوني)

"قوله علیه السلام · من احتکر الطعام اربعین لیلة فقد بری من الله و بری الله منه .

(اخرجه ابن ماجه : صـ ۲۲۸ و الدارمی فی کتاب البیوع : ۲/۲٤۹)

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت:

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے استعمال کا حکم معلوم ہو جائے۔

اعضاء کی پیوندکاری کی چار صورتیں ہیں:

(1) کسی دوسرے انسان کا کوئی جز، آنکھ، دل، گردہ وغیرہ کی پیوندکاری کی جائے۔

(2) اپنے جسم کا گوشت یا کھال کے ایک حصہ کو لے کر دوسرے حصہ میں پیوند کر دیا جائے۔

(3) دوسرے انسان کا خون استعمال کیا جائے۔

(4) کسی جانور کی آنکھ وغیرہ کی پیوندکاری کی جائے۔

انسانی اعضاء کی پیوندکاری کی اکثر صورت جو آج کل ہسپتالوں میں پیش آرہی ہے اور جس کے لیے اپلیں کی جارہی ہیں، وہ یہ کہ جو انسان دنیا سے جارہا ہو، خواہ کسی عارضہ کے سبب یا کسی جرم میں قتل کیے جانے کی وجہ سے، اس سے اس بات کی اجازت لی جائے کہ مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو کسی دوسرے انسان میں لگا دیا جائے گا۔

اس صورت کو عام طور پر لوگ جائز مفید سمجھتے ہیں اور یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ یہ تو سارے

اعضاء فنا ہونے والے ہیں، ان میں سے کوئی عضو کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس سے بڑھ کر بہت سے لوگ اپنے اعضاء اپنی زندگی میں ہی فروخت کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ لاوارث مردوں کے اعضاء نکال لیتے ہیں، پھر اس کو فروخت کرتے ہیں۔

چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا محترم ہے، زندگی میں تو قابل احترام ہوتا ہی ہے لیکن مرنے کے بعد بھی اس کا احترام برقرار رہتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے پاس اس کا جسم اعضاء اور جوارح وہ اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہیں، لہٰذا اس کو اس بات کی اجازت نہیں کہ ان اعضاء کو تلف کردے نہ ہی ان کو فروخت کرنے کی اجازت ہے۔ اسی وجہ سے خودکشی کرنے کو حرام قرار دیا اور فرمایا کہ جو خودکشی کرے گا قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا، جب انسان اپنے اعضاء کا مالک ہی نہیں تو اعضاء کو نہ تو وہ فروخت کر سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے، نہ اس کی وصیت کر سکتا ہے اگر کوئی وصیت کر بھی دے تو یہ وصیت غیر ملک میں ہونے کی وجہ سے شرعاً باطل ہے اس پر عمل کرنا حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرے انسان کے اعضاء کی پیوند کاری نا جائز ہے اس مقصد کے لیے اعضاء کی خرید و فروخت بھی حرام ہے اور اس پر ملنے والے معاوضہ کا استعمال بھی حرام ہے۔

روي عن أبي امامة بن سهل بن حنيف أن النبي صلى الله عليه وسلم داوى وجهه يوم احد بعظم بال، فيه دليل جواز المداواة بعظم بال وهذا لإن العظم لا يتنجس بالموت على اصلنا لانه لا حياة فيه الا ان يكون عظم الانسان أو عظم الخنزير فإنه يكره التداوى به لان الخنزير نجس العين فعظمه نجس كلحمه لا يجوز الانتفاع به بحال والآدمى محترم بعد موته على ما كان عليه فى حياته فكما لا يجوز التداوى بشيء من الادمى الحى إكراماً له فكذلك لا يجوز التداوى بعظم الميت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كسر عظم الميت ككسر عظم الحى. (شرح السير الكبير: ١/٨٨)

الانتفاع باجزاء الادمى لم يجز قيل للنجاسة وقيل للكرامة هو

الصحیح كذا في جواهر الاخلاطی (عالمگيرية : ٥١/٣٥٤)

(2) اسی طرح دوسری صورت یعنی مریض کے اپنے کسی حصہ سے گوشت اتار کر دوسری جگہ چڑھانے کا معمول ہے یہ بھی ناجائز ہے۔

(3) کسی جانور کی آنکھ، دل، گردہ وغیرہ کی پیوند کاری اس شرط کے ساتھ جائز ہوگی کہ وہ کسی حلال جانور کا عضو ہو، مثلاً بکری، گائے وغیرہ اس مقصد کے لیے اعضاء کو خریدنا بھی جائز ہوگا۔

چنانچہ حنفیہ کے علاوہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تداوی کے لیے انسان کی ہڈی کی پیوندکاری کو ناجائز فرماتے ہیں:

> ونص : وإذا كسر للمرأة عظم فطار فلا يجوز إن ترفعه الا بعظم ما يؤكل لحمه ذكيا وكذلك إن سقطت سنه صارت ميتة فلا يجوز له أن يعيدها بعد ما بانت فلا يعيد سن شئ غيرسن ذكى يوكل لحمه وإن رفع عظمه بعظم ميتة أو ذكى لا يؤكل لحمه أو عظم إنسان فهو كالميتة فعليه قلعه وإعادة كل صلاة صلاها وهو عليه فإن لم يقلعه جبر السلطان على قلعه . (الام : ١/٥٤)

(4) خون انسان کا جز ہے اور جب نکال لیا جائے تو نجس بھی ہے، انسان کا جز ہونے کی حیثیت سے اس کی مثال عورت کے دودھ کی ہوگی جس کا استعمال علاج کے لیے فقہاء نے جائز لکھا ہے۔ (فتاوى عالمگيرية طبع مصر : ١١٢/٤)

جن صورتوں میں خون کا استعمال جائز ہے اس کے لیے خون دینا بھی جائز ہے، البتہ خون فروخت کرنا جائز نہیں اگر کوئی خون خریدنے پر مجبور ہو جائے تو اضطرار کی حالت میں خریدنا تو جائز ہے لیکن فروخت کرنے والے کے لیے اس رقم کا استعمال حرام ہے۔

الکحل کی تجارت کا حکم:

الکحل کی خرید وفروخت کا شرعاً کیا حکم ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس کے استعمال کا حکم جاننا ضروری ہے اس لیے پہلے اس کے استعمال کا حکم تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

وضاحت کے لیے اسپرٹ کی ہر قسم کا حکم الگ الگ لکھا جاتا ہے، جو حکم اسپرٹ کا بیان ہوگا

وہی الکحل کا ہوگا، پھر بتایا جائے گا کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اسپرٹ کس قسم کا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۱) قسم اوّل وہ اسپرٹ جو منقیٰ، انگور یا کھجور کی شراب سے بنایا گیا ہو۔ بالاتفاق ناپاک ہے، جس دواء میں یہ ملایا گیا ہو وہ بھی ناپاک اور اس کا پینا حرام، البتہ شدید اضطراری حالت میں ایسی دواء پینے کی رخصت ہے اور شدید اضطراری حالت یہ ہے کہ ماہر معالج کا ظن غالب یہ ہو کہ اس مریض کو کسی اور دواء سے شفاء نہ ہوگی تو ایسی صورت میں اس قسم کی اسپرٹ ملی ہوئی دواء پینے کی بقدرِ ضرورت گنجائش ہے۔

ففي النهاية عن الذخيرة الاستشفاء بالحرام يجوز اذ علم أن فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر. (البحر الرائق: ۱/۱۲۲)

(۲) قسم دوم وہ اسپرٹ جو مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ کسی اور چیز مثلاً: جو، آلو، شہد وغیرہ کی شراب سے بنائی گئی ہو تو اس کی طہارت وحرمت میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ وابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ پاک ہے اور اتنی مقدار پینا بھی حلال ہے کہ جس سے نشہ نہ ہو۔ (بشرطیکہ پینا بقصدِ لہو ولعب نہ ہو) اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نجاستِ خفیفہ ہے اور اس کی تھوڑی مقدار پینا بھی جائز نہیں، فتویٰ اگرچہ عام حالات میں امام محمدؒ کے قول پر دیا گیا ہے، مگر اسپرٹ میں چونکہ عموم بلویٰ ہے، لہٰذا جس دواء میں قسم دوم کی اسپرٹ یا الکحل ملا ہوا ہو اس کے بارے میں گنجائش ہے کہ امام اعظم وابو یوسفؒ کے قول پر عمل کر لیا جائے، اگرچہ تقویٰ اور احتیاط امام محمدؒ کے قول پر عمل کرنے میں ہے۔

(۳) قسم سوم وہ اسپرٹ جو کسی بھی شراب سے نہ بنائی گئی ہو بلکہ کسی اور پاک وحلال چیز مثلاً: منقیٰ، انگور، کھجور، آلو، جو، شہد وغیرہ سے بنائی گئی ہو، یہ بالاتفاق سب کے نزدیک پاک ہے اور جس دواء میں یہ ملائی گئی ہو وہ بھی پاک اور حلال ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل اس وقت ہے جبکہ معلوم ہو کہ اسپرٹ کس قسم کا ہے اور اگر معلوم نہ ہو کہ یہ کس قسم کا ہے تو چونکہ ناپاک ہونے کا ظن غالب نہیں، بلکہ محض شبہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ قسم اوّل سے ہو تو محض اس شبہ کی بناء پر اس کی نجاست یا حرمت کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ لہٰذا جس دواء میں ایسی اسپرٹ یا الکحل ہو جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ مذکور تین قسموں میں سے کس قسم سے ہے تو ایسا دواء کے کھانے اور پینے کی گنجائش ہے اور جس کپڑے کو ایسی دواء یا اسپرٹ لگ جائے اسے

ناپاک نہ کہا جائے گا، دھوئے بغیر نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی۔ البتہ جو شخص ایسی اسپرٹ سے بھی اجتناب کرنے پر قادر ہو تو جس حد تک اجتناب کرے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الکحل کی قسم معلوم ہوگی یا نامعلوم، اگر معلوم ہو تو وہ قسم استعمال کرے جس کو پاک اور حلال لکھا گیا ہے، جبکہ قسم اوّل مہنگی اور دوم وسوم ارزاں ہوتی ہے اور اگر قسم معلوم نہیں تو دواء استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور جس کپڑے اور بدن کو لگ جائے اس کو ناپاک نہیں کہیں گے دھوئے بغیر نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی۔ (ماخوذ از رجسٹر نقل فتاویٰ دار العلوم کراچی)

اب الکحل کی خرید وفروخت کا حکم یہ ہے کہ جن صورتوں کو پاک لکھا گیا ہے اور استعمال کی گنجائش دی گئی ہے ان صورتوں میں خرید وفروخت بھی جائز ہوگی، اس کی تجارت بھی حلال ہوگی اور جن صورتوں کو ناپاک لکھا گیا ہے ان کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہوگی۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله : الشراب لغة كل ماء يشرب واصطلاحا ما يسكر والمحرم منها اربعة ...... وصح بيع غير الخمر.

قال ابن عابدين رحمه الله : (تحت قوله صح بيع غير الخمر) اي عنده خلاف لهما في البيع والضمان لكن الفتوىٰ على قوله في البيع.

(ردالمحتار : ٦/ ٤٥٤ كتاب الاشربة)

انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کا حکم:

آج کل حکومت نے انعامی بانڈز کے نام سے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے جو مختلف مالیت کا ہوتا ہے اور اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بانڈز حاصل کرنے کے بعد ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے قرعہ اندازی میں جو نمبر نکلتے ہیں ان کے حاملین کو زیادہ رقم دی جاتی ہے، باقی تمام ممبران کو صرف اپنی جمع شدہ رقم واپس لینے کا حق ہوتا ہے۔

شرعاً یہ کاروبار دو وجہوں سے ناجائز ہے:

1- جن کو انعام کے نام سے رقم ملتی ہے وہ سود ہے اور سود حرام ہے۔

2- ہر ممبر کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ مجھے زیادہ رقم ملے اور حقیقت میں ہر ممبر کو نہیں ملتی بلکہ صرف ان ممبران کو ملتی ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے، لہٰذا یہ قمار کی صورت ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سود اور قمار کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں نص قرآن کی رو سے ناجائز اور حرام ہیں، لہٰذا انعامی بانڈز کی خرید و فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

اگر کسی نے خرید لیا تو اس کو واپس کر کے اصل رقم واپس لینا جائز ہے اور اگر کسی کے نام قرعہ نکل آیا اور اس کو اصل رقم سے زائد رقم انعام کے نام سے ملی تو اس زائد رقم کا استعمال جائز نہیں بلکہ بدونِ نیت ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

لما قال الله تعالیٰ : ﴿إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطن فاجتنبوه﴾ (سورة المائدة : ٩٠)

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم نجات پاؤ۔

کچی فصل خریدنا پکنے کی شرط لگا کر:

بہت سے لوگ گندم، جو، مکئی، چاول وغیرہ کی فصلوں کو اس شرط پر خریدتے ہیں کہ فصل پکنے تک زمین میں رہے گی، اس شرط کے ساتھ خرید و فروخت ناجائز ہے کیونکہ یہ شرطِ فاسد ہے البتہ فقہاء نے جواز کی ایک صورت ذکر کی ہے کہ کھیتی میں فصل لگنے کے بعد فصل کو مستقل طور پر خرید لیا جائے اور پھر زمین کو معمولی اجرت پر خاص وقت تک کے لیے کرایہ پر لے لیا جائے پھر اس مدت کے اندر فصل کاٹ لی جائے، اس طرح یہ صورت جائز ہو جائے گی۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله : ولو اراد ان يترك فی الأرض ويكون له الولاية الشرعية فالحيلة أن يشتري الحشيش واشجار الطبخ ببعض الثمن ويستاجر الأرض ببعض الثمن من صاحب الارض اياما معلوما.

(خلاصة الفتاوىٰ : ٣/٢٩ كتاب البيوع، فتاوىٰ حقانية : ٦/٦٢)

دودھ والے جانور کا دودھ روک کر فروخت کرنے کا حکم:

جانوروں کا دودھ دو تین دفعہ روک کر جانور فروخت کیا جاتا ہے تا کہ لوگ زیادہ دودھ والا سمجھ کر زیادہ قیمت میں خرید لیں۔ اس طرح خریدار کو دھوکہ دے کر فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے:

روي البخاري و مسلم عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : "من اشترى شاة مصراةً، فهو بالخيار ثلاثة ايام، إن شاء امسكها، وإن شاء ردها، وردمعها صاعاً من تمر ."

(أخرجه البخاري رقم : ٢١٤٨ ، مسلم رقم : ١٥٢٤ واللفظ له)

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے مشتری کو خیارِ عیب کے ذریعہ واپس کرنے کا حق دیتے ہیں، ساتھ ساتھ جو دودھ دھولیا اس کے عوض ایک صاع کھجور دینے کا بھی حکم دیتے ہیں، البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں مشتری اگر اس جانور کو واپس کرنا چاہے تو دودھ کی قیمت بھی واپس کرنا ہوگی۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہ اللہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ اس طرح دھوکہ دے کر فروخت کرنا اگرچہ ناجائز اور گناہ ہے تاہم اگر کسی نے خرید لیا تو بعد میں معلوم ہونے پر واپس کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

كما فى تكملة فتح الملهم : والا ردها وردمعها صاع من تمر اخذ بظاهر الحديث الائمه الثلاثة وأبى يوسف وابن ابى ليلى والجمهور فقالوا : التصرية عيب يرد به المبيع وهذا القدر متفق عليه عندهم . ثم اختلفوا فى تفاصيله فقال الشافعي رحمه الله : يجب رد صاع من تمر بدل اللبن المحلوب، قل اللبن أو كثر، ولا يجوز اداء غير التمر قال بعض المالكية يجب صاع من غالب قوة البلد وقال أبى يوسف يجب قيمة اللبن بالغة ما بلغت وخالفهم أبى حنيفة و محمد رحمهما الله تعالىٰ، فقالا : التصرية ليست بعيب يجوز الرد به، وإنما يجوز للمشتري أن يرجع بنقصان قيمة المبيع ولا خيار له فى الرد الخ .

(تكملة فتح الملهم لشيخ محمد تقى العثماني : ١/ ٣٤٠)

اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد شرعی فیصلہ نہیں بلکہ بطورِ صلح کے آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔

(امداد الفتاویٰ کتاب البیوع جلد ثالث)

البتہ اگر خریدار کو واضح طور پر بتادیا جائے کہ آج کل کے عرف کے مطابق دو تین دن سے اس کا دودھ روکا ہوا ہے، نکالا نہیں گیا اس کے باوجود اگر خریدار لینے پر راضی ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ اب اس میں دھوکہ نہیں رہا۔

مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا:

مسجد کی آمدنی اور فنڈ دراصل مسجد کی ضروریات پورا کرنے کے ملیے ہوتے ہیں لیکن اگر فنڈ مسجد کی ضروریات سے فی الحال زائد ہو تو اس رقم کو کسی قابل نفع تجارت میں لگا کر اس سے حاصل ہونے والے نفع کو مسجد ہی کے فنڈ میں جمع کروائے تو شرعاً ایسی تجارت کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ چندہ دہندگان کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً اجازت ہو۔

لما قال فی الهندية : متولی المسجد إذا اشتریٰ بمال المسجد حانوتا أو دارً ثم باعها جاز إذا كانت له ولاية الشراء .

(الهندية : ٤١٧/٢ الباب الخامس فی ولاية الوقف و تصرف القيم)

(فتاویٰ حقانية : ٣٤/١١)

پتنگ سازی کا حکم:

بعض شہروں میں پتنگ اڑانے کا بہت رواج ہو گیا ہے اس لیے لوگوں نے پتنگ سازی کو مستقل پیشہ کے طور پر اختیار کرلیا ہے، شرعاً پتنگ سازی کا کیا حکم ہے؟ اس کو بطور پیشہ اختیار کرنے اور اس کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟ اس حکم کا مدار پتنگ بازی کے حکم پر ہے۔

مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر فقہاء نے پتنگ اڑانے کو ناجائز فرمایا ہے:

(۱) کبوتر اڑانے اور کبوتر کے پیچھے بھاگنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے شیطان کا بھائی فرمایا ہے:

عن أبی هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رای رجلا يتبع حمامة فقال شيطان يتبع شيطانة .

(أبو داؤد : ١٩٤/٢)

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو کبوتر کے پیچھے بھاگتا ہوا دیکھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

کہ شیطان ہے شیطانہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے، کبوتر بازی میں انہماک کی وجہ سے امورِ دینیہ و دنیویہ سے غفلت کا مفسدہ پتنگ بازی میں بھی پایا جاتا ہے، لہٰذا اس وعید میں یہ بھی شامل ہے۔

(۲) پتنگ بازی کی وجہ سے پتنگ باز مسجد کی جماعت بلکہ خود نماز ہی سے غافل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جوئے اور شراب کے حرام ہونے کی یہی وجہ بیان فرمائی ہے:

﴿ و یصدکم عن ذکر اللّٰہ و عن الصلوٰۃ ﴾

(۳) پتنگ اکثر مکانوں کی چھت پر کھڑے ہو کر اڑائی جاتی ہے جس سے آس پاس والے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہے۔

(٤) بعض اوقات پتنگ اڑاتے ہوئے پیچھے کو ہٹتے ہیں اور نیچے گر جاتے ہیں اس میں اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی چھت پر سونے سے منع فرمایا جس میں منڈیر نہ ہو۔

(٥) اسی طرح اس کی ڈوری سے آئے دن لوگوں کا زخمی ہونا، گلے کٹ کر ہلاک ہونا یہ تو روز کا معمول بن گیا ہے ایسی افسوناک خبریں اور واقعات اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

کسی انسان کو ناحق قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے اگر چہ بلا ارادہ ہی ہو بلکہ حدیث میں آیا ہے کسی ایک انسان کو ناحق قتل کرنا تمام انسانوں کو قتل کرنے کے برابر گناہ ہے۔

(٦) اس میں مال کو بے جا خرچ کرنا ہے، جبکہ بے جا مال خرچ کرنا اسراف ہے اور اسراف حرام ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے:

﴿ إن المبذرين كانوا إخوان الشيطين ﴾

لہٰذا شرعاً پتنگ اڑانا ناجائز ہے، اگر اس کے ساتھ ہار جیت بھی شامل ہو تو قمار کی وجہ سے حرام ہے، بلکہ خطرۂ کفر ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۸/۱۷٦ مع تغییر یسیر)

جب شرعاً پتنگ اڑانا ناجائز بلکہ حرام ٹھہرا تو پتنگ سازی میں اس حرام کام کے لیے معاون بننا ہے تو جس طرح دوسرے آلاتِ معصیت کی تجارت مکروہِ تحریمی ہے پتنگ کی تجارت بھی مکروہِ تحریمی ہوگی اس لیے اجتناب لازم ہے، اس سے حاصل ہونے والی آمدن کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا۔

کھیل کود کے سامان کی خرید وفروخت:

کھیل کود کے سامان کی خرید وفروخت کا حکم خود کھیل کود کے حکم پر موقوف ہے، ایسی کھیل کود جس کی وجہ سے آخرت سے غفلت ہو یہ شرعاً مذموم اور ممنوع ہے:

لقوله عليه السلام : " كل شئ يلهو به الرجل باطل الا رميه بقوسه و تأديبه فرسه و ملاعبته امرأته فانهن من الحق رواه الترمذى .

(المشكوٰة : ٢/٣٣٧)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی جو کھیل بھی اختیار کرتا ہے وہ باطل ہے مگر تین قسم کے کھیل:

1- تیراندازی
2- اپنے گھوڑے کو سدھانا
3- اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت، کیونکہ یہ شرعاً مطلوب ہے۔

عن سعيد بن جبير رضى الله عنه إن قريبا لعبد الله بن مغفل رضى الله عنه خذف فنهاه وقال إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الخذف وقال انها لا تصيد صيد او لا تنكاء عدوا ولكنها تكسر السن و تفقاء العين قال فعاد فقال احدثك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنه ثم تخذف لا اكلمك ابدا .

(صحيح مسلم : ٢/١٥٢)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک پڑوسی نے کنکر پھینکا تو عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکر پھینکنے سے منع فرمایا اور فرمایا اس سے نہ شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دشمن پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ یہ دانت توڑتا ہے اور آنکھ پھوڑتا ہے، راوی کہتے ہیں کہ اس نے دوبارہ کنکر پھینکا اس پر حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میں تمہیں حدیث سنا رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور تم پھر بھی کنکر مارے جا رہے ہو۔ (حدیث کی بے ادبی کی وجہ سے) اب میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔

البتہ ایسا کھیل جس میں ورزش ہو، یہ صحت اور دینی و دینوی امور میں معین ہونے کی وجہ سے فی نفسہ جائز بلکہ کسی قدر ضروری ہے مگر اس کے لیے یہ شرائط ہیں:

1- کھیل کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جس سے گرد و نواح میں کسی قسم کی جانی یا مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

2- خود کھیلنے والے کو یا اس کے ساتھ شرکاء میں سے کسی کو کسی قسم کے جسمانی یا مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

3- نمازوں کے اوقات میں نہ ہو، یعنی نماز کے نظام میں کوئی خلل نہ آئے۔

4- دوران کھیل ستر کھلا ہوا نہ ہو۔

5- گالم گلوچ نہ ہو۔

6- کوئی ایسا مقابلہ نہ ہو کہ ہار جیت کی صورت میں مال دینے کی شرط ہو۔

7- اس میں ایسا انہماک نہ ہو کہ اس کو مستقل پیشہ کے طور پر اختیار کر لے کہ اس کو پھر کھلاڑی کے نام سے یاد کیا جانے لگے اور پہچانا جانے لگے۔

8- اس میں ورزش کا مفہوم ہی غالب ہو، لہو ولعب اور تماشہ کا پہلو غالب نہ ہو۔

9- وہ محض وقت گزاری کا مشغلہ نہ ہو، جیسے تاش، لڈو، شطرنج، کیرم بورڈ، ڈبو، اٹھارہ گوٹی، نو گوٹی، اڈہ کھڈہ، چوسر، چوپڑ وغیرہ اور اس جیسے سب کھیل شرعاً ناجائز ہیں۔

اب مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق جو کھیل ورزش کے حکم میں داخل ہو کر جائز ہے، اس کے سامان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

اور جو کھیل شرعی حدود کی خلاف ورزی کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اس کے سامان کی خرید و فروخت تعاون علی الاثم کی وجہ سے ناجائز ہے، ایسے کاروبار سے احتراز کرنا لازم ہے۔

اس زمانے میں مروجہ کھیل، فٹبال، کرکٹ، ہاکی وغیرہ جن کو قومی کھیل سمجھا جاتا ہے، ان میں عموماً شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کی جاتی، ستر ڈھانپنے کا اہتمام نہیں ہوتا، اس میں موسیقی، ڈانس وغیرہ کا بھی ساتھ اہتمام ہوتا ہے، بعض اوقات اس میں جوا بھی کھیلا جاتا ہے، نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا، اس لیے اس طرح کے کھیل میں شرکت کرنا یا ان لوگوں کو سامان تیار کر کے دینا دونوں ناجائز ہیں ایسے لوگوں کو کھیل کا سامان فروخت کرنا اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا

استعمال بھی ناجائز ہے۔

سمگلنگ کا شرعی حکم:

سمگلنگ کے معاملہ کی حقیقت یہی ہے کہ باہر ممالک سے مال لے کر آنا یا باہر ممالک مال لے کر جانا حلال مال ہو شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے، اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، مثلاً: اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، رشوت دینی پڑتی ہے، جان مال یا عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، جس کی حفاظت کا شریعت میں بڑا خیال رکھا گیا ہے اور بسا اوقات جسمانی تکلیف اور قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے، اس لیے حکومت کے قانون کی پابندی کرنی چاہیے اور ایسے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہیے تاہم اسمگل ہو کر آنے والی حلال و مباح چیزوں کی خرید و فروخت جائز ہے اور ان کو اپنے استعمال میں لانا درست ہے اور آمدنی بھی حلال ہے۔

قرآن کریم کی خرید و فروخت:

قرآن کریم کی خرید و فروخت کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، معظم و مکرم ہے، خرید و فروخت میں ایک گونہ توہین ہے اس لیے خرید و فروخت مکروہ ہے، اس کی بجائے مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کریم وقف کریں، ہدیہ دیں۔

(انظر کتاب المغنی لابن قدامہ : ٦/٣٦٧)

لیکن جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ کلام اللہ کی خرید و فروخت نہیں بلکہ مجلد اوراق کی خرید و فروخت ہے جن میں کلام اللہ لکھا گیا ہے، لہٰذا تفسیر، حدیث و فقہ کی کتابوں کی طرح قرآن کریم کی خرید و فروخت بھی جائز ہے آمدن حلال ہے۔

کافروں کے ہاتھ قرآن کریم کی فروخت:

کافروں کے ہاتھ قرآن کریم فروخت کرنے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی بے حرمتی کرے گا اہانت و تحقیر سے کام لے گا یا اس کے آداب کا خیال نہیں رکھے گا کہ پاکی و ناپاکی ہر حالت میں اس کو ہاتھ لگائے گا، تو ایسی صورت میں ان کو قرآن کریم عطیہ دینا یا فروخت کرنا، دونوں جائز نہیں بلکہ گناہ ہے اور حرام ہے۔ لیکن اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو ان کے ہاتھ فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، نیز تبلیغ کی غرض سے ہدیہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

كما روي " نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن المسافرة بالقرآن الى ارض العدو مخافة أن تناله أيديهم .

(الحديث أخرجه ابو داود في سننه ٢ / ٣٥،

باب النهي عن ان يسافر بالقرآن الى ارض العدو)

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کی خرید وفروخت کا حکم:

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کا استعمال جائز امور میں ممکن ہے اور لوگ جائز امور کے لیے استعمال کرتے بھی ہیں، مثلاً: خبریں سننا، تلاوت اور وعظ ونصیحت سننے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے ان مقاصد کے لیے خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں تاہم ایسے لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا جن کے متعلق یقین ہو کہ یہ محض ناجائز کام میں استعمال کریں گے، مثلاً: گانا وغیرہ سننے کے لیے ہی استعمال کریں گے یہ چونکہ گناہ کے کام میں تعاون ہے اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم:

اس وقت شیئرز کا کاروبار عروج پر ہے، شرعی اعتبار سے اس کاروبار کی کیا حیثیت ہے؟ مطلقاً جائز ہے یا کچھ قیود اور شرائط ہیں، نیز اسٹاک ایکسچینج میں دلال یعنی بروکر کی حیثیت سے کام کرنے کا کیا حکم ہے؟ دونوں مسئلوں کو تفصیل سے لکھا جاتا ہے:

شیئرز کا کاروبار:

شیئرز کے کاروبار کا حکم:

(1) جس کمپنی کا اصل کاروبار حرام ہو، مثلاً: سودی بینک، انشورنس کمپنی یا شراب کی خرید وفروخت جیسا حرام کاروبار کرنے والی کمپنی، ان کا حکم یہ ہے کہ اس کے شیئرز خریدنا حرام ہے، البتہ اگر کمپنی کا اصل کاروبار تو حلال ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر سودی لین دین بھی کرتی ہے، مثلاً: بینک میں پیسہ رکھ کر سود حاصل کرتی ہے اور اسے حلال نفع میں شامل کرتی ہے۔ (آج کل شاید ہی کوئی کمپنی اس سے محفوظ ہو) تو ایسی کمپنی نے ابتداء جو شیئرز جاری کیے انہیں دو شرطوں سے خریدنا جائز ہے:

1- شیئرز خرید کر اس کمپنی کا حصہ دار (شیئر ہولڈر) چونکہ اس سودی معاملے میں کمپنی کا معاون و مددگار بن رہا ہے اور اس کا پیسہ بھی اس گناہ میں استعمال ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر واجب

ہے کہ اپنی استطاعت کے بقدر اس کمپنی کے شرکاء کے سالانہ اجلاس میں سود کے خلاف آواز ضرور اٹھائے یا کم از کم ہر مرتبہ کے اجلاس میں ایک بار اس بات کا اظہار ضرور کرے کہ وہ اس سودی معاملے پر راضی نہیں یا ای میل کے ذریعے سے کمپنی کو خط لکھا کرے کہ کمپنی سودی لین دین یکسر ختم کردے۔ اگر چہ اس کی اس رائے اور آواز پر کان نہ دھرا جائے مگر یہ اپنا فرض ادا کرتا رہے۔

2- شیئر ہولڈر کمپنی کی ویب سائٹ پر انکم اسٹیٹمنٹ کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کمپنی نے کل نفع میں سے کتنے فی صد نفع سود کی مد میں حاصل کیا ہے؟ چنانچہ شیئر ہولڈر نفع وصول کرنے کے بعد اپنے حصے کے تناسب سے اپنے نفع میں سے سودی نفع کے بقدر رقم فقراء پر بلانیتِ ثواب صدقہ کردے، اگر سودی نفع کی مقدار کے بارے میں تحقیق وجستجو کے باوجود بھی علم نہ ہوسکے تو اندازے سے رائے قائم کرے اور جتنی مقدار کا گمان غالب ہو، وہ صدقہ کرے۔

یہ شرائط تو اس شخص کے بارے میں تھیں جو کمپنی کی طرف سے جاری کردہ شیئرز اس سے براہِ راست لے کر گھر بیٹھے نفع حاصل کرنا چاہتا ہو، البتہ جب کمپنی نے ایک مرتبہ تمام شیئرز جاری کر دیے اور اب کوئی شخص ان کی خرید وفروخت کے ذریعے نفع کمانا چاہتا ہے تو اس کاروبار کے جواز کے لیے مزید تین شرطیں ہیں:

1- کمپنی نے شیئرز کے ذریعے حاصل ہونے والی رقم سے کچھ خام مال یا عمارت وغیرہ خرید لی ہو، یعنی کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے وجود میں آچکے ہوں، کل اثاثے محض نقد (کرنسی) کی صورت میں نہ ہوں، بصورتِ دیگر شیئرز کی اصل قیمت پر خرید وفروخت تو جائز ہوگی، کمی بیشی پر نہیں، نیز شیئرز کی قیمت پر قبضہ بھی اسی مجلس میں ضروری ہوگا، ادھار پر معاملہ جائز نہ ہوگا۔

2- شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ ہو چکا ہو، یا کسی بھی طرح یقینی طور پر شیئر ہولڈر کی بقدر حصص ملکیت کمپنی میں ثابت ہو چکی ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ کمپنی کو اگر بالفرض نقصان ہو تو اس نقصان کا ضمان قانوناً شیئر ہولڈر پر بھی آتا ہو، چنانچہ شیئرز پر حقیقۃً قبضہ کے بغیر یا یقینی طور پر ملکیت ثابت ہوئے بغیر انہیں آگے بیچنا جائز نہیں۔

بعض حضرات کا شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق پورے معاملے میں درحقیقت خریدنا اور بیچنا بالکل مقصود ہی نہیں ہوتا، ان کے پیش نظر سرٹیفکیٹ وصول کرنا ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی یہ حضرات

سٹرفکیٹ وصول کرتے ہیں، بلکہ محض زبانی کلامی اس پوری کارروائی سے مقصد انتہاء اور نتیجہ کے اعتبار سے فرق برابر کرنا ہوتا ہے تو یہ صورت بھی جوا اور سٹہ بازی ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

3- سپاٹ سیل کرے، شارٹ سیل، فارورڈ اور فیوچر سیل اور ہیجنگ (جن کی تفصیل نمبر 2 میں آرہی ہے) جائز نہیں۔

بروکر (دلال کا حکم)

(2) اسٹاک ایکسچینج میں بحیثیتِ دلال کام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا مدار ان معاملات پر ہے جو ایک دلال انجام دیتا ہے، چنانچہ ہماری معلومات کے مطابق ایک بروکر بحیثیت دلال شیئرز کی خرید و فروخت سے متعلق کاروبار میں شیئرز بیچنے والوں اور خریدار حصص کے درمیان پانچ طرح سے رابطے کا کام دیتا ہے:

1- حاضر سودا (Spot Sale):

یہ خرید و فروخت کی دلالی کا عام اور سادہ طریقہ ہے دلال اپنے تعلقات اور معلومات کی بناء پر کسی شخص سے شیئرز کی قیمت وصول کر کے یا اس وصولی کے لیے آئندہ کوئی تاریخ معین کر کے اس کے لیے کسی شیئر ہولڈر سے شیئرز خرید کر اس کے حوالے کرتا ہے اور اس دلالی پر اس شخص سے متعین معاوضہ (کمیشن) وصول کرتا ہے۔

2- بعض اوقات خریدار کے پاس رقم نہیں ہوتی تو دلال کمیشن کے حصول کے لیے اس کی طرف سے شیئرز کی قیمت کا کل یا بعض حصہ ادا کر کے اس کے لیے شیئرز خرید کر اس کے حوالے کر دیتا ہے، پھر کچھ دنوں تو خریدار کو قیمت کی ادائیگی کی مہلت بلا سود ہوتی ہے، اس کے بعد دلال اس سے سود وصول کرتا ہے، اسے اصطلاح میں (Sale on Margin) کہتے ہیں۔

3- بیع غیر مملوک (Short Sale)

دلال خریدار کو کمیشن کے لالچ میں ایسے شیئرز فروخت کر دیتا ہے جنہیں اس نے خود بھی ابھی تک نہیں خریدا، محض اس توقع یا یقین پر کہ بعد میں خرید لوں گا۔

4- دلال اور خریدار کے درمیان خرید و فروخت سے متعلق معاملے کی نسبت مستقبل یعنی آئندہ آنے والی کسی مقررہ تاریخ کی طرف ہوتی ہے، یعنی دونوں کے درمیان خرید و فروخت کا

معاملہ تو طے ہو گیا مگر اس مقررہ تاریخ سے قبل سودا وجود پذیر نہیں سمجھا جائے گا۔ اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں اسے (Forward Sale) (البیع المضاف إلی المستقبل) کہتے ہیں۔

5- دونوں کے درمیان نمبر 4 کی طرح خرید و فروخت سے متعلق معاہدے کی نسبت مستقبل کی طرف ہوتی ہے، مگر مقررہ تاریخ پر قبضہ مقصود ہی نہیں ہوتا، مقررہ تاریخ آنے پر دونوں نفع و نقصان کا فرق برابر کر لیتے ہیں، مثلاً: شیئرز کی قیمت مقررہ تاریخ پر اگر بڑھ گئی تو دلال خریدار کو شیئرز کی بجائے زائد رقم دے گا اور اگر قیمت گھٹ گئی تو اتنی رقم اس سے لے گا، اس معاملے کو اصطلاح میں (Future Sale) سٹہ کہتے ہیں۔

ان تمام صورتوں میں صرف پہلی صورت جائز ہے، بقیہ چاروں صورتیں بیع فاسد، جوا (سٹہ) یا سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں، لہٰذا اسٹاک ایکسچینج میں اگر کوئی شخص بروکر کی حیثیت سے کام کر کے خود کو ان معاملات کا مرتکب ہونے سے بچا سکتا ہے جو ناجائز اور حرام ہیں تو اس کے لیے اس ادارے میں ملازمت جائز ہے اور اگر ممکن نہیں تو حصص کی دلالی کا کام نہ کرے اور خود کو حرام میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

(ماخوذ از رجسٹر نقل فتاویٰ دارالافتاء و الارشاد ناظم آباد کراچی : ۴۳ / ۶۱۰)

سرکاری طور پر نرخ کنٹرول کرنے کا حکم:

بسا اوقات کسی چیز کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے، ایسے وقت میں حکومت قیمت کی ایک حد مقرر کر کے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا دیتی ہے جس کو ''نرخ کنٹرول'' کہا جاتا ہے، عربی میں ''تسعیر'' کہا جاتا ہے کیا حکومت کے لیے اس قسم کی پابندی لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ شریعت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی چیز کی خرید و فروخت کو بائع و مشتری کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے، خواہ وہ قیمت زیادہ ہو یا کم، بعض چیزوں کی کوالٹی میں تفاوت کی وجہ سے بھی قیمتوں میں تفاوت آجاتا ہے اس لیے شرعاً حکومت کو پابندی لگانے کا حق نہیں۔

کما روي اصحاب السنن عن أنس رضي الله عنه قال: قال بعض الناس یا رسول الله! غلا السعر فسعر لنا، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إن الله هو المسعر، القابض، الباسط الرزاق، إني لارجو الله . ولیس احد منکم یطالبني بمظلمة في دم ومال .

(أخرجه ابو داؤد : ٢/٢٤٤، ترمذی : ٦/٥٢)

لیکن بعض حالات میں تاجر لوگ اشیاءِ ضروریہ کی قیمت میں بے تحاشہ اضافہ کر کے عوام کو پریشان کرتے ہیں بلکہ اب تو نفع خوری کی ہوس نے ماحول ایسا بنا دیا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد باقاعدہ عوام کو لوٹنے کا منصوبہ بنالیا جاتا ہے اور اچانک ہوش ربا اضافہ کر دیا جاتا ہے ایک عام آدمی کے لیے مارکیٹ تک رسائی حاصل کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے تو اس صورتِ حال میں حکومت کو تو شرعاً اس کی اجازت ہے کہ وہ معاشیات اور اقتصادیات کے ماہرین اور سمجھدار دیندار تاجروں کے مشورے سے اشیاءضروریہ کی قیمتوں کا تعین کر کے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا سکتی ہے تاکہ عوام الناس پریشان نہ ہوں۔

قال : في الهداية : ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس، فإن كان أرباب الطعام يتحكمون ويتعدون في القيمة تعديا فاحشا، وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين الا بالتسعير، فحينئذٍ لا بأس به، بمشورة من أهل الرأى والبصر." (هداية كتاب البيوع)

گمراہ کن کتابوں کے کاروبار کا حکم:

ایسی کتب جو شرک و بدعت، خلافِ شرع رسم ورواج یا اہل باطل کے عقائد اور گمراہ کن نظریات پر مشتمل ہوں، ان کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے۔

اسی طرح فحش ناول، ڈائجسٹ اور جرائم پیشہ افراد کے حالات پر مشتمل کتابیں انجیل اور تورات کے موجودہ نسخے اسی طرح بڑی بڑی فحش تصاویر والے رسائل وغیرہ اسی طرح فلم اور گانے کے متعلق رسائل اور اخبارات وغیرہ ان سب کی اشاعت اور خرید وفروخت ترسیل وغیرہ، یہ گناہ کے کام میں اعانت کی وجہ سے ناجائز ہیں، ایسی تجارت سے پرہیز کرنا چاہیے اس کو چھوڑ کر حلال اور پاکیزہ کاروبار اختیار کرنا چاہیے۔

لما قال العلامة محمود آلوسی : واستدل بعضهم على القول بأن لهو الحديث الكتب التى اشترى ها النضر بن الحارث على حرمة مطالعة التواريخ الفرس القديمة وسماع ما فيها وقرأته وفيه بحث ولا يخفى ان فيها من الكذب ما فيها فالاشتغال بها لغير غرض دينی

خوض فی الباطل . (روح المعانی ۷/۷۹، سورۃ المائدۃ)

طوطوں کا کاروبار:

اس دور میں ملکی اور بین الاقوامی طور پر طوطوں کا کاروبار بھی عروج پر ہے بعض لوگوں کو اس کے جواز پر شبہہ ہوتا ہے کہ ایک پرندے کو پنجرے میں بند کر کے حبس میں رکھا جاتا ہے یہ ظلم ہے لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر پرندہ بند کر کے اس کی خوراک اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، طوطے پالنے والوں کے بارے میں مشاہدہ ہے وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں لہٰذا یہ کاروبار جائز ہے۔ (عالمگیریۃ)

گاڑیوں کی خرید وفروخت میں خلافِ شرع شرط لگانا:

آج کل گاڑیوں کی خرید وفروخت میں ایک طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ مثلاً: دو لاکھ کی ٹیکسی خرید کر آگے ڈھائی لاکھ میں قسطوں پر فروخت کردی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ بقیہ رقم گاڑی پر ہے گاڑی چلتی رہے گی اور قسطیں بھی ادا ہوتی رہیں گی، لیکن قسط مکمل ہونے سے پہلے اگر گاڑی کسی حادثہ کا شکار ہوگئی، جل گئی یا چوری ہوگئی اس صورت میں بقیہ قسطیں ساقط ہوجائیں گی یعنی بائع کو خریدار سے بقیہ رقم کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا، یہ شرط خلاف شرع ہے جس کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوگی شرعاً دونوں پر لازم ہے کہ اس معاملے کو ختم کر کے اَز سرِ نو اس شرط کے بغیر عقد کریں، اگر ایسا نہیں کیا اور یہ عقد فاسد برقرار رہا تو اب ایسی صورت میں اگر قسطیں مکمل ہونے سے پہلے گاڑی کو کوئی حادثہ لاحق ہوگیا تو خریدار پر شرعاً واجب ہے کہ پوری قیمت ادا کرے، ہاں البتہ بائع خریدار پر رحم کھا کر کچھ رقم معاف کردے یہ بھی شرعاً درست ہے لیکن لازم نہیں۔

گاڑی کے حصے خریدنے کا ایک سودی طریقہ:

ایک شخص کو رقم کی ضرورت ہے وہ اپنے رکشہ کا ایک حصہ مثلاً: دوسرے کو 30000 ہزار میں فروخت کرتا ہے اور رقم وصول کر لیتا ہے پھر دوبارہ اسی وقت اس سے یہ حصہ 40000 ہزار میں قسطوں میں خرید لیتا ہے اس طرح وہ تیس ہزار روپے اور گاڑی لے کر چلا جاتا ہے، شرعاً یہ خرید وفروخت نہیں ہے بلکہ سود دینے اور لینے کا ایک حیلہ ہے، لہٰذا ناجائز اور حرام ہے اور تیس ہزار پر دس ہزار جو نفع کے نام سے سود دینے کا معاہدہ ہوا اس کا بھی لینا اور دینا دونوں حرام ہیں دوسرے شخص کے لیے اس کا استعمال بھی حرام ہے۔

" نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع ما لم يضمن ."

بری اور بحری جانوروں کی خرید وفروخت:

آج کل کیکڑا اور کچھوا وغیرہ بکثرت ایکسپورٹ ہو رہے ہیں اور مختلف طریقوں اور صورتوں میں ان کو استعمال کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے ان کی خرید وفروخت عام ہوگئی ہے ان کی خرید و فروخت جائز ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تفصیلی اور تحقیقی جواب ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

تمام بری اور بحری جانوروں کی کل دو قسمیں ہیں: حلال اور حرام اور خرید وفروخت کے اعتبار سے ان دونوں کی کئی قسمیں متصور ہوسکتی ہیں، تفصیل درج ذیل ہے: مثلاً:

بری حلال جانور:

1- زندہ

2- مذبوح (اسلامی طریقہ کے مطابق ذبح کیا ہوا)

3- میتۃ (ٹڈی کے علاوہ، کیونکہ یہ مری ہوئی بھی حلال ہے)

بری حرام جانور:

1- زندہ

2- مذبوح

3- میتۃ (خون والا جیسے ہاتھی اور شیر وغیرہ)

4- میتۃ (جو خون والا نہ ہو جیسے حشرات الارض)

بحری حلال جانور:

1- زندہ

2- میتۃ

بحری حرام جانور:

1- زندہ

2- میتۃ

مجموعہ ان گیارہ قسموں میں سے بری حلال جانور خواہ زندہ ہوں یا مذبوح اور بحری حلال جانور جو زندہ ہے ان کی خرید وفروخت بلا شبہ جائز ہے اور آمدنی بھی حلال ہے اور بری حلال

جانوروں میں سے جو میتہ ہیں اس کی بیع جائز نہیں، البتہ میتہ ٹڈی حلال ہے اور اس کی بیع بھی جائز ہے اور بری حرام جانوروں میں سے جو خون والے ہوں مثلاً: شیر اور ہاتھی وغیرہ تو اس کے میتہ کی بیع جائز نہیں اور بحری جانوروں میں سے جو میتہ ہیں اس کی بیع جائز ہے، مگر اس کا کھانا جائز نہیں یہ چھ قسمیں ہیں جن کا حکم بیان ہوا ہے۔

ان کے علاوہ بحری حرام جانور کی دونوں قسمیں (زندہ، میتہ) اور بری حرام جانور کی تینوں قسمیں (زندہ، مذبوح اور میتہ غیر ذی دم) یہ کل پانچ قسمیں ہیں جن کی بیع جائز ہونے اور نہ ہونے میں قدرے تفصیل ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

ذیل میں درج شدہ فقہی نصوص پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان پانچ قسموں کے جانوروں کی خرید و فروخت ایک شرط کے ساتھ جائز ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ قابل انتفاع ہوں اور اگر ان میں سے کوئی منتفع بہ نہ ہو تو پھر اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہوگی۔

قابل انتفاع ہونے کا معیار:

اب رہی بات کہ منتفع بہ ہونے کا معیار کیا ہے اور اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

تو یہ نہایت اہم سوال ہے اس کی تحقیق ہونی چاہیے، چنانچہ اس سلسلے میں جب فقہی نصوص کا بنظر غائر جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے منتفع بہ ہونے کا اصل معیار عام لوگوں کی ضرورت ہے اور ضرورت ایک ایسی چیز کا نام ہے جو اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جس میں ہر زمان، ہر مکان اور ہر تغیر پذیر حالات کی ضروریات شامل ہوتی ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر زمانہ کی ضروریات ایک جیسی نہیں ہوتیں اور ہر جگہ اور ہر علاقہ کی ضروریات بھی ایک طرح کی نہیں ہیں، اسی حالات و واقعات کے بدلنے سے بھی لوگوں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، لہٰذا ضرورت ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے، جس میں دواء سازی کی ضرورت، علاج معالجہ کی ضرورت اور کسی بھی جائز و مباح چیز تیار کرنے کی ضرورت سب اس میں داخل ہیں، غرض یہ کہ کسی بھی جائز و مباح موقع و مرحلہ میں جب ان جانوروں سے انتفاع کی ضرورت ہوگی تو وہ ضرورت کے وسیع مفہوم میں شامل ہوگا اور یہ حکم خنزیر کے علاوہ ہے، کیونکہ یہ نجس العین ہے اور اس سے کسی طرح بھی انتفاع جائز نہیں۔

اور آج کی سائنسی ترقی یافتہ دنیا میں کسی نہ کسی موقع و مرحلہ پر ان جانوروں سے انتفاع کی

ضرورت پیش آتی ہے اور کسی نہ کسی چیز کی ایجاد و تیاری میں ان سے مدد لی جاتی ہے اور ایسی تیار شدہ جائز و مباح اشیاء سے انسان فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔

نیز منتفع بہ ہونا ایک مفہوم کلی بھی ہے، جس سے ہر شخص اپنی ضرورت کے تحت مستفید ہوتا ہے، مثلاً: ان جانوروں کو فروخت کرنے والا اور ان کا کاروبار کرنے والا اور ان سے مباح اشیاء تیار کرنے والا، تمول اور دولت کا فائدہ اٹھاتا ہے اور عام لوگ ان کے ذریعہ تیار شدہ مباح اشیاء سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان جانوروں کے منتفع بہ ہونے کا اصل معیار و مدار عام لوگوں کی ضرورت ہے اور ضرورت ایک وسیع مفہوم ہے جس سے فائدہ اٹھانے کا انداز مختلف ہوسکتا ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت اور موقع و محل کے تحت اس سے استفادہ کرتا ہے، اس طویل تمہید سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کسی نہ کسی موقع و مرحلہ میں ان جانوروں سے انتفاع کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے یہ منتفع بہ ہیں اور چونکہ منتفع بہ اشیاء کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے، لہٰذا ان جانوروں کی خرید وفروخت بھی جائز ہوگی۔

اس طویل اور اصولی گفتگو کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ کیکڑے اور کچھوے کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

اوپر ذکر کردہ اصول کے مطابق اس کا جواب تو بالکل واضح ہے کیونکہ ہمارے علم و معلومات کے مطابق دواء سازی، علاج و معالجہ اور دیگر مباح اشیاء کی تیاری میں ان دونوں جانوروں سے مدد لی جاتی ہے، لہٰذا یہ منتفع بہ ہیں، اس لیے ان کی خرید وفروخت بلاشبہ جائز ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی بھی حلال ہے۔

چنانچہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رقمطراز ہیں:

''سوائے خنزیر کے زندہ سب جانوروں کی بیع کسی فائدہ کے لیے درست ہے، خواہ بری ہوں یا بحری، چھوٹے ہوں یا بڑے، حتیٰ کہ کتے اور چیتے اور سانپ وغیرہ کی بھی اور مردہ ان حیوانات کی بیع بھی درست ہے جو پاک ہیں، جیسے دریائی جانور یا حشرات غیر ذی دم یا ذی دم جانور بعد ذبح، کیونکہ ذبح سے ہر جانور پاک ہوجاتا ہے، سوائے خنزیر کے، دریائی جانور سب پاک ہیں، چھوٹے ہوں یا بڑے، مذبوح ہوں یا غیر مذبوح، ہاں کھانا کسی کا سوائے مچھلی کے مذہب حنفی میں درست

نہیں، تو خارجی استعمال تمام حیوانات دریائی کا اور ان کے تمام اجزاء کا درست ہوا۔"

(بهشتی زیور نواں حصه ص: ۱۰۳ ـ ۱۰٤)

نیز کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ غیر مسلم ان جانوروں کوخرید کر کسی اور کام کے بجائے کھانے پینے میں بھی استعمال کر سکتے ہیں؟ جب کہ حرام چیز غیر مسلم کو کھلانا بھی جائز نہیں، تو اس کا جواب اوپر بیان کردہ تفصیلات کی رو سے بالکل واضح ہے کہ ان جانوروں کا استعمال کھانے پینے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، دیگر ضروریات میں بھی ان کا استعمال ہوسکتا ہے اور ہورہا ہے، لہٰذا اگر فروخت کرنے والے کا ارادہ اسی ضرورت کا ہو، پھر بھی خریدنے والا اگر اس کو کھانے میں استعمال کرتا ہو تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا، فروخت کرنے والا ذمہ دار نہ ہوگا۔

واضح رہے کہ اس مذکورہ تفصیل کی رو سے وہ تعارض بھی بآسانی رفع ہو جاتا ہے جو بادی نظر میں نصوص فقہیہ کے درمیان نظر آتا ہے، کہ بعض فقہی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جانوروں میں سے بعض کی بیع جائز نہیں مکروہ ہے، جبکہ دوسری فقہی عبارات اس کے بالکل برخلاف ہیں، الحمدللہ اوپر بیان کردہ اس تفصیل سے یہ تعارض بالکل رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ جن فقہاء کرام نے ان کی بیع کو ناجائز ومکروہ کہا ہے، وہ ان کے نزدیک منتفع بہ نہ ہونے کی بنیاد پر کہا ہے اور جن حضرات نے ان کی بیع کو جائز کہا ہے وہ ان کے نزدیک منتفع بہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے، لہٰذا دونوں رائے کا محمل الگ الگ ہے اس لیے ان کے مابین کوئی تعارض نہیں ہے۔

دلائل ذیل میں ملاحظہ ہوں:

۱ ـ جاء في الدر المختار: او بخنق ونحوه، قال ابن عابدين رحمه الله في بيان حكم بيع دودة القدمز، قلت، وفيه انها من اعز الاموال اليوم، ويصدق عليها تعريف المال المتقوم، ويحتاج إليها الناس كثيرا في الصباغ وغيره، فينبغي جواز بيعها كبيع السرقين والعذرة المختلطة بالتراب هذه الدودة ان لم يكن لها نفس سائلة تكون منتها طاهرة كالذباب والبعوض وان لم يجز اكلها، وسياتي ان جواز البيع يدور مع حل الانتفاع وانه يجوز بيع العلق للحاجة مع انه من الهوام وبيعها باطل، وكذا بيع الحيات للتداوي، وفي القنية:

وبيع غير السمك من دواب البحر لوله ثمن كالسقنقور و جلود الخز و نحوها يجوز والا فلا ." (ردالمحتار : ٥/١٥ باب البيع الفاسد)

٢ ـ في الدر المختار : " ويباع دود القز، في ردالمحتار (قوله المحرز ......) قال في البحر، وهو معنى ما في الذخيرة إذا كان مجموعا لانه حيوان منتفع به حقيقة و شرعاً فيجوز بيعه وإن كان لا يؤكل كالبغل والحمار قوله جوز ابو الليث بيع العلق و به يفتى للحاجة، في البحر عن الذخيرة، إذا اشترى العلق الذى يقال له بالفارسية موعل يجوز وبه اخذ الصدر الشهيد لحاجة الناس اليه لتمول الناس له ."

" اقول : العلق في زماننا يحتاج إليه للتداوي بمصه الدم، و حيث كان متمولاً لمجرد ذلك دل على جواز بيع دودة القدمز، فإن تمولها الان اعظم اذهى من اعز الاموال، ويباع منها في كل سنة قناطير بثمن عظيم فعلم ان المراد به علق خاص متمول عند الناس وذلك متحقق في دود القدمز، وهو اولى من دود القز وبيضة فإنه ينتفع به في الحال ودود القز في المال ."

" (قوله كحيات) في الحاوي الزاهدي : يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية، ما جاز الانتفاع بجلده او عظمه اي من حيوانات البحر او غيرها . قال في الحاوي : ولا يجوز بيع الهوام كالحية والفارة والوزغة والضب والسلحفاة والقنفذ وكل مالا ينتفع به ولا بجلده، وبيع غير السمك من دواب البحر، إن كان له ثمن كالسقنقور وجلود الخز ونحوها يجوز، وإلا فلا، كالضفدع والسرطان وذكر قبله . ونقل السائحاني عن الهندية : ويجوز بيع سائر الحيوانات سوى الخنزير وهو المختار، وعليه مشى في الهداية وغيرها من باب المتفرقات كما سيأتي ." (٥/٦٨،٦٩)

۳ـ في متفرقات الدر المختار: "وصح بيع الكلب والفهد والفيل والقرد والسباع بسائر انواعها حتى الهرة."

في ردالمحتار: "(قوله الهرة) لانها تصطاد الفار والهوام المؤذية فهي منتفع بها فتح ...... وتقدم في البيع الفاسد جواز بيع السرقين وبعد ولو خالصيس والانتفاع به والوقود به وبيع رجيع الأدمي لو مخلو طابتراب." (۲۲۷،۲۲٦/٥)

٤ـ في الدر المختار: "وجوز في القنية: بيع ماله ثمن كالسقنقورو جلود خز وجمل الماء لوحيا." (۲۲۷/٥)

٥ـ في الهداية: "ولنا انه عليه الصلوٰة والسلام: نهى عن بيع الكلب الا كلب صيد او ماشية، ولانه منتفع به حراسة واصطيادًا فكان مالاً فيجوز بيعه...... قال ابن الهمام رحمه اللّٰه: يعني مالاً مملوكاً متقوماً، اما كونه مالاً فلان المال اسم لغير الادمي خلق لمنفعته المطلقة شرعاً وهذا كذلك، فكان مالاً، واما انه مملوك متقوم فلانه محرز ماذون شرعاً في الانتفاع به والملك يثبت بالاحراز بدار الاسلام والتقوم بالتمول وكلاهما ماذون فيه شرعاً."

(فتح القدير: ٦/٢٤٧ مسائل منثورة)

٦ـ في الهندية: (۱۱٤/۳) ...... "ولا يجوز بيع ما يكون في البحر كالضفدع والسرطان وغيره الا السمك ...... وفي النوازل: ويجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها في الادوية، وإن كان لا ينتفع بها لا يجوز، والصحيح انه يجوز بيع كل شئى ينتفع به كذا في التتارخانية."

٧ـ قال الموفق في المغني (٤/۲۵٦،۲۵۷): "وبيع الفهد و الصقر المعلم جائز، و كذلك بيع الهرة و كل ما فيه المنفعة، و جملة ذلك ان كل مملوك ابيح الانتفاع به يجوز بيعه الا ما استثناء الشرع

من الكلب ...... ويحمل الحديث على غير المملوك منها او مالا نفع فيه منها، بدليل ما ذكرنا، ولأن البيع شرع طريقاً للتوصل الى قضاء الحاجة واستيفاء المنفعة المباحة ليصل كل واحد الى الانتفاع بما في يد صاحبه مما يباح الانتفاع به، فينبغي ان يشرع ذلك فيه ليصل كل واحد الى الانتفاع بما في يدصاحبه فما يباح الانتفاع به ينبغي ان يجوز بيعه." (ماخوذ از جدید تجارت کے شرعی احکام)

زندہ جانور کو تول کر بیچنے کا حکم:

اگر خریدار اور فروخت کنندہ زندہ جانور کو وزن کر کے خرید وفروخت پر راضی ہوں تو جانور کو وزن کر کے نقد رقم یا غیر جنس کے ذریعے خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ متعین جانور کا فی کلو حساب سے نرخ طے کرلیا گیا ہو، نیز جانور کا وزن کرنے کے بعد اس کی قیمت بھی متعین کرلی گئی ہو۔ جس کی صورت یوں ہوگی کہ خریدار کو مثلاً: ایک بکرے کی ضرورت ہے تاجر کے پاس جا کر وہ بکروں میں سے ایک بکرا منتخب کرلیتا ہے اور تاجر اس کو بتا دیتا ہے کہ اس بکرے کا نرخ پچاس روپے کلو ہے اور اس بکرے کو خریدار کے سامنے وزن کر کے بتا دیتا ہے کہ مثلاً: یہ بیس کلو ہے۔ اب اگر خریدار اس کو قبول کرلے تو بیع منعقد ہو جائے گی اور اس طرح کی گئی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے۔ (حوالہ بالا)

خیارِ شرط کا ثبوت:

عقد میں اصل تو یہی ہے کہ ایجاب وقبول سے عقد مکمل ہو جاتا ہے، بیع مکمل ہونے کے بعد بائع پر لازم ہے کہ مبیع حوالہ کرے اور خریدار پر لازم ہے کہ قیمت ادا کردے اس کے بعد فریقین میں سے کسی کو سودا ختم کرنے کا حق نہیں، البتہ بعض صورتوں میں شریعت مطہرہ نے اجازت دی ہے کہ ایجاب وقبول کے بعد بھی کچھ وقت کے لیے عقد کے منعقد ہونے کو موقوف رکھا جا سکتا ہے، مثلاً: فریقین میں سے کوئی ایک اپنے لیے شرط رکھے، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ایسی صورت میں تین دن تک خیارِ شرط حاصل ہو جائے گا، شرط رکھنے والے کو اس مدت کے اندر اختیار ہوگا چاہے، بیع کو نافذ کرے چاہے سودا ختم کردے، لیکن اگر تین دن گزر گئے اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو خود بخود عقد مکمل ہو جائے گا اگر عقد ختم کرنے کا ارادہ ہو تو فریق ثانی کو مطلع

کرنا ضروری ہے، ان کو مطلع کیے بغیر اکیلے عقد کو ختم کرنا شرعاً معتبر نہیں۔

قال ابو حنیفة رحمه الله : "أن اشتراط الخیار، شرط ینافی موجب العقد، وهو ثبوت الملك عند العقد. وانما عرفنا جوازه، بحدیث حبان بن منقذ . علی خلاف القیاس و کان یخدع فی البیوع، فقال صلی الله علیه وسلم : "إذا ابتعت فقل لا خلابة ." ای لا خدیعة ولی الخیار ثلاثة ایام ."

(اخرجه ابو داوٗد رقم : ۳۵۰۰، بدایة المجتهد : ۱۷۵/۲)

خیارِ رویت:

عقد بیع صحیح ہونے کے لیے مبیع (مال) کا معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو اس لیے مال کو اچھی طرح دیکھ کر خریدنا چاہیے، تاہم اگر اوصاف بتا کر مال کو متعین کرلیا جائے تب بھی عقد صحیح ہو جائے گا، لیکن مال کو اگر دیکھے بغیر خریدلیا تو دیکھنے کے بعد خریدار کو اختیار ہوگا چاہے سودا برقرار رکھے یا واپس کردے۔

لقوله علیه السلام "من اشتریٰ مالم یره فهو بالخیار اذا راٰه .

اخرجه البیهقی فی کتاب البیوع (السنن الکبریٰ : ۲۶۸/۵)

قال فی الهندیة : ومن اشتریٰ شیئا لم یره فله الخیار إذا راه إن شاء اخذه بجمیع الثمن وإن شاء رده سواء راه علی الصفة التی وصفت له أو علی خلافها ."

(الفتاویٰ الهندیة : ۵۷/۳ الباب السابع فی خیار الرؤیة)

جملہ عیوب سے برأت کا اعلان کر کے کوئی چیز فروخت کرنا:

کسی چیز کے فروخت کے وقت اگر بائع یوں کہہ دے کہ آپ اچھی طرح دیکھ کر لے لیں بعد میں کوئی عیب نظر آئے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا اس طرح برأت کے اعلان کے ساتھ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے، اب بعد میں خریدار کو کوئی عیب نظر آئے تو سودا واپس کرنے کا حق نہ ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : وصح البیع بشرط

البرأة من كل عيب وإن لم يسم خلافا للشافعي لإن البرأة من الحقوق المجهولة لا تصح عنده وتصح عندنا لعدم افضائه إلى المنازعة ." (تنقيح الحامدية : ١/٢٧٣ باب خيار الروية)

خیارِ عیب کا حکم:

کوئی چیز خریدی اس کے بعد مشتری کسی ایسے عیب پر مطلع ہوا جو بائع کے پاس ہی مبیع میں موجود تھا اور مشتری کو خرید تے وقت اس کا علم نہ ہو سکا یا قدرے علم تو ہوا تھا لیکن مکمل علم نہ ہونے کی وجہ سے اس عیب پر رضا کا اظہار نہیں کیا تو ایسی صورت میں اب خریدار کو دو باتوں کا اختیار ہوگا چاہے کل قیمت پر مال کو اپنے پاس رکھ لے چاہے تو مال واپس کر کے اپنی ادا کردہ قیمت لے لے، اس بات کا اختیار نہیں ہوگا کہ مال اپنے پاس روک کر بائع سے نقصان کا عوض وصول کرے۔ الا یہ کہ بائع خود اس کے لیے تیار ہو جائے۔

قال في الاختيار : مطلق البيع يقتضى سلامة المبيع، و كل ما اوجب نقصان الثمن، في عادة التجار فهو عيب، إذا علم المشترى بالعيب عند الشراء او عند القبض و سكت فقد رضى به و إذا اطلع المشترى على عيب، فإن شاء اخذ المبيع بجميع الثمن، و إن شاء رده، وليس له اخذه واخذ النقصان الا برضاء البائع لإن الاوصاف لا يقابلها شيء من الثمن بالعقد .

(الاختيار لتعليل المختار للموصلى : ٢/١٨)

اخبارات کی خرید وفروخت:

اخبارات کی خرید وفروخت کا بنیادی مقصد چونکہ ملکی وغیر ملکی حالات وواقعات سے مطلع ہونا ہوتا ہے اس لیے فی نفسہ ان کی خرید وفروخت جائز ہے، باقی اخبارات میں جاندار کی تصاویر شائع کرنا حرام ہے، اس کا گناہ شائع کرنے والوں پر ہوگا، اخبار کے خریدار پر لازم ہے کہ ان تصاویر کو مقصدِ خرید نہ بنائے اسی طرح حتی الامکان ان تصاویر سے نظر بچانے کی کوشش کرے بلکہ اخبار لینے کے بعد پڑھنے سے پہلے تصاویر کے چہرے مٹادے، ہاں البتہ جن اخبارات ورسائل کا مقصد ہی عریاں نیم عریاں تصاویر شائع کر کے فحاشی وعریانی کو فروغ دینا ہو ایسے اخبارات اور رسائل کو

خریدنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضيخان : إذا سال الرجل غيره الاخبار المحدثه في البلد قال بعضهم يكره الاخبار و الاستخبار و قال بعضهم لا يكره الاستخبار و يكره الاخبار و الصحيح انه لا بأس بالأخبار ايضا ليكون عالما بالمصالح .

(خانية على هامش الهندية : ۳/ ٤٢٥ ، فتاوىٰ حقانية بتغيير يسيرة)

بجلی کی خرید وفروخت کا حکم:

بجلی کی خرید وفروخت کا شرعاً کیا حکم ہے جبکہ حکومت مختلف لوگوں کو مختلف ریٹ پر بجلی فروخت کرتی ہے اور بجلی کوئی ایسا مال بھی نہیں ہے جو عین ہو اس کو اوصاف کے ذریعہ متعین کیا جا سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً قاعدہ یہ ہے کہ مال کی بیع جائز ہے، بجلی اگر چہ عین شئ نہیں ہے، تاہم وہ عرفاً مال سمجھی جاتی ہے، لہٰذا اس کی خرید وفروخت جائز ہے کیونکہ یہ بھی مال کے حکم میں داخل ہوگئی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : المال تثبت بتمول الناس كافة او بعضهم .

(ردالمحتار : ٤/ ٥٠١ كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال و الملك)

باقی اس کے ریٹ کا مختلف ہونا چونکہ یہ حکومت کی ملک ہے وہ رعایا کے حالات کے لحاظ سے اگر قیمت کم یا زیادہ رکھے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ استعمال سے پہلے بتلا دے اور پھر اس کے مطابق ہی وصول کرے ہیرا پھیری اور دھوکہ سے اجتناب حکومت پر بھی لازم ہے۔

خودرو گھاس کی خرید وفروخت کا حکم:

خودرو گھاس کو کاٹنے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں اگر چہ اپنی مملوکہ زمین میں اُگی ہو، البتہ اگر کسی نے اُگائی ہو یا باڑ وغیرہ لگا کر اس کی حفاظت کی یا پانی وغیرہ کے ذریعہ اس کو بڑھایا یا زمین کو ہموار کر کے گھاس اُگنے کے قابل بنایا تو ان صورتوں میں خودرو گھاس کی خرید وفروخت جائز ہوگی۔

كما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم : عن رجل من مهاجرين من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم قال غزوت مع

النبي صلى الله عليه وسلم ثلاثا اسمعه يقول المسلمين شركاء في ثلاث الماء والكلاء والنار. (ابو داؤد: ۲/۱۲۶)

قال في الهندية: ولا يجوز بيع الكلاء واجارته وإن كان في ارض مملوكة غير أن لصاحب الارض ان يمنع الدخول في ارضه ...... هذا إذا نبت بنفسه فاما إذا كان سقى الارض واعدها للانبات فنبت ففي الذخيرة والمحيط والنوازل يجوز بيعه لانه ملكه وهو مختار الشهيد.

(الفتاویٰ الهندية: ۱۰۹/۳، ومثله في البحر الرائق ۷۷/٦ باب البيع الفاسد)

خریدار کے مطالبہ پر مال دوسری جگہ سے منگوا کر دینا:

زید کو کتاب کی ضرورت ہے وہ کتب خانہ میں جا کر طلب کرتا ہے لیکن فی الوقت کتاب موجود نہیں، اس لیے وہ دوسری جگہ سے منگوا کر نفع لے کر زید کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

شرعاً یہ جائز نہیں البتہ کتاب آنے کے بعد یہ بیع منعقد ہوگی اس سے پہلے دونوں کو اختیار حاصل ہے مالک کو اختیار ہے چاہے زید کو فروخت کرے یا کسی اور کو اور زید کو بھی اس قیمت پر خریدنے اور نہ خریدنے دونوں باتوں کا اختیار ہے، البتہ اگر زید نے خریدنے کا وعدہ کیا ہو اور مالک نے فلاں تاریخ تک لا کر دینے کا وعدہ کیا ہو تو ایسی صورت میں طرفین کے لیے وعدہ کی پابندی لازم ہے، جو خلاف ورزی کرے گا وہ گناہگار ہوگا۔

بائع کو پیشگی رقم دے کر تھوڑا تھوڑا کر کے مال وصول کرنا:

بعض علاقوں میں دستور ہے کہ قصائی کو پیشگی رقم دے دی جاتی ہیں اور گوشت کی ایک قیمت مقرر کر کے روزانہ یا حسبِ ضرورت متعین گوشت وصول کیا جاتا ہے، اسی طرح دیگر اشیاء میں بھی یہی رواج ہے پیشگی رقم دینے کی وجہ سے قیمت میں بھی کچھ رعایت ہوتی ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے اس لیے کہ جو رقم پیشگی ادا کی گئی ہے یہ قرض ہے اور یہ رعایت قرض کی وجہ سے ہے

اور اس معاملہ کو بیع سلم بھی نہیں کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ اس میں کم سے کم مہلت ایک ماہ ہوتی ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ بیع سلم میں اجل شرط نہیں ہے، اس لیے یہ معاملہ ان کے ہاں سلم میں داخل ہوسکتا ہے، چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔ (بتغییر امداد الفتاوی: ۳/۳۱)

ایڈوانس رقم دے کر رعایۃً اشیاء خریدنا:

موجودہ دور میں مختلف دواء ساز کمپنیاں ہیں جو زرعی ادویات یا دیگر مختلف قسم کی ادویات کا کاروبار کرتی ہیں، ان کے کاروبار کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کمپنی خریدار سے رقم ایڈوانس لے لیتی ہے اور پھر پانچ چھ ماہ بعد مقررہ مدت پر خریدار کو دواء دیتی ہے اور ایڈوانس رقم دے کر دواء خریدنے والے خریدار کو عام خریداروں کی بنسبت 20 یا 30 فیصد رعایت دیتی ہے، تو اس طرح ایڈوانس رقم دے کر رعایت کے ساتھ دواء وغیرہ خریدنا شرعاً جائز ہے اور اس میں عام خریدار کے مقابلے میں جو رعایت پہلے بکنگ کرانے والے کو ملتی ہے، اس کی دو حیثیتیں ہیں:

ایک حیثیت سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ خریدار نے کمپنی کو رقم قرض دی ہے اس لیے وہ قرض کے مقابلے میں رعایت دے رہی ہے، اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ رعایت شرعاً جائز نہ ہو، کیونکہ یہ ایک نفع ہے جو قرض سے حاصل کیا گیا ہے۔

لیکن دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ رعایت قرض کی وجہ سے نہیں بلکہ خریدار کے مستقل گاہک ہونے کی وجہ سے ہے اور چونکہ یہ تاجروں کا طریقہ ہے کہ اپنے مستقل گاہکوں کو رعایت دیا کرتے ہیں اس لیے وہ یہ رعایت دے رہے ہیں اور ایڈوانس رقم کا مطالبہ یہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہے کہ یہ شخص واقعۃً مقررہ مدت پر دوائی ضرور خریدے گا، اس صورت میں یہ رعایت شرعاً جائز ہے اور ایسے معاملات میں جواز کی دوسری وجہ راجح معلوم ہوتی ہے، تاجروں کا عرف اور علماءِ عصر کا تعامل بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ (فقہی مقالات: ص ۶۹)

آرڈر پر مال تیار کرانے کا حکم:

کسی کمپنی وغیرہ سے نمونہ دکھا کر آرڈر لینا اور پھر مال تیار کر کے دینا جس کو فقہ کی اصطلاح میں استصناع کہا جاتا ہے، چونکہ اس کی عام ضرورت ہے اس لیے جائز ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چیز تیار ہونے کے بعد خریدار کو خریدنے نہ خریدنے کا اختیار ہے، اسی طرح خریدار

کودکھانے سے پہلے بنانے والے کواختیار ہے آرڈر والے کے ہاتھ فروخت کرے یا نہ کرے ہاں خریدار کودکھا دینے کے بعد اختیار ختم ہو جائے گا ہر حال میں اسی کو دینا ہوگا۔

لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جب معاہدہ طے پا گیا، ایجاب وقبول ہو گیا اب دونوں کا اختیار ختم ہو گیا، فریقین میں سے کسی کو بھی رجوع کا حق نہیں یہ بیع لازم ہو جاتی ہے۔ اسی فتویٰ پر عمل کر کے ہی استصناع پر عمل ہو سکتا ہے، ورنہ آرڈر کی تعمیل بہت مشکل ہے۔ باقی خیارِ رویت کا مسئلہ وہ نمونہ دیکھنے اور اوصاف بیان کرنے سے ساقط ہو گیا اور بنانے والے کا اختیار معاہدہ کی وجہ سے باطل ہو گیا۔

استصناع صحیح ہونے کی تین شرطیں:

استصناع (آرڈر) صحیح ہونے کی تین شرطیں ہیں:

1- کوئی مدت اس طرح مقرر نہ کی جائے کہ اس مدت سے پہلے لینا صحیح نہ ہو البتہ اندازہ اور مہلت کے لیے مدت کو بیان کر سکتے ہیں۔

2- مال تیار کرنے کے تمام اجزاء کاریگر کے ہوں، اگر اکثر خام مال خریدار کا ہو تو اجارہ ہو جائے گا اور اجرت کے احکام اس پر جاری ہوں گے اور اگر اکثر مال کاریگر کا ہے تو یہ بھی استصناع ہے۔

3- ایسی چیز بنوائی جائے جس کا عام رواج ہو گیا ہو، ایسی چیز نہ ہو جو غیر مستعمل اور غیر متعارف ہو ورنہ عقد فاسد ہوگا کیونکہ استصناع خلافِ قیاس جائز ہے جو چیز خلافِ قیاس جائز ہو وہ موضع ثبوت پر مقید رہتی ہے اس پر قیاس کر کے دوسری جگہ حکم نہیں لگا سکتے۔

البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب استصناع سے بیع لازم ہو جاتی ہے تو متعارف ہونے کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ عام طور پر وہی چیز بنوائی جاتی ہے جو جدید قسم کی ہو اور خاص وضع کی ہو، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کے لیے لکڑی کا ممبر بنوایا حالانکہ اس سے پہلے ممبر متعارف تھا نہ مستعمل۔

مسئلہ: کتابوں کو پریس سے چھپوانا، نئے آلات اپنی فرمائش اور پسند سے بنوانا یہ سب استصناع میں داخل ہیں، جیسے الماری، شوکیس کوئی بھی نئے ڈیزائن کا بنوانا یہ سب استصناع کی صورتیں ہیں جو اس زمانہ میں عام اور بکثرت ہیں۔

(ماخوذ از عطریه هدایه جدید : صـ ٢١٤)

نمونہ (سیمپل) کی دوا فروخت کرنا:

دواء ساز کمپنی کی طرف سے جو دواء ڈاکٹروں کو نمونہ اور سیمپل کے طور پر ملتی ہے، اس پر لکھا ہوتا ہے فروخت کے لیے نہیں، ڈاکٹروں کو ان دواؤں کا مالک نہیں بنایا جاتا بلکہ کمپنی ان کو اپنا نمایندہ بناتی ہے لہٰذا ڈاکٹروں کے لیے سیمپل کی دوا فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے، آمدن بھی حرام ہے، اگر ڈاکٹر دکانداروں کے ہاتھ فروخت کرے تو معلوم ہوتے ہوئے دکانداروں کے لیے خریدنا جائز نہیں، اگر علم نہ ہونے کی وجہ سے خرید لیا تو واپس کر کے ڈاکٹروں سے اپنی رقم واپس لے لے، اگر دکاندار صرف فروخت کر کے رقم ڈاکٹروں کو دے دے تب بھی گناہ کے کام میں تعاون ہونے کی بناء پر یہ عمل ناجائز ہے۔

قرعہ اندازی سے اشیاء خریدنا:

بعض دواء ساز کمپنیاں اپنی دوائی کی ایڈوانس بکنگ کرتی ہیں اور فی پیک ایک متعین قیمت کا اعلان کرتی ہیں اور بکنگ محدود وقت کے لیے اور محدود پیک دواؤں کے لیے ہوتی ہے اور جب مطلوبہ افراد ایڈوانس بکنگ کرائیں تو کمپنی ان میں سے چند محدود افراد کے لیے انعامات کا اعلان کرتی ہے، جس میں موٹر سائیکل، عمرے کا ٹکٹ اور دیگر چیزیں ہوتی ہیں اور یہ چیزیں ان افراد کے درمیان قرعہ اندازی سے تقسیم کی جاتی ہیں اور لوگ انعام کے لالچ میں اس طرح خریداری کرتے ہیں۔

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر مبیع یعنی برائے فروخت دوائی یا دیگر اشیاء کی اعلان شدہ قیمت وہی ہو جو عام بازار کی قیمت ہوتی ہے تب تو ایسی اسکیم میں شامل ہو کر قرعہ اندازی کے ذریعہ اشیاء خریدنا اور انعام حاصل کرنا بلاشبہ جائز ہے، البتہ اگر اس دوائی وغیرہ کی اعلان شدہ قیمت عام بازار کی قیمت سے زائد رکھی گئی ہو تو پھر اس طرح ایڈوانس بکنگ کرا کے قرعہ اندازی میں شامل ہو کر اشیاء خریدنا اور انعام حاصل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اشیاء کی قیمت عام بازاری ریٹ سے زیادہ ہونے کی وجہ سے زائد قیمت جوئے میں شامل ہو جائے گی، اس لیے کہ زائد قیمت دینے والا انعام حاصل کرنے کی غرض سے اپنی زائد رقم داؤ پر لگائے گا اور اسی کو شریعت میں جوا کہا جاتا ہے، اس لیے ایسی اسکیم کے ذریعہ اشیاء خریدنا اور انعام حاصل کرنا جائز نہیں۔

انعامی کوپن یا کارڈ پر اشیاء خریدنا:

بعض دکاندار لوگ اپنے سامان کو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کے لیے لوگوں کو ترغیبات دیتے رہتے ہیں، اگر کوئی ان کی دکان سے ان کی مقررہ کردہ مقدار تک سامان خریدتا ہے تو اسے ایک کوپن یا کارڈ دیا جاتا ہے، اس کوپن یا کارڈ میں قرعہ اندازی کے نمبر ہوتے ہیں اور خریدار کا نام نمبر کے ساتھ درج کیا جاتا ہے، پھر وہ خریدار اس کوپن یا کارڈ کو قرعہ اندازی کے دفتر میں جمع کروا دیتا ہے اور نمبر نکلنے کی صورت میں انعام دیا جاتا ہے تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر دکاندار سامان کی وہی قیمت لیتا ہے جو عام طور پر بازار میں ہوتی ہے، تو پھر انعام لینے کی نیت سے اس سے سامان خریدنا درست ہے اور انعامی کوپن یا کارڈ پر قرعہ اندازی کے ذریعہ جو انعام ملتا ہے اس کا لینا جائز ہے اور یہ انعام دکاندار کی طرف سے تبرع ہے، کسی چیز کا عوض نہیں ہے اور اگر خریدی ہوئی اشیاء انعامی کوپن کی وجہ سے بازاری قیمت سے زیادہ پر فروخت کی جا رہی ہوں جبکہ وہی چیز انعامی کوپن کے بغیر کم قیمت پر مل رہی ہو تو اس صورت میں متوقع انعامات حاصل کرنے کی جستجو کرنا ناجائز اور حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ ایسی صورت میں یہ قمار میں داخل ہو جائے گا جو شرعاً حرام ہے۔

مقررہ وقت سے پہلے ادائیگی پر رعایت دینے کا حکم:

تاجر لوگ کمپنی سے ادھار پر مال خریدتے ہیں اور ایسے خریدار کے لیے کمپنی ایک تاریخ مقرر کر دیتی ہے کہ فلاں تاریخ تک پیسے ادا کرنے ہوں گے اور ساتھ یہ بھی بتا دیتی ہے کہ اگر فلاں تاریخ تک پیسے ادا کر دیے تو مثلاً: 10 فیصد رعایت ہوگی اور اگر اس سے تاخیر کی تو یہ رعایت نہیں ملے گی بلکہ پورے پیسے ادا کرنے ہوں گے اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کمپنی تاجر کو مال ادھار پر دیتے وقت یہ کہے کہ فلاں متعین تاریخ مثلاً: دو ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرنی ہے، پھر اس معاملہ کے بعد تاجر کو یہ کہے کہ تم اگر اس تاریخ سے قبل ایک ماہ کے اندر اندر اس کی قیمت ادا کر دو گے تو دس فیصد رعایت کر دیں گے تو اب یہ خرید و فروخت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ ایک ماہ بعد قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں رعایت ختم کر کے کمپنی جو رقم لے گی یہ مدت کے مقابلے میں ہوگی اور مدت کے مقابلے میں رقم وصول کرنا شرعاً سود ہے، اس لیے یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں اور فقہی اصطلاح میں اس کو ضع و تعجل کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے، جسے فقہاءِ کرام نے سود ہونے کی وجہ

سے ناجائز قرار دیا ہے اور اگر کمپنی نے تاجر کو مال ادھار دیتے وقت مال کی قیمت کی ادائیگی کے لیے کوئی تاریخ متعین نہیں کی تھی اور نہ پہلے ادائیگی پر رعایت کی بات ہوئی تھی بلکہ یوں ہی مطلقاً معاملہ کیا ہے، پھر بعد میں تاجر کو کہا کہ اگر فلاں تاریخ تک ادا کردو گے تو دس فیصد رعایت کر دیں گے تو اب یہ خرید و فروخت جائز اور درست ہے، اس لیے یہاں جو رعایت دی جا رہی ہے وہ مدت کے مقابلے میں نہیں ہے اس لیے کہ یہاں پر ادائیگی کے لیے مدت سرے سے تھی ہی نہیں، لہٰذا شرعاً یہ معاملہ جائز ہے۔ (فقہی مقالات)

بائع کا غلطی سے کم قیمت پر فروخت کرنا:

اگر دکاندار کوئی چیز فروخت کر دے اور مشتری چیز لے کر قیمت بھی ادا کر دے پھر بعد میں بائع کہے کہ لسٹ میں اس کی قیمت زیادہ تھی میں نے دیکھا نہیں تھا یا غلطی سے کم بتا دیا تھا یا بھول گیا تھا تو ایسی صورت میں چونکہ فروخت مکمل ہو چکی ہے لہٰذا خریدار پر زائد پیسے دینا لازم نہیں ہے، البتہ اگر واقعۃً دکاندار کو مغالطہ ہوا ہے اور اس چیز کی قیمت بازار میں زیادہ ہے تو اسے زائد پیسے دے دینا مستحب اور بہتر ہے۔

(تکملة فتح الملهم : ١/ ٣٧٩،٨٠ مطلب في خيار المغبو ن،
شرح المجلة : ٢/ ٣٣٥ ماده : ٣٨٦ والدر المختار : ٥/ ١٤٢)
(ماخوذ از جدید تجارت : صـ ١٠٨)

بیع صرف کے احکام

بیع صرف کی تعریف:

وہ بیع جس میں ثمن اور مبیع دونوں سونا چاندی کی جنس سے ہوں۔

هو بيع الاثمان بعضها ببعض كبيع الذهب بالفضة او الدنانير بالدراهم .

بیع صرف کے جواز کی تین شرطیں ہیں:

1- اگر جنس واحد ہو تو برابر ہونا ضروری ہے، کمی زیادتی جائز نہیں۔
2- مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ ہو جائے۔

3- ادھار بیع نہ ہو بلکہ نقد ہو۔ (فقہ المعاملات اللصابونی)

نوٹوں کے عوض سونے چاندی کو خریدنے کا حکم:

رائج الوقت کاغذی نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے اور چاندی کی رسید ہیں، لہٰذا ان کے ذریعہ سونا اور چاندی خریدنا جائز ہے، چاہے زیوارت خریدیں یا اشرفی یا دراہم ان پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

سونا چاندی ادھار خریدنے کا حکم:

سونا یا چاندی اس طرح ادھار پر فروخت کرنا کہ مثلاً: سونے کے زیورات خرید لیے اور رقم کچھ ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے اس لیے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے تا کہ بیع بالکالی لازم نہ آئے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : (تنبيه) سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فاجاب بأنه يجوز إذا قبض احد البدلين . (ردالمحتار : ٤/٢٠٥ باب الربوٰ كتاب البيوع)

وفي الهندية قال : وروي الحسن عن أبي حنيفه إذا اشترى فلوسا بدراهم وليس عند هذا فلوس ولا عند الآخر دراهم ثم إن احدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منها حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط . (عالمگيريه : ٣/٢٢٤ الفصل الثالث في بيع الفلوس)

چیک سے سونا چاندی خریدنا:

چیک نوٹ ہی کے جاری ہوتے ہیں اور نوٹ ہی کی نمائندگی کرتے ہیں اور سونے چاندی کی خرید وفروخت نوٹوں سے ہوتی ہے، لہٰذا چیک سے سونا چاندی خریدنا جائز ہے، کیوں کہ وہ بیع صرف نہیں ہے اور تقابض شرط نہیں۔ (احکام اوراق نقدیہ)

آرڈر پر زیور تیار کرنا:

زیور خریدنے والا، زرگر کو زیور بنانے کا آڈر دیتا ہے اور اس کے لئے پیشگی رقم بھی دیدیتا ہے

اور کہتا ہے کہ فلاں تاریخ تک تیار زیور چاہیے اور اس دوران زرگر اس رقم کو کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کرتا ہے کیا ایسا کرنا درست ہے؟ اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ، زیور بنوانے والے کے لئے مناسب یہ ہے کہ زرگر سے ابتداء سونا خرید لے، قیمت خواہ اسی وقت ادا کی جائے یا ادھار معاملہ کیا جائے اور پھر سونا بنوائی کی اجرت طے کر کے سونا سنار کے حوالہ کیا جائے یا یہ کہ خرید وفروخت کا باقاعدہ معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ زیور کا آرڈر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ باقاعدہ قیمت طے کر کے بیع کرنے کا مطالبہ کرے، تو رقم بطور قرض دی جا سکتی ہے، جو بعد میں زیور کی قیمت میں شمار ہو جائے گی، ان دونوں صورتوں میں زرگر خریدار سے حاصل شدہ رقم اپنے استعمال میں لا سکتا ہے اور جو تاریخ طے ہوئی ہے اس کی پابندی بھی شرعاً لازم ہے، شرعی عذر کے بغیر اگر تاخیر کرے گا تو معاہدہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے گناہ گار ہوگا اور اگر باقاعدہ قیمت طے کر کے زیور بنوانے کا معاملہ کیا جائے اور پوری قیمت پیشگی دی جائے، خواہ تاریخ معین کی جائے یا نہ کی جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اس صورت میں بھی زرگر اس رقم کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے اور کاروبار کر کے نفع بھی حاصل کر سکتا ہے۔ (احکام اوراق نقدیہ)

کاریگر اور دکاندار کے درمیان سونے کا لین دین

زیورات کی تیاری:

سونے کا وزن میں برابر ہونا، معاملہ ہاتھ در ہاتھ نہ ہونا، یہ ایک اہم مسئلہ ہے جو مفصل سوال اور تفصیلی جواب کی شکل میں لکھا جاتا ہے، زیورات بنوانے کے لئے دکاندار کاریگر کو خالص سونا دیتا ہے اور کاریگر اس سے دوکاندار کی ہدایت کے مطابق زیور تیار کر کے دیتا ہے، زیورات کی تیاری کے لئے دوکاندار چند باتوں کا اہتمام کرتا ہے۔

(۱) خالص سونا دیتا ہے۔

(۲) ملاوٹ کی شرح بتا دیتا ہے

(۳) جتنے وزن کے زیورات مطلوب ہیں اس سے زیادہ وزن کا خالص سونا دیتا ہے، تا کہ مطلوبہ وزن کے زیورات اس سونے سے تیار ہو سکیں، زیورات کے مطلوبہ وزن کے برابر خالص سونا دینے سے مطلوبہ وزن کے زیورات نہیں بن سکتے، کیونکہ مطلوبہ وزن کے زیورات بنانے کے لئے زائد سونے کا استعمال ناگزیر ہے، اس کے بغیر زیور نہیں بن سکتا، اگر دوکاندار زائد

وزن کا سونا کاریگر کو نہ دے سکے، تو مجبوراً کاریگر اسی سونے میں زائد سونا اپنے پاس سے شامل کرتا ہے اور مطلوبہ وزن کے زیورات دوکاندار کو فراہم کرتا ہے، واضح رہے کہ کاریگر دوکاندار کی ہدایت کے مطابق جو زیورات تیار کرتا ہے، وہ عام طور پر اندازے سے تیار کرتا ہے، جس کی وجہ سے زیورات کا وزن ٹھیک وہ نہیں ہوتا، جو دوکاندار نے بتلایا تھا، کچھ کم اور کبھی کچھ زیادہ ہوجاتا ہے اور کبھی کبھار کاریگر نے بہت توجہ دی تو مطلوبہ وزن بھی ٹھیک حاصل ہوجاتا ہے، سونے اور زیورات کے لین دین کی ایک مثال درج ذیل ہے:

مثال:

دوکاندار کا سونا دینا	کاریگر سے زیورات لینا
خالص سونا دیا	ملاوٹ شدہ سونے کے زیور کا تیار کردہ وزن آیا
۱۰۰،۰۰ گرام	۷۲،۰۰ گرام
ملاوٹ بتائی	کام کی نوعیت کے اعتبار سے چھیجت بنی
۰۹،۰۰ گرام	۰۵،۰۰ گرام
کل وزن نام میں لکھا	باقی سونا کاریگر کے پاس بچا
۱۰۹،۰۰ گرام	۳۲،۰۰ گرام
	کل:......۱۰۹،۰۰ گرام

(نوٹ) مثال مذکور میں کاریگر کے پاس جو زائد سونا ۳۲ گرام ملاوٹ شدہ بچا ہے دوکاندار اس کے بدلے میں کاریگر سے ملاوٹ کا ۳ گرام وزن کم کر کے ۲۹ گرام خالص سونا وصول کرتا ہے، واضح ہو کہ تمام معاملات دوکاندار اور کاریگر کے درمیان باقاعدہ اجرت کی بنیاد پر طے پاتے ہیں اور معاملہ کے اختتام پر اجرت کا لین دین ہوتا ہے۔

سوال: مذکورہ بالا صورت حال کے متعلق چند سوالات درج ذیل ہیں:

(۱) دوکاندار خالص سونا کاریگر کے سپرد کرتا ہے اور دوکاندار کی ہدایت کے مطابق ملاوٹ کر کے زیورات تیار کرتا ہے اور دوکاندار کے حوالے کرتا ہے اور دکاندار اسی وقت حساب کر کے جو سونا کاریگر کے پاس زائد بچا ہے چھیجت کاٹ کر باقی کے بدلے خالص سونا وصول کر لیتا ہے، شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے۔

اس میں یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ دوکاندار نے خالص سونا کاریگر کو دیا تھا اور اس میں کچھ ملاوٹ شامل کروائی تھی، اب آخر میں زائد ملاوٹ شدہ سونا جو کاریگر کے پاس بچا ہے اس کے بدلے میں خالص سونا وصول کرتا ہے اس میں کوئی قباحت تو نہیں؟ جبکہ یہ معاملہ باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ کاریگر زائد بچا ہوا سونا، اسی وقت نہیں دیتا، جس وقت اس نے زیورات بنا کر دوکاندار کو دیئے ہوں، بلکہ وہ چھیجت چھوڑ کر باقی سونے کے بدلے میں خالص سونا ایک دو دن کے بعد دینے کا وعدہ کرتا ہے، اس میں دونوں طرف سونا ہے ایک دوکاندار کا زائد سونا ہے جو کاریگر کے پاس ہے اور کاریگر اس کے بدلے میں اپنے پاس سے دوسرا خالص سونا دیتا ہے، اس طریقہ سے سونے کا تبادلہ ہاتھ در ہاتھ نہیں ہوتا، اس میں شرعاً کیا حکم ہے؟

اس مسئلہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ:

(۱) مطلوبہ زیور تیار کرنے کے بعد جو سونا کاریگر کے پاس بچ گیا ہے، دوکاندار کو اختیار ہے کہ وہ اپنی امانت بعینہٖ واپس لے لے یا باہمی رضامندی سے اس کے بدلے خالص سونا لے لے، لیکن خالص سونا لینے کی صورت میں یہ سونے کی سونے سے ہونے والی ''بیع صرف'' جس میں یہ شرط ہے کہ دونوں طرف وزن برابر ہو اور ایک ہی مجلس میں دوکاندار اور کاریگر اپنے اپنے سونے پر قبضہ کرلیں (جس کی صورت یہ ہے کہ کاریگر بچا ہوا سونا مجلس عقد میں لیکر آجائے اور سودا طے ہوتے ہی اس پر دوبارہ قبضہ کرلے اور دوکاندار خالص سونے پر قبضہ کرلے) اگر اس طرح کرنا دشوار ہو تو اس کی متبادل آسان اور جائز صورت یہ ہے کہ بچے ہوئے سونے کے بدلے سونا لینے کے بجائے پیسے لینا طے کرلیں، اس صورت میں جو بھی قیمت باہمی رضامندی سے طے ہو جائے جائز ہے اور اس میں ایک ہی مجلس میں سونے اور پیسوں پر قبضہ ضروری نہیں، بلکہ ان میں سے کسی ایک پر قبضہ کافی ہے۔

فی در المختار (۵:۲۸۹) " ولو اشتری المودع الودیعة الدارهم بدنانیر وافترقاقبل ان یحدد لمودع قبضا فی الودیعة بطل الصرف بخلاف المغصوبة، لان الغصب ینوب عن قبض الشراء بخلاف الودیعة ."

(ب) اس صورت میں کاریگر جو بچے ہوئے سونے کے بدلے میں خالص سونا دینے کا وعدہ کررہا ہے، تو اس وقت بیع نہیں ہے، بلکہ وعدہ بیع ہے جس میں فی الحال دونوں طرف قبضہ ضروری نہیں ہاں جس وقت کاریگر سونا ادا کریگا اس وقت بیع ہوگی، اس وقت دونوں جانب سونے کا برابر ہونا اور ایک ہی مجلس میں دونوں طرف سے قبضہ کرنا ضروری ہوگا۔

یادرہے کہ جس صورت میں کاریگر کو اپنی طرف سے زائد سونا ملانا پڑتا ہے تو اس زائد سونے کے بدلے سونا دینا طے کرنا جائز نہیں ہے (کیوں کہ زائد سونا ملاتے ہی تعاطی کے ذریعہ بیع ہوجائیگی اگر بدلے میں سونا دینا طے ہو تو یہ بیع صرف ہوتی ہے جس میں تقابض شرط ہے اور سونا چونکہ بعد میں دیا جاتا ہے اس لئے جائز ہے) لہٰذا اس زائد سونے کے بدلے پیسے دینا طے کیا جائے اس صورت میں چونکہ جانبین سے قبضہ ضروری نہیں اس لئے بیع جائز ہوگی۔

تیار زیورات کے لین دین میں ادھار کے معاملات

(۱) سونے کے زیورات کے ادھار لین دین میں ایک صورت یہ رائج ہے کہ زیورات کا تاجر یا کاریگر تیار شدہ سادہ اور جڑاؤ زیورات دوکاندار کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے اور عوض میں سونا لینا طے ہوتا ہے، لیکن عوض کا سونا نقد اور ہاتھ در ہاتھ ادا نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک خاص مدت تک کے لئے اس کی ادائیگی کو طے کرلیا جاتا ہے۔

مثلاً ۵ تولے سونے کے وزن کا زیور دوکاندار کو فروخت کیا اور اس کے عوض میں ۵ تولے سونا ایک ہفتہ کے بعد دینا طے ہوا، شرعاً اس کا کیا حکم ہے۔

(۲) بعض مرتبہ بدلے کا سونا طے شدہ مدت پر پورا ادا نہیں کیا جاتا، بلکہ آدھا یا اس سے کم وبیش ادا کیا جاتا ہے، اسطرح مختلف قسطوں میں عوض کے سونے کی ادائیگی ہوتی ہے، ۵ تولہ سونے کے زیورات کے عوض میں ۵ تولہ سونا ایک ہفتہ کے بعد دینا طے پایا، جب کاریگر ایک ہفتہ کے بعد سونا لینے آتا ہے تو دوکاندار اس کو ۲ یا ۳ تولہ سونا اس وقت دے دیتا ہے، باقی مزید ایک ہفتہ کے بعد دیتا ہے۔

اور بعض مرتبہ عوض کا سونا مقررہ مدت پر دوکاندار کاریگر کو نہیں دیتا بلکہ ٹال دیتا ہے اس طرح ہفتوں اسے ٹالتا رہتا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟

اس مسئلہ کا شرعی حکم یہ کہ سونے کے زیورات کو سونے کے بدلے ادھار فروخت کرنا جائز

نہیں، اس میں ضروری ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ ایک ہی مجلس میں زیورات اور سونے کا تبادلہ کریں، اگر ایسا نہیں کریں گے تو اس طرح بیچنا جائز نہیں اس کا آسان حل یہ ہے کہ سونے کے زیورات کو سونے کے بدلے میں فروخت نہ کریں، بلکہ پیسوں کی بدلے فروخت کریں، کیونکہ سونے کے زیورات کی پیسوں کے بدلے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، جبکہ ادھار کی مدت طے ہو، پھر جب رقم کی ادائیگی کا وقت آجائے تو مقررہ پیسے لے لیں یا اس کی بجائے اس دن کے نرخ کے مطابق سونا لے لیں۔

دوسرا حل یہ ہے کہ جب کاریگر دوکاندار کے پاس تیار زیورات لیکر آئے اور دوکاندار کے پاس قیمت ادا کرنے کے لئے سونا نہ ہوتو وہ اس قدر سونا کسی سے قرض لے لے اور اس سونے کے بدلے کاریگر سے زیور خرید لے اور ایک ہی مجلس میں زیورات اور سونے کا تبادلہ کرلیں اور قبضہ کرلیں، پھر دوکاندار بعد میں قرض لیا ہوا سونا ادا کرے۔

(۳) سونے کے زیورات کی خرید وفروخت کا یہ طریقہ کارنا جائز ہے اس کا حل وہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے کہ زیورات پیسوں کے بدلے فروخت کئے جائیں اور ادھار والی قیمت طے کرلیں اور ادھار کی مدت مقرر کرلیں پھر جب وہ مدت آجائے تو چاہے مقررہ رقم لے لیں یا باہمی رضامندی سے اس دن کے نرخ سے اس قیمت کا سونا لے لیں۔

کاریگر کے پاس بچے ہوئے سونے کا حکم

(۱) زیورات بنوانے میں ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ دوکاندار خالص سونا کاریگر کے حوالے کرتا ہے اور ملاوٹ کی شرح بھی بتا دیتا ہے اور مطلوبہ زیورات بنانے کی ہدایت بھی کردیتا ہے اور کاریگر کے پاس جو زائد سونا بچا ہوا ہو وہ واپس نہیں لیا جاتا، بلکہ کاریگر کے پاس ہی رہتا ہے اور نہ ہی دوکاندار کاریگر کو دوسرا خالص سونا دیتا ہے، اس طرح سے دوکاندار اور کاریگر کا یہ لین دین مزید زیور کے لئے مسلسل جاری رہتا ہے، دوکاندار کی طرف سے سونا آتا رہتا ہے اور کاریگر کی طرف سے زیورات تیار ہوکر آتے رہتے ہیں، دوکاندار اور کاریگر دونوں سونے اور زیورات کے لین دین کا باقاعدہ حساب تحریری کرتے رہتے ہیں اور حسب منشاء دو چار ہفتوں میں حساب کتاب ملا لیتے ہیں لیکن بچا ہوا زائد سونا واپس نہیں لیتے اس طرح یہ معاملہ بغیر کسی حد پر ختم ہوئے سالہا سال چلتا رہتا ہے جس میں اکثر دوکاندار کا سونا کاریگر کے پاس ہی رہتا ہے۔

لیکن کبھی کبھار کاریگر کا سونا دوکاندار کی طرف نکلتا ہے اور وہ دوکاندار سے فوری طلب کرتا ہے، دوکاندار عام طور پر کچھ تاخیر سے وہ سونا لوٹا دیتا ہے، اسی طرح جب دوکاندار کا سونا کاریگر کی طرف نکلتا ہے اور دوکاندار اس سے طلب کرتا ہے تو وہ بھی تاخیر سے ادا کرتا ہے اس طرح اس پورے معاملہ میں جانبین کی طرف زائد نکلنے والے سونے کو تاخیر سے لوٹانے کی شرعاً کیا حیثیت ہے جبکہ صورتحال بظاہر سونے کے بدلہ سونے کی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ یہاں بھی سونے کے دوکاندار اور کاریگر کے درمیان جو تبادلہ ہوتا ہے، وہ تحریری حساب میں چھیجت جوڑ کر اور ملاوٹ کے تناسب سے وزن جوڑ کر حساب میں برابر کرلیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً وزن برابر نہیں ہوتا، جیسا کہ اس سے پہلے سوال میں لکھا گیا ہے۔

(۲) اوپر جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ جانبین سے خالص سونا دینے کی ہے اور اگر خالص سونے کے بجائے ملاوٹ شدہ سونا ہی جانبین سے دیا جائے (جبکہ غالب سونا ہو اور ملاوٹ مغلوب ہو) اور باقی صورتحال وہی ہو جو اوپر لکھی گئی ہے تو پھر شرعی حکم کیا ہوگا؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ

(۱) جو سونا کاریگر کے پاس بچا ہے وہ امانت ہے اس کی ادائیگی فی الحال ضروری نہیں، لہٰذا اگر سالہا سال تک وہ سونا کاریگر کے پاس رہے تو یہ جائز ہے، لیکن جب بھی کاریگر بچے ہوئے سونے کے بدلے دوسرا سونا دوکاندار کو ادا کرے گا تو یہ بیع صرف ہوگی، اس میں دونوں طرف سے برابری اور قبضہ ضروری ہے۔

(یعنی کاریگر مجلس بیع میں وہ بچا ہوا سونا حاضر کرے پھر دکاندار کو اپنا سونا دیکر قبضہ کرادے اور خود بھی بچے ہوئے سونے پر قبضہ کرلے، یاد رہے کہ اس صورت میں کاریگر کا سابقہ قبضہ کافی نہیں بلکہ عقد کے وقت تجدید قبض ضروری ہے)

کاریگر کا جو سونا دوکاندار کی طرف نکلتا ہے تو اس کے بارے میں وضاحت گزر گئی کہ اس کے بدلے میں سونا دینا طے کرنا جائز نہیں ہے بلکہ رقم دینا طے کیا جائے رقم طے ہونے کی صورت میں فی الفور ادائیگی ضروری نہیں بلکہ تاخیر بھی جائز ہے اور اگر کاریگر چاہے تو اسی رقم کے بدلے دوکاندار سے بعد میں سونا خرید لے۔

(۲) ملاوٹ شدہ سونے کا وہی حکم ہے جو خالص سونے کا ہے۔

ٹانکے کا شرعی حکم:

زیورات بنانے کے دوران ایک مرحلہ یہ آتا ہے کہ سونے سے بنائے ہوئے سونے کے مختلف ٹکڑوں میں جوڑ کر زیور تیار کرنا ہوتا ہے، انہیں جوڑنے کے لئے ٹانکہ استعمال ہوتا ہے جو ضروری ہے کیونکہ بغیر ٹانکے کے سونے کے زیورات کے یہ مختلف حصے آپس میں نہیں جڑ سکتے مثلاً: زیور میں مختلف پھول، پتیاں الگ الگ بنائی جاتی ہیں، مختلف کنڈے موقع بہ موقع چپکائے جاتے ہیں جیسے مثلاً: چوڑی کے ۲ سرے باہم ملا کر جوڑے جاتے ہیں جس کے لئے ٹانکہ استعمال ہوتا ہے۔

ٹانکہ کی حقیقت اور قسمیں:

ٹانکہ اس سونے یا اس دھات کو کہتے ہیں جو زیور کے سونے سے پہلے پگھل جائے اور دو ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ دے اور اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک ٹانکہ وہ کہلاتا ہے جو سونے سے تیار کیا جاتا ہے، جس میں چاندی اور تانبہ کی ایک خاص مقدار سونے میں شامل کی جاتی ہے مثلاً ایک تولہ سونے میں ۱۰ ماشہ چاندی اور ۶ ماشہ تانبہ ملایا جاتا ہے اس طرح کل دو تولہ ٹانکہ حاصل ہو جاتا ہے، اس قسم میں عموماً آدھی مقدار سونے کی اور آدھی مقدار دوسری دھاتوں کی ہوتی ہے، جیسا کہ مثال سے واضح ہے۔

(۲) دوسری قسم کا ٹانکہ "کاڈمیم" کا ٹانکہ کہلاتا ہے، کاڈمیم ایک خاص قسم کی دھات ہے جس کی تھوڑی سی مقدار سونے میں ملانے سے حسب ضرورت ٹانکہ حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً: ایک تولہ ملاوٹ شدہ سونے میں ڈیڑھ ماشہ کاڈمیم ملایا جاتا ہے اور ٹانکہ بن جاتا ہے، یہ اعلیٰ قسم کا ٹانکہ کہلاتا ہے اس میں کاڈمیم دھات کی ملاوٹ بہت کم ہوتی ہے اور جس قدر ہوتی ہے تیاری کے دوران اس میں سے بھی کچھ مقدار اڑ جاتی ہے اور برائے نام باقی رہتی ہے۔

ٹانکہ کی مروجہ صورتحال

عام طور پر ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ پہلی قسم کا ٹانکہ لگانے کا دستور ہے اس قدر ٹانکہ استعمال کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو، کاریگر اتنی مقدار میں ٹانکہ ہر زیور میں عموماً لگا دیتے ہیں، حالانکہ بعض اوقات ایک تولہ سونے کے زیور میں ۲ تا ۳ رتی ٹانکہ بھی کافی ہوتا ہے مگر پھر بھی تول کر ایک ماشہ ٹانکہ پورا لگا دیا جاتا ہے، اس طرح ایک ماشہ ٹانکہ لگانے اور لگوانے کو معیوب نہیں

سمجھا جاتا، خواہ وہاں ایک ماشہ ٹانکہ سے کم لگانے سے بھی ضرورت پوری ہو جاتی ہو بلکہ اس قدر ٹانکہ لگانا معیار کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔

نیز واضح رہے کہ ایک ماشہ ٹانکہ استعمال کرنے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ زیور بنائی کی اجرت اور چھیجت کے معاملات جو دوکاندار اور کاریگر کے مابین طے ہوتے ہیں ان میں ٹانکہ کا پہلو مدنظر ہوتا ہے۔

کیوں کہ زیور بنانے میں کاریگر کی ایک اجرت ہوتی ہے، دوسرے اس کو ٹانکہ لگانے کی صورت میں سونا بچتا ہے، اب اگر ایک ماشہ سے کم ٹانکہ لگایا، تو اس کو کم سونا بچے گا، جس کے لئے وہ زیادہ اجرت کا مطالبہ کریگا تا کہ اس کی وہ آمدنی مکمل ہو جائے جو اس کو ایک ماشہ ٹانکہ لگانے پر ملتی ہے اور نیز ایک ماشہ سے کم ٹانکہ استعمال کرنے میں ہر ایک زیور کا الگ انداز سے معاملہ کرنا پڑے گا، جس میں بہت سی مشکلات ہوں گی، اس لئے عام طور پر ایک تولہ زیور میں ایک ماشہ ٹانکہ استعمال کرنا رائج ہے۔

اس سلسلے میں سوالات یہ ہیں:

(۱) جب ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ ٹانکہ سے کم کی ضرورت ہو اور کاریگر پورا ایک ماشہ ٹانکہ استعمال کرلے، جب کہ دوکاندار بھی بلاضرورت ایک ماشہ ٹانکہ لگانے پر اس لئے راضی ہے کہ اس کو زیورات بنوانے کی اجرت زیادہ نہ دینی پڑے اور کاریگر اس لئے ضرورت سے زیادہ ٹانکہ لگا رہا ہے کہ زائد ٹانکہ اس کی آمدنی کا ایک حصہ ہے، اس طرح دوکاندار اور کاریگر دونوں دستور کے مطابق بلاضرورت بھی زائد ٹانکہ لگانے پر رضامند ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) ٹانکہ کے استعمال کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ کاریگر ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ ٹانکہ سے زیادہ مقدار میں بلاضرورت ٹانکہ استعمال کرلیتا ہے، محض اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اور پھر وہ اس کو ظاہر بھی نہیں کرتا بلکہ ایک تولہ میں ایک ماشہ ٹانکہ ہی کہہ کر زیورات دیتا ہے، ایسا کرنے کا کیا حکم ہے؟

نیز یہ کہ اگر دوکاندار کاریگر کو ایسا کرنے کے لئے کہے، یا دونوں باہم مل کر اپنی اپنی آمدنی کی خاطر یہ ٹانکہ لگوائیں اور بغیر بتائے فروخت کریں تو کیا حکم ہے؟

(۳) اگر کاریگر دوکاندار کی ہدایت کے خلاف ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ سے

زیادہ ٹانکہ استعمال کرے، مثلاً: ڈیڑھ یا دو ماشہ اور وہ بعد میں کسی وقت اس زیور کی جانچ پڑتال میں ثابت ہو جائے تو اس کا تاوان کاریگر سے لینا دوکاندار کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ

(۱) جب دکاندار ایک تولہ سونا میں ایک ماشہ ٹانکہ لگوانے پر راضی ہے تو کاریگر کو ایک تولہ سونے میں ایک ماشہ ٹانکہ لگانا جائز ہے، البتہ جب دکاندار گاہک کو یہ زیور فروخت کرے تو اسے یہ بتانا چاہیے کہ اس میں ایک ماشہ سونے کی بجائے ایک ماشہ ٹانکہ شامل ہے یہ بتانا چاہے زبانی ہو یا تحریری۔

(۲) یہ سراسر جھوٹ اور دھوکہ ہے جو کاریگر اور دوکاندار دونوں کے لئے حرام ہے البتہ اگر دکاندار اور کاریگر دونوں اس پر راضی ہوں تو ایک ماشہ سے زیادہ مقدار میں ٹانکہ لگانا بھی جائز ہے لیکن گاہک کو فروخت کرتے وقت اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

(۳) بنوائی کے وقت اگر سونے کے وزن کے اعتبار سے معاملہ طے کیا گیا تھا تو اس صورت میں دکاندار کے لئے کاریگر سے تاوان لینا جائز ہے۔

فی الدر المختار :"وضمن بصبغه اصفر وقد امربا حمر قيمة ثوب ابيض وان شاء المالك اخذه واعطاه مازا دالصبغ فيه ولا اجر له. (٦:٤٢) (ماخوذ از جدید تجارت کے شرعی احکام مؤلفہ مفتی کمال الدین صاحب)

کرنسی نوٹوں کا حکم:

کرنسی نوٹ کے متعلق حضرات فقہاءِ کرام کی قدیم تحقیق یہ تھی کہ براہِ راست ثمن نہیں بلکہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سونا اور چاندی جو ثمن خلقی ہیں یہ نوٹ اس کی دستاویز اور سند کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں کرنسی نوٹ کے متعلق جو تحقیق سامنے آئی ہے اس کی رو سے یہ کرنسی نوٹ ثمن ہی ہیں، البتہ ان کو ثمن عرفی کہا جاتا ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ میں ان کی ماہیت اور حقیقت یکسر تبدیل ہوگئی ہے اور سونے چاندی کے ساتھ کرنسی نوٹ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا، اسی طرح ان نوٹوں نے پوری طرح سونے اور چاندی کی جگہ لے لی، یعنی اب یہ نوٹ سونے چاندی کی دستاویز کے طور پر استعمال نہیں ہوتے بلکہ فرضی قوتِ خرید کی نمائندگی کر رہے ہیں اور

حکومت کی طرف سے ہر شخص مجبور ہے کہ ان کو عوض کے طور پر قبول کرے، لہٰذا یہ کرنسی نوٹ عرفاً قانوناً ثمن ہی متصور ہوتے ہیں۔

ملکی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ:

اگر ایک ہی ملک کی کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے یعنی خرید وفروخت تو چونکہ جنس ایک ہی ہے، اس لیے ایک جانب سے مجلس عقد کے اندر قبضہ ضروری ہے تا کہ افتراق دین بدین لازم نہ آئے اور اس میں کمی زیادتی بھی جائز نہیں، اگر کمی بیشی کریں گے تو سود لازم آئے گا جو کہ حرام ہے۔

نئے نوٹ کو زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کا حکم:

بعض لوگ عیدی وغیرہ بانٹنے کے لیے یا کسی اور مقصد کیلئے نئے نوٹ حاصل کرتے ہیں اب جن کے پاس نئے نوٹ ہیں وہ زیادہ رقم وصول کرتے ہیں مثلاً: ہزار روپے کے دس والے نئے نوٹ کو ایک ہزار دس یا بیس روپے میں فروخت کرتے ہیں شرعاً یہ ناجائز ہے کیونکہ قانونی طور پر نئے اور پرانے نوٹوں کی قیمت برابر ہے۔ اس لیے دس بیس روپے جو زائد لیے یہ سود ہوا جو کہ حرام ہے۔

ریز گاری فروخت کرنے کا حکم:

گاڑی والوں کو اسی طرح بعض دکانداروں کو کھلے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ پان کی دکان والوں سے یا کھلے پیسے فروخت کرنے والوں سے زیادہ رقم دے کر سکے خریدتے ہیں، شرعاً یہ خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے کیونکہ قانونی طور پر سکے اور نوٹوں کی قیمت برابر ہے، لہٰذا زائد رقم یعنی مثلاً: دس کا نوٹ دے کر 9 روپے کے سکے وصول کیے تو ایک روپے سکے فروش کے حق میں سود ہوا اس کا استعمال اس کے لیے حرام ہے۔ اسی طرح دینے والا بھی سود دینے کی وجہ سے گناہگار ہوا، بعض لوگ کہتے ہیں کیا کریں راستہ میں ضرورت پڑ جاتی ہے اب سکے کہاں سے لائیں؟ یہ اعتراض فضول ہے کیونکہ اس کا حل یوں نکل سکتا ہے کہ اڈے سے نکلنے سے پہلے ہی اس کا انتظام کرلیا جائے کہ گزشتہ کل جو سکے جمع ہو گئے تھے اگلی صبح کے لیے اس کو محفوظ رکھا جائے۔ صبح صبح اس کو ساتھ لے کر اڈے سے روانہ ہوا جائے۔ البتہ اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ دس روپے کے عوض نو روپے کے سکے اور کوئی معمولی چیز مثلاً: چار آنے والی ٹافی یا چاکلیٹ وغیرہ دیدیں۔ اس

طرح کرنے سے یہ معاملہ جائز ہو جائے گا اور دونوں فریق گناہ سے بچ جائیں گے۔

مختلف ممالک کی کرنسی کی تجارت:

دو ملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں جب دونوں کی جنس مختلف ہے تو ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے اور اس کا کاروبار کرنا بھی جائز ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مجلس عقد میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا متبادل کرنسی پر قبضہ ہو جائے، اگر کسی ایک فریق کا بھی مجلس عقد میں متبادل کرنسی پر قبضہ نہ ہوا بلکہ معاملہ کر کے دونوں فریق بعد میں ادائیگی کے وعدہ پر جدا ہو گئے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں افتراق دین بدین لازم آتا ہے جو کہ حدیث کی رو سے ممنوع ہے:

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله : واذ عدم الوصفان الجنس والمعنىٰ المضموم اليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فيه الاباحة واذا وجد احرم التفاضل والنساء لوجود العلة وإذا وجد احدهما وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النساء. (الهداية على فتح القدير : ١٥٣/٦ باب الربوٰ)

حکومت کی طرف سے غیر ملکی کرنسیوں کے ریٹ مقرر کرنا:

آج کل کرنسیوں کا کاروبار عام ہو گیا ہے اس کے لیے باقاعدہ مارکیٹ وجود میں آ گئی ہے بڑے پیمانے پر یہ کاروبار ہو رہا ہے، اب اس میں حکومت مختلف ممالک کی کرنسیوں کے ریٹ مقرر کر دیتی ہے، لیکن لوگ بلیک مارکیٹ میں حکومتی ریٹ کی بجائے اپنی مرضی سے ریٹ لگا کر خرید و فروخت کرتے ہیں، جو حکومت کے ریٹ سے مختلف ہوتا ہے اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب دونوں کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہوں تو کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے اور اس کمی زیادتی کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں، بلکہ یہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، اب عاقدین جس ریٹ پر متفق ہو جائیں جائز ہے، بشرطیکہ دھوکہ اور فریب نہ ہو۔

لیکن بلیک مارکیٹ میں اس طرح معاملہ کرنا چونکہ اس قانون کی خلاف ورزی ہے جو اجتماعی مفاد کے لیے حکومت کی طرف سے نافذ ہے اس لیے اس خارجی سبب کی وجہ سے بلیک مارکیٹ

میں لین دین کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جائز امور میں حکومتی قوانین کی پابندی واجب ہے، البتہ اس آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

(ماخوذ از فقهی معاملات مع اضافه و ترمیم: ۱۱/ ۴۰)

ہنڈی کے کاروبار کا حکم:

ہنڈی کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ فیروز اللغات میں ہنڈی کی تعریف یہ لکھی ہے کہ وہ رقعہ جو ساہوکار ایک جگہ سے دوسری جگہ روپے دینے کے لیے دیتا ہے، اس وقت دنیا میں یہ کاروبار عام ہوگیا ہے، مثلاً: ایک شخص پاکستان میں ہے وہ اپنے ملک، برما، بنگلا دیش روپے بھیجنا چاہتا ہے لیکن قانونی پیچیدگیوں کی بناء پر بینک کے ذریعہ نہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ وہ یہاں ہنڈی کے کاروبار کرنے والے کو پاکستانی روپے حوالہ کرتا ہے، اس سے ایک تحریر لے کر اپنے رشتہ دار کے نام ارسال کرتا ہے وہ حسبِ وعدہ وہاں ہنڈی کے کاروبار کرنے والے سے رقم وصول کرتا ہے یہ کاروبار خلاف قانون تو ہے کیا خلاف شرع بھی ہے؟ یا شرعاً جائز ہے نیز اس میں ایک تیسرا شخص بھی ہوتا ہے جو رقم بھیجنے والوں کو تلاش کر کے ہنڈی والے تک پہنچاتا ہے اور اپنی دلالی کی اجرت وصول کرتا ہے، اس کا کیا حکم ہے، نیز اس میں کمی زیادتی کے ساتھ خرید وفروخت ہوتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کا جواب دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جو موصول ہوا اس کو بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

بحالات موجودہ نوٹ ثمن عرفی بن چکے ہیں، لہٰذا ایک ملک کے نوٹوں کا دوسرے ملک کے نوٹوں سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا شرعاً جائز ہے۔ یہ تبادلہ ربوا نہیں، البتہ عقد کے وقت یہ ضروری ہے کہ جس مجلس میں تبادلہ ہوا اس میں کم از کم ایک فریق روپے پر قبضہ کر لے، دوسرا فریق چاہے اسی وقت قبضہ کر لے چاہے بعد میں قبضہ کرے تاکہ افتراق عن دین بدین لازم نہ آئے۔

بعد میں قبضہ کرنے کی صورت میں یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ نسیئۃً بیع ہونے کی وجہ سے ربوا ہے، اس لیے کہ نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں، فلوس کی بیع اور تبادلہ میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ عاقدین میں سے ایک جانب فلوس پر قبضہ کر لے دوسری جانب خواہ بعد میں ادا کرے اور کسی بھی جگہ ادا کرے گنجائش ہے اس لیے کہ مبیع اگر ثمن ہو خواہ عرفی ہو خواہ خلقی، اس کا بائع کے پاس موجود ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ وہ مالا یتعین بالتعیین کے قبیل سے ہے، بائع ادائیگی کے وقت جہاں سے چاہے

تلاش کر کے دینے کی قدرت رکھتا ہے، چنانچہ علامہ شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں اور علامہ علاء الدین حصکفی نے درمختار میں اور علامہ شامی نے ردالمحتار میں اس کی گنجائش لکھی ہے ملاحظہ ہو:

وإذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع جائز لان الفلوس الرائجة ثمن كالنقود وقد بينا ان حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشتطر ذلك في الدراهم والدنانير .

(المبسوط : ١٤/ ٢٤)

باع فلوسا بمثلها بدراهم او بدنانير فإن نقد احدهما جاز وان تفرقا بلا قبض احدهما لم يجز كما مر .

(الدرالمختار على هامش ردالمحتار : ٤/١٨٣،١٨٤)

لان مافي الاصل لا يمكن حمله على انه لا يشترط التقابض ولو من احدا الجانبين لانه لا يكون افتراقا عن دين بدين وهو غير صحيح فتعين حمله على انه لا يشترط منهما جميعا بل من احدهما فقط .

(الشامية : ٤/١٨٤)

جہاں تک ایک ملک کے نوٹوں کا دوسرے ملک کے نوٹوں کے ساتھ کمی بیشی سے تبادلہ کرنے کا قانونی تعلق ہے چونکہ ہر شہری نے حکومت سے معاہدہ کیا ہوا ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے قانون کی پابندی اس حد تک کرے گا کہ نصوصِ شرعیہ کی خلاف ورزی لازم نہ آئے اور چونکہ حکومت نے غیر ملکی کرنسی کے بارے میں بذریعہ بنک ایک خاص ریٹ مقرر کیا ہے، لہٰذا اس ریٹ کی خلاف ورزی کر کے کمی بیشی سے تبادلہ قانونی جرم ہے اور قانونی جرم کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا کسی بھی شہری کے لیے جائز نہیں۔

یاد رہے کہ تبادلہ عقد ہے اس عقد میں عاقدین میں سے کسی بھی جانب کو فیس کے نام پر زیادہ وصول کرنا جائز نہیں، البتہ دلال کو ان کی محنت کی اجرت شرعاً دی جاسکتی ہے۔

البتہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ عقد مع الشرط ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، شرط یہ ہے کہ مشتری (ہنڈی کا کاروبار کرنے والا) اس رقم کا عوض

بنگلہ دیش یا برما میں فلاں جگہ پہنچائے گا یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔

نیز اگر اس معاملہ کو قرض قرار دیا جائے تو بھی جائز نہیں اس لیے کہ اس صورت میں یہ ''سفتجہ'' کہ پاکستان میں قرض دینے کے ساتھ بنگلہ دیش میں واپسی کی شرط لگا کر قرض دینے والے نے اسقاط خطر طریق کا نفع حاصل کیا ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ۱۰۵/۷)

حضرت مولانا فتح محمد لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہنڈی اور منی آرڈر ایک سند ہے اس کے ذریعہ آدمی ہر جگہ روپے بھیج سکتا ہے اس کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں جو باہم متعارض ہیں میرے نزدیک اکابرین امت سے اس بارے میں کوئی روایت منقول نہیں ہے۔

سفتجہ جس کی کراہت منقول ہے وہ ہنڈی نہیں ہے، ہنڈی کو غرض بیع یا امانت قرار دے کر فاسد یا مکروہ سمجھنا ایک زبردستی والی بات ہے۔

بلکہ ہنڈی حوالہ ہے جس کے لیے کچھ اجرت متعین کی گئی ہے محتال علیہ یا وکیل کو بعض امورِ متعلقہ کی اجرت لینا جائز ہے، کیونکہ اس کی ممانعت منقول نہیں، لہٰذا کچھ اجرت لی جائے اور جس مقام پر جس وقت دینا شرط طے پا جائے دے دیا جائے۔ اس کی نظیر منقول ہے، جیسے ہبہ بالعوض ابتداءً تبرع ہے لیکن انتہاءً اس کا عوض لیا جاتا ہے، ہنڈی کے حرام ہونے کے دلائل سے صرف نظر کرنا لازم ہے، کیونکہ ایسے دلائل ہرگز قابل تسلیم نہیں جو ہنڈی کے ممنوع اور مکروہ ہونے کے موجب ہوں، تاکہ تجارت میں توسیع اور معاملات میں آسانی پیدا ہو اور اموال کی حفاظت ہو سکے عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچانا اور ان کو تنگی اور حرج سے بچانا ہمیشہ شارع علیہ السلام کا پیش نظر رہا ہے۔ (عطر ہدایہ جدید: ۱۴۵)

کریڈٹ کارڈ کا حکم:

اس دور میں کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ خرید وفروخت عام ہوتی جا رہی ہیں، شرعاً اس کے ذریعے خرید وفروخت کا کیا حکم ہے اس سلسلہ میں دار الافتاء دار العلوم کراچی اور دار الافتاء جامعہ احتشامیہ کراچی کے دو فتاویٰ بعینہٖ نقل کیے جاتے ہیں:

استفتاء:

1- کریڈٹ کارڈ اور ٹریول چیک کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

بینوا توجروا المستفتی: سیف اللہ خالد

جواب:

1- کریڈٹ کارڈ خریدنا اور ان کا استعمال کرنا فی نفسہ تو جائز ہے بشرطیکہ پہلے سے اکاؤنٹ کھلوالیا جائے تاکہ کارڈ جاری کرنے والا ادارہ اپنا قرضہ وہاں سے وصول کرلے اور اگر اکاؤنٹ سے براہِ راست قرضہ منہا کرنے کا فی الحال انتظام نہیں ہے تو پھر اس کی انتہائی احتیاط کرنی چاہیے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کردینی چاہیے تاکہ ان پر سود بہر حال لاگو نہ ہو سکے کیونکہ اس پر سود کا ادا کرنا حرام ہے، ہاں کارڈ جاری کرنے والا ادارہ جو سالانہ فیس وصول کرتا ہے وہ ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ وہ سود کے زمرے میں نہیں آتی۔ (ماخذ البلاغ انگریزی اگست 1994)

2- ٹریولز چیک یعنی سفری چیک کا استعمال جائز ہے اور بینک کو اس کے اس عمل کی انجام دہی پر فیس ادا کرنا درست ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کریڈٹ کارڈ کے متعلق متفرق سوالات:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں:

سوال (1): کریڈٹ کارڈ کا کیا حکم ہے شرعاً اس صورت میں جب کہ پیسے اکاؤنٹ میں موجود ہوں؟

یا

سوال (2): کریڈ کارڈ کا کیا حکم ہے؟ شرعاً اس صورت میں جبکہ پیسے اکاؤنٹ میں موجود نہ ہوں اور پیسے قرض کے طور پر لیے جائیں؟

جواب (1-2): کریڈٹ کارڈ کا خریدنا اور اس کا استعمال کرنا اس صورت میں جبکہ پہلے سے کارڈ ہولڈر کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہو تاکہ کارڈ جاری کرنے والا ادارہ اپنا قرض وہاں سے وصول کرلے تو یہ صورت بلاشبہ جائز ہے۔ اسی طرح اگر پہلے سے اکاؤنٹ بینک کے اندر موجود نہ ہو تو پھر بھی کریڈٹ کارڈ کا خریدنا اس کا استعمال کرنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کردی جائے تاکہ ان پر سود لاگو نہ ہو سکے کیونکہ اس پر سود کا ادا کرنا حرام ہے۔

سوال (3): کریڈٹ کارڈ سے نقدی وصول کرنے کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب (3): کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ نقدی حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں پہلا طریقہ ہاتھ سے وصول کرنا کہ کارڈ ہولڈر بینک والوں کو اپنا کارڈ پیش کرے اور بینک والے کارڈ دیکھ کر نقدی اس کے حوالے کر دیں تو یہ صورت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نقدی جاری کرنے پر کوئی زائد ٹیکس نہ لیا جائے کیونکہ زائد ٹیکس خدمات کی لاگت کے مقابلے میں نہیں بلکہ قرض کے مقابلے میں ہوگا جو کہ خالص سود ہے۔ دوسرا طریقہ مشین کے ذریعے وصول کرنا جس کو ATM کہتے ہیں چونکہ یہ مشینیں بذاتِ خود بہت قیمتی ہوتی ہیں پھر اس کی تنصیب اور حفاظت وغیرہ پر بھی کثیر اخراجات ہوتے ہیں اس لیے ان اخراجات کے تناسب سے کچھ ٹیکس لیا جائے تو اس میں گنجائش ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ ٹیکس قرض کے مقابلے میں نہیں بلکہ اخراجات اور خدمات کے مقابلے میں ہے۔

سوال (4): ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سونا اور چاندی خریدنا جائز ہے یا نہیں اور کیا یہ معاملہ بیع صرف کے حکم میں ہے یا نہیں؟

جواب (2-1): ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سونے چاندی کی فروخت جائز ہے اور یہ معاملہ بیع صرف نہیں کیونکہ اس میں سونے چاندی کی خریداری درحقیقت کرنسی نوٹ کے ذریعہ ہوتی ہے جو کارڈ ہولڈر کے ذمہ دین ہوتا ہے اور وہ اپنے ذمہ کا دین براہ راست ادا کرنے کے بجائے کارڈ جاری کرنے والے ادارے (بینک یا کمپنی) سے وصول کرنے کا تاجر کو حوالہ کرتا کرنسی نوٹ چونکہ خلقۃً ثمن نہیں ہے بلکہ یہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہے اور بیع صرف کے احکام اثمان خلقیہ (سونے، چاندی کے باہمی تبادلے) پر جاری ہوتے ہیں اس لیے مذکورہ کارڈوں کے ذریعہ سونے چاندی کی جو ادھار خرید و فروخت ہوتی ہے وہ جائز ہے اور مجلس عقد میں دونوں طرف سے قبضہ ضروری نہیں بلکہ جانب واحد (خریدار) کا قبضہ جوازِ عقد کے لیے کافی ہے۔

سوال (5): بینک کا کارڈ ہولڈر سے ڈیوٹی وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب (5): بینک کا کارڈ ہولڈر سے ڈیوٹی اور اجرت صول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ اجرت ان خدمات کے مقابلہ میں ہے جو بینک کارڈ ہولڈر کے لیے انجام دیتا ہے مثلاً: بینک کی یہ خدمات ہیں کہ وہ ایک قیمتی کارڈ جاری کرتا ہے جس کی تمام لاگت بینک برداشت کرتا ہے جیسا کہ کارڈ تیار

کرنا، اس پر علامات لگانا، فائلوں کی کارروائی کرنا، ٹیلیفون پر رابطہ کرنا اور دفتری نوعیت کی دوسری خدمات انجام دینا پھر ہر بڑے شہر میں رقم نکلوانے کے لیے مشین نصب کرنا جو کہ بذاتِ خود بہت قیمتی ہے اور پھر ان کا حساب رکھنا تو ظاہر ہے کہ بینک کارڈ ہولڈر سے جو اجرت وصول کرتا ہے وہ مذکورہ بالا خدمات کے مقابلہ میں ہیں اور اس اجرت کا اس قرض سے کوئی تعلق نہیں جو کارڈ ہولڈر کے ذمہ ہوتا ہے۔

سوال (6): بینک کا تاجر سے کمیشن وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب (6): بینک کا تاجر سے بھی کمیشن وصول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ اجرت صرف حوالہ قبول کرنے کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ ان جائز خدمات کے مقابلہ میں ہے جو بینک تاجر کو فراہم کرتا ہے، مثلاً: بینک تاجروں کو یہ خدمات مہیا کرتا ہے کہ وہ ان کو چیکنگ مشین فراہم کرتا ہے اور ان کے لیے فوری جواب دینے کا انتظام کرتا ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے وہ اچھے گاہکوں کو جو حاملین کارڈ ہیں ان کی طرف کھینچ کراتا ہے پھر ان کے دیون (قرض) کو حاملین کارڈ سے وصول کرتا ہے ان تمام کاموں میں محنت اور مشقت ہے تو یہ کمیشن دراصل ان خدمات اور محنت و مشقت کا ہے اس لیے اس کا لینا دینا شرعاً جائز ہے۔

سوال (7): کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں بلوں کی قیمت اگر مقررہ مدت کے اندر ادا نہ کی جائے تو سود لاگو ہوتا ہے تو یہ شرطِ فاسد کیا اس عقد کو باطل کر دے گی یا نہیں؟

جواب (7): واضح رہے کہ کریڈٹ کارڈ ہولڈر کے ساتھ بینک کا جو عقد ہوتا ہے وہ آخر کار قرض کا عقد ہوتا ہے کہ بینک کی جانب سے تاجر کو رقم کی ادائیگی کے وقت بینک کا کریڈٹ ہولڈر کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے اور قرض کے ساتھ سود کی یہ شرط فاسد لگی ہوتی ہے، قرض چونکہ عقودِ تبرع میں سے ہے عقد معاوضہ نہیں ہے اور حنفیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ عقودِ معاوضہ میں شرطِ فاسد لگانا عقد کو فاسد کرتا ہے۔ عقودِ تبرع میں شرط فاسد خود فاسد اور لغو ہو جاتی ہے اور عقد فاسد نہیں ہوتا البتہ اس میں صرف شرط فاسد لگانے کا گناہ رہ جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا مکمل اطمینان کر لے کہ اس شرطِ فاسد پر کبھی بھی عمل نہیں ہوگا اور وہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کر دے گا اور سود کی ادائیگی کی نوبت نہ آنے دے گا تو ان شاء اللہ اس شرط فاسد لگانے کا گناہ بھی نہ ہوگا۔

سوال(8): بینک والے اور کمپنیوں والے کریڈٹ کارڈ کے استعمال کرنے والوں کو انعامات دیتے ہیں اور اسی طرح اپنے گاہکوں کو ترغیبات دیتے ہیں مثلاً: اگر تم اتنی رقم کی خریداری کرو گے تو تم کو یہ چیزیں گفٹ میں ملیں گی تو کیا ان گفٹوں کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب(8): بینک والے اور کمپنیوں والے کارڈ ہولڈر کو جو انعامات دیتے ہیں ان کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ بینک والوں اور کمپنیوں والوں کی حیثیت مال کا قرض دہندہ کی ہوتی ہے اور کارڈ ہولڈر ان اداروں کے لیے مقروض کا درجہ رکھتا ہے، قرض دہندہ اگر اپنے مقروض کو کوئی انعام دے تو اس کا لینا مقروض کے لیے جائز ہے ہاں مقروض اگر قرض دہندہ کو کوئی انعام دے تو وہ سود کے حکم میں ہوتا ہے۔

سوال(9): کریڈٹ کارڈ کا انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں جواب تفصیل کے ساتھ عنایت فرمائیں۔

جواب(9): واضح رہے کہ فی الوقت جتنی بیمہ پالیسیاں رائج ہیں وہ سب کی سب ناجائز ہیں کیونکہ وہ سود اور قمار اور ناجائز شرائط پر مشتمل ہیں اور یہ سب چیزیں شرعاً حرام ہیں اس لیے کریڈٹ کارڈ کا بھی اصل حکم یہی ہے کہ اس کا انشورنس کرانا ناجائز ہے، البتہ اگر قانونی طور پر اگر انشورنس کو لازمی قرار دے دیا جائے اور اشیاء ضرورت خریدنے کے لیے کریڈٹ کارڈ کے علاوہ کوئی متبادل جائز ذریعہ آسانی سے میسر نہ ہو جو انشورنس کی شرط سے آزاد ہو یا انشورنس کروانے کی وجہ سے حکومت کے ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس سے نجات مل سکتی ہو تو مجبوری میں ایک ضرورت کے تحت کریڈٹ کارڈ کی انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی لیکن یہ یاد رہے کہ اس میں اگر نفع کے نام سے کوئی زائد رقم ملتی ہو تو ان حالات میں بھی اس زائد رقم کو لینا جائز نہ ہوگا البتہ اصل رقم جو اقساط کی صورت میں جمع کروائی ہو اس کو وصول کرنا جائز ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ادویات بیچنے کا ڈپلومہ اور لائسنس فروخت کرنا:

مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً زید نے دواؤں کے متعلق کورس پاس کیا ہے اور ڈپلومہ لیا ہے اور حکومت کی طرف سے ڈپلومہ رکھنے والے شخص کو میڈیکل اسٹور کھولنے اور دوائیں فروخت کرنے کا اجازت نامہ ملتا ہے، زید اس اجازت نامہ سے خود فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ کسی دوسرے شخص کو یہ اجازت نامہ دے دیتا ہے جس کے بدلے یکمشت یا ماہانہ ایک مقررہ رقم وصول کرتا ہے، اس

بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ زید کے لیے دوائیں فروخت کرنے کا لائسنس فروخت کرنا اس کے عوض یکمشت یا ماہانہ رقم وصول کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس میں ملکی قوانین کی خلاف ورزی ہے، لہٰذا اجازت نامہ فروخت کرنا یا بلا معاوضہ دینا دونوں درست نہیں۔

نیز دوا فروخت کرنے کا ڈپلومہ کسی خاص تعلیمی صلاحیت کا امتحان پاس کرنے پر دیا جاتا ہے، کسی دوسرے شخص کو جو اس صلاحیت کا حامل نہیں اس کا منتقل کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ ایک طرح کی جھوٹی شہادت بھی ہے۔ (ماخوذ از جدید تجارت بتغیر یسیر)

بل کو کٹوتی کے ساتھ فروخت کرنا:

تاجر لوگ ایک دوسرے کو ادھار پر چیز فروخت کرتے ہیں (مقروض) بائع کو ایک چٹ لکھ دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو رقم دے دوں گا، اب مقروض سے رقم وصول کرنے کی تاریخ چونکہ لمبی ہوتی ہے جبکہ رقم کی فوری ضرورت ہے لہٰذا بائع بینک یا کسی شخص کو یہ چٹ دے کر رقم لیتا ہے، بینک یا وہ شخص اس رقم سے کچھ منہا کر کے مثلاً: دس لاکھ کی رقم اس چٹ پر لکھی ہوئی ہے تو وہ نو لاکھ پچانوے ہزار بائع کے حوالے کرتا ہے تو یہ معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں، کیونکہ اس میں ایک ملک کی کرنسی کی بیع اسی ملک کی کرنسی کے ساتھ ہو رہی ہے، جس میں کٹوتی کی صورت میں کمی زیادتی ہو رہی ہے لہٰذا بل آف ایکسچینج شرعاً جائز نہیں، البتہ اس کی ایک جائز صورت ہو سکتی ہے کہ پہلے حامل چٹ (دستاویز) مثلاً: زید بینک کو دستاویز جاری کرنے والے شخص سے قرض وصول کرنے کا وکیل بنا دے اس وکالت پر زید بینک کو کچھ اجرت دے دے، اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعے زید چٹ پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض حاصل کرے اور بینک کو اختیار دے دے کہ جب میرا قرض اس سے وصول ہو جائے تو اس سے اپنا قرض وصول کر لے، اس طرح دونوں معاملات الگ الگ ہو جائیں گے، پہلا معاملہ، وصولی قرض کے لیے اجرت کے ساتھ وکیل مقرر کرنا دوسرا معاملہ بینک سے قرض لے کر دستاویز میں تحریر شدہ قرض حاصل ہونے پر اس سے اپنا قرض وصول کرنے کا بینک کو اختیار دینا، تو شرعی لحاظ سے یہ دونوں معاملے درست ہوں گے۔

(بحوث فی قضایا وفقهیه: ۲۰)

سود کی حرمت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

صنعتی انقلاب کے اس دور میں سود کو معیشت وتجارت کا ایک لازمی حصہ قرار دے دیا گیا

ہے۔ اہل مغرب کا تو یہ تصور ہے ہی، اب مسلمان تاجروں کا بھی یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ سودی معیشت کی ہزار ہا خرابی کے باوجود تجارت اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ معیشت کو سود سے پاک کرنا ناممکن ہے۔ یہی تو اسلام سے قبل دورِ جاہلیت کے تاجروں کا خیال تھا اور سود در سود ان کے کاروبار کا لازمی جز تھا۔ اسلام نے آ کر جہاں اور مظالم کو ختم کیا وہاں سود کی لعنت کا بھی خاتمہ فرما دیا۔ قرآن و حدیث میں اس پر سخت وعیدیں نازل ہوئیں بلکہ سودی کاروبار کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اعلانِ جنگ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰایها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربوٰ إن کنتم مؤمنین O فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله إن تبتم فلکم رؤس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون O ﴾ (بقرة: ۲۷۸۔ ۲۷۹)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، پھر اگر تم عمل نہیں کرو گے تو اعلانِ جنگ سن لو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے اصل مال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ، نہ تمہارے اوپر کوئی ظلم کرنے پائے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

قوله علیه السلام: لعن الله اکل الربا.

(اخرجه البخاری فی کتاب الاعتصام وفی اللباس ۲۱۷/۷

ومسلم فی المساقاة: ۱۲۱۹/۳)

"جناب نبی کریم ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔"

(مسلم شریف)

اور بخاری کی روایت میں اس کا اضافہ ہے کہ سود پر گواہ بننے والے اور سود کی کتابت کرنے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری)

قوله علیه السلام: "ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه."

سود مہلکات میں داخل ہے:

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

عن ابی ہریرة رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات قال یا رسول اللّٰہ وما ھم؟ قال. الشرك باللّٰہ، والسحر، وقتل النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق، واکل الربا، واکل مال الیتیم. والتولی یوم الزحف، وقذف المحصنت المؤمنات غافلات. (متفق علیہ)

''سات قسم کے مہلکات سے اجتناب کرو۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا یا رسول اللہ ! وہ کون سے ہیں؟ تو ارشاد فرمایا:

1- اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (ذات یا صفات میں)

2- جادو کرنا

3- کسی ایسے نفس کو قتل کرنا جس کا قتل کرنا شرعاً حرام ہو

4- سود کھانا

5- یتیم کا مال کھانا

6- کفار سے مقابلہ کے وقت لڑائی سے منہ موڑنا (یعنی جہاد میں جبکہ کفار کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ نہ ہو، میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ جانا)

7- کسی پاک دامن بھولی بسری عورت پر تہمت لگانا۔ (بخاری ومسلم)

سود زنا سے بدتر ہے:

جناب نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

''سود کا ایک درہم جو آدمی قصداً کھائے وہ چھتیس دفعہ زنا کرنے سے بدتر ہے۔'' (مشکوٰۃ)

سود کی ستر سے زائد برائیاں ہیں:

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

''جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود کے گناہ کے ستر درجات ہیں، سب سے ادنیٰ درجہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے۔'' (مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ سود کا گناہ اتنا بدترین گناہ ہے کہ اس کا ادنیٰ درجہ بھی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دورِ فساد میں بھی کسی غیرت مند انسان کے

لیے اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا تو دور کی بات ہے، کوئی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرے۔ سرکارِ دو جہاں ﷺ نے سود کے گناہ کو اس سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ بہت افسوس کا مقام ہوگا کہ ہم ایسے ارشادات سننے کے بعد بھی سود کے ساتھ چمٹے رہیں۔

سود خور کے پیٹ میں سانپ:

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''شبِ معراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے پیٹ گھڑوں کی مانند بہت بڑے بڑے تھے اور اس کے اندر سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹ کے باہر ہی سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ یہ سود خور ہیں۔'' (مشکوٰۃ)

سود خور جہنم میں:

جناب نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

'' (انسانی جسم کا) جو گوشت حرام مال سے پرورش پایا ہو وہ جہنم کی آگ کے زیادہ لائق ہے۔'' (مشکوٰۃ)

بہر حال سودی کاروبار کرنا اور سودی رقم کو استعمال کرنا اور اس کے فروغ کے لیے کسی قسم کا شریک و معاون بننا، دنیا و آخرت دونوں کے لیے تباہ کن ہے جس کے برے اثرات انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کی زندگی میں مرتب ہوتے ہیں۔ دولت سمٹ کر چند ہی افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر بن جاتا ہے۔ معاشرے سے مساوات ختم ہو جاتی ہے، سود خوروں کے دل میں غریب غرباء کے لیے رحم نہیں ہوتا۔ وہ غریب جو پائی پائی کے لیے ترستا ہے، امیر دولت جمع کرنے کے لالچ اور حرص سے سود کے ذریعے مزید خون چوسنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اپنے کو دیندار کہلانے والے تاجر، رات کو تہجد و ذکر اللہ میں گزارنے والے جب صبح اپنے کارخانے میں پہنچتے ہیں تو انہیں خیال بھی نہیں آتا کہ ہم سود و قمار، جوا، سٹہ، انشورنس وغیرہ میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کو ناراض کر رہے ہیں بلکہ بڑی بے فکری کے ساتھ سودی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ حلال روزی کو چھوڑ کر حرام روزی کماتے ہیں۔ ان حضرات سے درخواست یہ ہے کہ اگر سودی کاروبار کو فوری نہیں چھوڑ سکتے تو کم از کم اس کو گناہِ عظیم سمجھیں اور توبہ کرتے رہیں اور رزقِ حلال کی فکر جاری رکھیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کو ایک مرتبہ برما کے تاجروں نے وعظ ونصیحت کے لیے رنگون آنے کی دعوت دی اور حضرت تشریف لے گئے۔ تقریر شروع فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ آج میں خلافِ معمول ایک بات کہتا ہوں کہ آپ تاجر حضرات ہر ماہ کسی عالم دین کو وعظ کی دعوت دیتے ہیں، وہ آکر آپ حضرات کو تبلیغ کرتے ہیں اور خصوصاً سود کی مذمت کرتے ہیں اور سود کی لعنت سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آج میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ خوب سود کھائیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میری بات سے آپ لوگوں کو تعجب ہو رہا ہو گا۔ پھر حضرت رحمہ اللہ نے خود ہی وضاحت فرمائی کہ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ اتنے علماء کی تقاریر سننے کے باوجود کوئی سود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ حرام طریقے پر تجارت کرتے ہیں، ستم ظریفی یہ ہے کہ خود کو دیندار بھی سمجھتے ہیں۔ اصل وجہ یہی ہے کہ اب تک سود سے دل میں نفرت پیدا نہیں ہوئی ہے، اس لیے دل ملامت نہیں کرتا تو میں کہتا ہوں آپ لوگ دن بھر جو کاروبار کرتے ہیں تو رات کو سوتے وقت اللہ تعالیٰ سے اتنی بات کہہ دیا کریں یا اللہ دن بھر پاخانہ کھاتا رہا، اسی کا حساب کتاب کرتا رہا، اسی کا لین دین کرتا رہا تو معاف فرما جب یہ نسخہ استعمال کریں گے تو سود سے دل میں نفرت پیدا ہو گی اور چھوڑنا بھی آسان ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام مسلمانوں کو دین کی سمجھ عطا فرمائے اور رزقِ حلال نصیب فرمائے۔ حرام خوری سے بچائے اور پورے معاشرے کو سود اور جوئے کی لعنت سے بچائے۔

سود کی تفصیلات:

بہر حال سود خوری، جس کی قرآن وحدیث نے سخت الفاظ میں مذمت فرمائی اور اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، بار بار سود خوری چھوڑنے کا مطالبہ کیا ہے، اس کی بنیادی طور پر تین قسمیں بنتی ہیں:

1- قرض دے کر اس سے زائد وصول کرنا، جس کو ہمارے عرف میں ''مہاجنی'' سود کہا جاتا ہے۔

2- تجارتی سود، خرید وفروخت کاروبار میں لین دین کا ایسا طریقہ اختیار کرنا جو شرعی اصول کے مطابق سودی معاملہ بنتا ہو، جس کو ''انٹرسٹ سود'' کہا جاتا ہے۔

3- بینک ڈیپازٹ بینک کے ذریعہ معاملہ کر کے سود وصول کرنا۔

پہلی دونوں قسمیں تو نزولِ قرآن کے وقت بھی رائج اور متعارف تھیں، قرآن وحدیث میں جو حرمت وارد ہوئی ہے دونوں قسموں کو شامل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ یایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوٰ اضعافا مضعفة واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون ﴾ (آل عمران: ۱۳۰)

یعنی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ حصے سے زائد اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور امید ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔

بقولِ مفسرین اس آیت کا نزول ایام جاہلیت کے خاص طریقہ سودخوری کی مذمت میں ہوا ہے کہ ان کے ہاں عام دستور تھا کہ خاص مدت کے لیے ادھار پر سود پر دیا جاتا تھا جب وہ معیاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دیجاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جاتی تھی، اسی طرح دوسری معیاد پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو سود کی مقدار بڑھادی جاتی ﴿ اضعافا مضعفہ ﴾ اس کی مذمت ہے اسی رسم بد کو مٹانے کا حکم ہے، اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ احل اللّٰہ ابیع وحرم الربوٰ ﴾ (بقرۃ: ۲۷۵)

میں تجارتی سود پر خصوصی طور پر روک لگادی ہے کہ معاملہ کا وہ طریقہ جس میں سود لازم آئے وہ حرام ہے، اس سے اجتناب کرو۔

رسول اللہ ﷺ نے حرمتِ ربوا کا ایک جامع اصول بیان فرمایا:

"الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والتمر بالتمر والشعير بالشعير، والملح بالملح، مثلا بمثل، سواء بسواء، يدا بيد، فمن زاد او استزاد فقد اربى اي دخل في الربا المحرم، الأخذ و المعطي فيه سواء." اخرجه البخاري رقم: ٢١٧٤ و مسلم رقم: ١٥٨٧ والترمذي: ١٢٤٠ وقال حسن صحيح.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض میں یا چاندی کو چاندی کے عوض میں، گندم کو گندم کے عوض میں، کھجور کو کھجور کے عوض میں، جو کو جو کے عوض میں، نمک کو نمک کے عوض میں فروخت کرنا ہو تو (اس کے جواز کے لیے دو شرطیں ہیں)

1- برابر وزن میں فروخت کیا جائے کسی طرف سے کمی زیادتی نہ ہو۔

2- نقد فروخت کیا جائے، ایک طرف یا دونوں طرف سے ادھار نہ ہو، اس میں جس نے زیادہ ادا کیا یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو وہ سود خوری کے حرام طریقہ کا اختیار کرنے والا ہوگا اس میں سود دینے والا اور لینے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ (بخاری و مسلم)

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : والاصل فيه (اي في البيع) الاباحة وإذا وجد احرم التفاضل والنساء لوجود العلة . وإذا وجد احدهما، وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النساء مثل ان يسلم هرويا في هروى او حنطة في شعير، فحرمة ربو الفضل بالوصفين، وحرمة النساء باحدهما . (هداية مع الدراية : ٢/٨٣)

خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے تجارت میں سود ثابت ہونے کے لیے دو چیزوں کو علت قرار دیا ہے:

1- جنس 2- قدر

اب ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض فروخت کرنے میں اگر دونوں وصفیں پائی جائیں تو عوضین کا مساوی ہونا اور نقد ہونا ضروری ہے۔ اگر کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرے یا ادھار فروخت کرے تو دونوں صورتوں میں سود لازم آنے کی وجہ سے حرام ہے اور اگر ایک وصف پائی جائے تو زیادتی حلال ہے، ادھار فروخت کرنا حرام ہے۔

بینکوں میں رقم رکھوانے کا حکم:

بینکوں میں رقم رکھوانے کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

1- سودی کھاتہ (سیونگ اکاؤنٹ)

2- ڈیپازٹس

3- غیر سودی کھاتہ (کرنٹ اکاؤنٹ)

4- لاکر

فکسڈ ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کا حکم:

فکس ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں، اکاؤنٹ ہولڈر کو منافع کے نام سے جو رقم ملتی ہے،

چونکہ یہ بات طے ہے کہ ان اکاؤنٹس میں رکھی جانے والی رقوم بالاتفاق قرض ہوتی ہیں، لہٰذا بینک اکاؤنٹ ہولڈر کو اصلی رقم سے زیادہ جو رقم بھی ادا کرے گا وہ صراحتاً سود ہوگی، جس کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں لہٰذا ان دونوں اکاؤنٹس میں رقم جمع کروانا اور منافع کے نام پر سود وصول کرنا حرام ہے۔

کرنٹ اکاؤنٹ (غیر سودی کھاتہ)

سودی بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں، بعض اس کو ضرورت کے پیش نظر جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسرے بعض حضرات تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیتے ہیں استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اور دارالعلوم کراچی کے دیگر اربابِ فتویٰ کی رائے جواز کی ہے۔

چنانچہ ایک تحریر کے ضمن میں فرماتے ہیں:

جہاں تک سودی بینک کے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے کا تعلق ہے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کر دیا کہ اس ''اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے والے کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا ہے، لہٰذا اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے سے سودی قرض کے معاہدے میں داخل ہونا لازم نہیں آتا، اس حیثیت سے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانا جائز ہونا چاہیے، لیکن بعض علماءِ معاصرین نے اس پر اشکال کیا ہے کہ اگرچہ یہ سودی قرض تو نہیں ہے لیکن اس صورت میں سودی معاملات میں بینک کے ساتھ اعانت تو پائی جارہی ہے، اس لیے کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقم کو بینک منجمد کر کے نہیں رکھ دیتا، بلکہ بینک اس رقم کو بھی سودی قرضوں میں دے کر اس پر نفع حاصل کرتا ہے، لہٰذا رقم رکھوانے والا بینک کے ساتھ سودی معاملات میں معاون بن جائے گا۔

لیکن اس اشکال کو مندرجہ ذیل طریقوں سے دور کرنا ممکن ہے:

1- بینکوں کا یہ معمول ہے کہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی گئی تمام رقموں کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے، بلکہ اس رقم کی ایک بڑی مقدار اپنے پاس اس غرض سے رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے رقم نکلوانے والوں کی طلب کو روزانہ پورا کیا جاسکے اور چونکہ بینک کے اندر تمام رقومات ایک ہی جگہ پر ملی جلی رکھی جاتی ہیں، اس لیے کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر کے لیے یہ یقین کرنا ممکن نہیں

ہے کہ اس کی رقم کسی سودی معاملہ میں لگ چکی ہے۔

2- دوسرے یہ کہ بینک کے پاس رقم لگانے کی بے شمار جگہیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب جگہیں شرعاً ممنوع نہیں ہوتیں بلکہ ان میں بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں خرچ کرنا اور رقم لگانا حرام نہیں ہوتا، لہٰذا کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر کے لیے یقینی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اس کی رقم اس جگہ پر صرف ہوئی ہے جو شرعاً حلال نہیں ہے۔

3- غیر سودی قرض کا معاملہ شرعاً جائز معاملہ ہے اور ''نقود'' کا حکم یہ ہے کہ وہ ''عقودِ صحیحہ'' میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے۔

اور کرنٹ اکاؤنٹ میں جو شخص بھی کوئی رقم رکھواتا ہے تو بینک کو قرض دینے کے نتیجے میں وہ رقم اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، اب بینک اس رقم میں جو کچھ تصرف کرے گا وہ اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت میں تصرف کرنا نہیں ہوگا بلکہ اس کی اپنی ملکیت میں یہ تصرف ہوگا، لہٰذا اس تصرف کو اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔

4- کسی معصیت پر اعانت کرنا اگرچہ حرام ہے، لیکن فقہاءِ کرام نے اس کے کچھ اصول بھی بیان فرمائے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں (اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو ملاحظہ فرمائیں: در مختار مع ردالمحتار : ۲۷۲/۵، تکملہ فتح القدیر : ۱۲۷/۸، شرح المهذب : ۳۹۱/۹، نهاية المحتاج: ۴۵۴/۳، حواشي الشرواني على تحفة المحتاج : ۳۱۷/۴، الفروق للقرافي ۳۳/۲، نيل الاوطار للشوكاني : ۱۵۴/۵)

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے اور ''اعانت'' کے مسئلہ میں جتنی نصوص فقہیہ آئی ہیں ان سب کو اس رسالے میں جمع فرمایا ہے۔ یہ رسالہ ''احکام القرآن'' عربی کی تیسری جلد کا جزء بن کر شائع ہو چکا ہے، اس رسالے کے آخر میں اس مسئلہ کا خلاصہ اس طرح تحریر فرمایا کہ:

" إن الاعانة على المعصية حرام مطلقا بنص القرآن اعنى قوله تعالىٰ: ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ وقوله تعالىٰ: ﴿فلن أكون ظهيرا للمجرمين﴾ ولكن الاعانة حقيقة هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولا يتحقق الابنية الاعانة او التصريح بها او

تعينها في استعمال هذا الشئي بحيث لا يحتمل غير المعصية وما لم تقم المعصية بعينه لم يكن من الاعانة حقيقة بل من التسبب ومن اطلق عليه لفظ الاعانة فقد تجوز لكونه صورة إعانة كما مر من السير الكبير .

ثم السبب ان كان سببا محركا وداعيا الى المعصية فالتسبب فيه حرام كالاعانة على المعصية بنص القرآن كقوله تعالىٰ : ﴿ لا تسبوا الذين يدعون من دون الله ﴾ وقوله تعالىٰ ﴿ فلا تخضعن بالقول ﴾ وقوله تعالىٰ : ﴿ لا تبرجن ﴾ الآية وان لم يكن محركا وداعيا بل موصلا محضا وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به الى احداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من اهل الفتنة وبيع العصير ممن يتخذ خمرا وبيع الامرد ممن يعصى به واجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر او يتخذها كنيسة او بيت نار وامثالها فكله مكروه تحريما بشرط ان يعلم به البائع والاجر من دون تصريح به باللسان فإنه ان لم يعلم كان معذورا وان علم وصرح كان داخلا في الاعانة المحرمة .

وان كان سببا بعيدا بحيث لا يفضي الى المعصية على حالته الموجودة بل يحتاج الى احداث صنعة فيه كبيع الحديد من اهل الفتنة وامثالها، فتكره تنزيها . (احكام القرآن : ٣/ ٧٤)

''اعانت علی المعصیت نص قرآن کی رو سے مطلقاً حرام ہے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان ﴾ ''گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔'' (سورة المائدة : ٢) دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿ فلن اكون ظهيرا للمجرمين ﴾ ''میں کبھی مجرموں کی مدد نہیں کروں گا۔'' (سورة القصص : ١٧) لیکن حقیقت میں ''اعانت'' اس کو کہا جاتا ہے کہ معین یعنی مددگار کے عین فعل سے وہ معصیت قائم ہو، یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یا تو مددگار اعانت کرنے کی نیت بھی کرے یا اعانت کرنے کی تصریح کرے یا اس چیز کے استعمال کو اسی

معصیت کے کام کے لیے اس طرح متعین کرے کہ غیر معصیت میں اس کے استعمال کا احتمال باقی نہ رہے۔ لیکن اگر معصیت معین یعنی مددگار کے عین فعل کے ساتھ قائم نہ ہو تو اس کو حقیقۃً اعانت نہیں کہیں گے بلکہ اس کو معصیت کا ''سبب'' کہیں گے اور جن حضرات نے اس پر ''اعانت'' کے لفظ کا اطلاق کیا ہے انہوں نے مجازاً کہا ہے، اس لیے کہ یہ صورۃً اعانت ہے حقیقۃً اعانت نہیں جیسا کہ ''السیر الکبیر'' کے حوالے سے پیچھے گزر چکا ہے۔

پھر ''سبب'' کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ ''سبب'' معصیت کی طرف محرک اور داعی ہو تو اس کا سبب بننا بھی حرام ہے، جیسا کہ اعانت علی المعصیت جو کہ نص قرآن سے حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ﴾ (سورۃ الانعام: ۱۰۸) یعنی ''ان کو گالی مت دو جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ پھر وہ لوگ ناواقفی سے حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔'' دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿فلا تخضعن بالقول﴾ (الاحزاب: ۳۲) ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا: ﴿ولا تبرجن﴾ (الاحزاب: ۳۳) اور اگر وہ ''سبب'' معصیت کے لیے محرک اور داعی تو نہ ہو بلکہ معصیت تک صرف پہنچانے والا ہو، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس معصیت کے لیے اس لحاظ سے قریب بھی ہو کہ اس کے ذریعہ ''معصیت'' انجام دینے کے لیے فاعل کو کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے، مثلاً: فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا یا مثلاً: شراب بنانے والے کو انگور کا شیرہ فروخت کرنا یا مثلاً: امرد غلام ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو اس کو بدفعلی کے ارادے سے خرید رہا ہو یا مثلاً: ایسے شخص کو مکان کرائے پر دینا جس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ اس مکان میں شراب کی تجارت کرے گا یا اس مکان کو وہ ''کنیسہ'' (یہودیوں کی عبادت گاہ) بنائے گا یا اس مکان کو وہ مجوسیوں کی عبادت گاہ بنائے گا۔ ان تمام صورتوں میں فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا مکروہِ تحریمی ہے، بشرطیکہ بائع کو اور کرائے پر دینے والے کو زبانی تصریح کے بغیر ان باتوں کا علم ہو جائے لیکن اگر بائع اور کرائے پر دینے والے کو ان باتوں کا علم نہ ہو تو اس صورت میں وہ معذور سمجھا جائے گا اور اگر بائع اور آجر کو صراحتاً ان باتوں کا علم تھا اس کے باوجود اس نے بیع کر دی یا کرایہ پر دے دیا تو اس صورت میں بائع اور آجر حرام کام پر اعانت کرنے والے ہو جائیں گے۔

اور اگر وہ سبب قریب نہیں ہے بلکہ سبب بعید ہے کہ موجودہ صورت میں اس سے معصیت

صادر نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے ذریعے معصیت کو انجام دینے کے لیے اس میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی، مثلاً: فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ لوہا فروخت کرنا وغیرہ تو یہ صورت مکروہِ تنزیہی ہے۔

(جواهر الفقه: ٢/٤٥٣،

احکام القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمه الله : ٣/٧٤)

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک اردو کے مقالے میں اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر کے بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

''اگر ''تسبب'' کے مفہوم کو مطلقاً سببیت کے لیے عام رکھا جائے تو شاید دنیا کا کوئی مباح کام بھی مباح اور جائز نہیں رہے گا، مثلاً: زمین سے غلہ اور پھل اُگانے والا اس کا بھی سبب بنتا ہے کہ اس غلہ اور ثمرات سے اعداء اللہ (اللہ تعالیٰ کے دشمنوں) کو نفع پہنچے، کپڑا بننا، مکان بنانا، ظروف اور استعمالی چیزیں بنانا، ان سب میں بھی یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک نیک، اور فاجر ان کو خریدتا ہے اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے اور سبب اس کا ان چیزوں کا بنانے والا ہوتا ہے، اگر اس طرح حرمت کو عام کیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی کام بھی جائز نہ رہے اس لیے ضروری ہے کہ سبب قریب اور بعید کا فرق کیا جائے، سببِ قریب ممنوع اور سببِ بعید مباح ہو۔ مذکورہ مثالیں سب کی سب سببِ بعید کی مثالیں ہیں اس لیے وہ جائز رہیں گی۔

پھر سببِ قریب کی بھی دو قسمیں ہیں:

ایک سببِ جالب و باعث جو گناہ کے لیے محرک ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو صدورِ معصیت کے لیے کوئی اور ظاہری وجہ نہ تھی ایسے سبب کا ارتکاب گویا معصیت ہی کا ارتکاب ہے۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے ''موافقات'' کی جلد اول کے مقدمہ میں ایسے ہی اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ ''ایقاع السبب ایقاع للمسبب'' (یعنی سبب کا ارتکاب مسبب ہی کا ارتکاب ہے) چونکہ ایسے اسباب معصیت کا ارتکاب گویا خود معصیت ہی کا ارتکاب ہے اس لیے معصیت کی نسبت اس شخص کی طرف ہی کی جائے گی جس نے اس کے سبب کا ارتکاب کیا، کسی فاعل مختار کے درمیان میں حائل ہونے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینے والے کے حق میں اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا کہا گیا ہے کیونکہ ایسا تسبب للمعصیۃ بنص قرآن و حدیث خود ایک معصیت ہے۔

سبب قریب کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ سبب قریب تو ہے مگر معصیت کے لیے محرک نہیں ہے بلکہ صدور معصیت کسی دوسرے فاعل کے اپنے فعل سے ہوتا ہے، جیسے "بیع العصیر ممن یتخذ خمرا" یا "اجارة الدار لمن یتعبد فیها للاصنام" وغیرہ، تو یہ بیع اور اجارہ اگرچہ ایک حیثیت سے، معصیت کا سبب قریب مگر بذات خود جالب اور محرک للمعصیۃ نہیں ہیں۔

ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد مشتری اور متأجر کی اعانت علی المعصیۃ ہو تو یہ خود ارتکاب معصیت ہے اور اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہے اور اگر بیچنے والے اور کرایہ پر دینے والے کا یہ مقصد نہ ہو تو پھر دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ بیچنے والے کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ شخص شیرۂ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب بنائے گا، اس صورت میں تو یہ بیع بلا کراہت جائز ہے اور اگر بائع کو معلوم ہو کہ یہ شخص شیرہ انگور سے شراب بنائے گا تو اس صورت میں بیچنا مکروہ ہے۔

پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ وہ مبیع کسی تغیر اور تبدیلی کے بغیر بعینہٖ معصیت میں استعمال ہوتی ہو تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہِ تحریمی ہے، دوسری یہ کہ وہ مبیع کچھ تصرف اور تبدیلی کے بعد معصیت میں استعمال ہو سکے گی تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہِ تنزیہی ہے۔

(جواهر الفقه : ٢ / ٤٦٠، ٤٦٢)

لہٰذا جب مندرجہ بالا بنیاد پر بینک میں رکھی گئی رقوم میں غور کیا تو اس سے یہ بات سامنے آئی کہ کسی شخص کا "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانا سودی معاملات کا ایسا محرک اور سبب نہیں ہے کہ اگر یہ شخص بینک میں رقم نہیں رکھوائے گا تو بینک سودی لین دین کے گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا، لہٰذا ایسا شخص سبب قریب کی قسم ثانی میں داخل ہے اور عام طور پر بینک میں رقم رکھوانے والے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ سودی لین دین میں بینک کی مدد کرے گا بلکہ عام طور پر اپنی رقم کی حفا[ظت] مقصود ہوتی ہے اور پھر رقم رکھوانے والے کو یقینی طور پر یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کی رقم سودی لین دین میں لگائی جائے گی بلکہ اس کا بھی احتمال ہوتا ہے کہ اس کی رقم بینک میں محفوظ رکھی جائے اور اس کا بھی احتمال ہوتا ہے کہ اس کی رقم کسی جائز اور مشروع لین دین میں لگائی جائے، لیکن اگر بالفرض بینک نے اس کی رقم سودی کاروبار میں بھی لگادی ہو تب بھی کرنسی کا اصول یہ ہے کہ وہ جائز عقودِ معاوضہ میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتی، لہٰذا سودی معاملات کو "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رکھی

گئی رقم کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا بلکہ ان معاملات کو اس رقم کی طرف منسوب کیا جائے گا جو اب بینک کی اپنی ملکیت ہوگئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانا مکروہِ تنزیہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج بہت سے جائز معاملات بھی بینکوں کے ساتھ وابستہ ہوچکے ہیں اور ان معاملات کی تکمیل کے لیے انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے۔ چونکہ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کی یہ ضرورت بالکل ظاہر ہے، اس ضرورت کے پیشِ نظر بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کی کراہتِ تنزیہی بھی انشاءاللہ ختم ہوجائے گی۔ (فقهي مقالات ۳/۳٦، ۳۹)

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگرچہ سود لینے کا گناہ نہیں ہے مگر تعاون علی الاثم کا گناہ اس میں بھی ہے۔

لاکرز کا حکم:

لاکر میں جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگرچہ سود لینے اور تعاون علی الاثم کا گناہ نہیں ہے مگر بینک کے حرام پیسے سے بنے ہوئے خانے کے استعمال کا گناہ ہے، مجبوری کے وقت اس میں رقم جمع کرائی جاسکتی ہے، اس میں پہلی دونوں صورتوں کی نسبت گناہ کم ہے، لیکن پھر بھی توبہ و استغفار لازم ہے۔ (احسن الفتاوی ۷/۱٦)

غیر مسلم ممالک میں بینکوں سے سود لینے کا حکم:

غیر مسلم ممالک کے وہ بینک جن کے مالک بھی غیر مسلم ہیں، اس بارے میں موجودہ دور کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ ان بینکوں میں رقم رکھوانا اور اس رقم پر بینک جو منافع دیتا ہے اس کو لینا جائز ہے۔ وہ اپنے قول کی بنیاد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول کو قرار دیتے ہیں:

"یجوز اخذ مال الحربی برضاہ."

یعنی حربی کا مال اس کی رضامندی سے لینا جائز ہے اور یہ کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہوتا۔

لیکن جمہور فقہاء نے بعض علماء کے اس قول کو قبول نہیں کیا حتی کہ متاخرین حنفیہ نے اس قول کے مطابق فتویٰ بھی نہیں دیا ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، دارالحرب میں بھی کفار سے سود لینا عندالجمہور

حرام ہے، ائمہ ثلاثہ اور احناف میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ حرمت کے قائل ہیں، البتہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہ اللہ سے دار الحرب میں سود لینے کا جواز منقول ہے، لیکن دوسرے علماء نے امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کا بھی ایسا مطلب بیان کیا ہے کہ جمہور کے خلاف نہیں رہتا یعنی امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بھی حرام ہے، قرآن کریم میں سودخوروں سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے، حدیث میں بھی سود کے متعلق جس قدر وعیدِ شدید آئی ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شبہ ربو پر بھی جرات نہیں کرسکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

" فدعوا الربوا و الريبة . "

''کنز العمال'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے:

" تركنا تسعة اعشار الحلال خشية الربوا . "

لہٰذا محققین علماء کا فتویٰ ہے، دار الحرب میں بھی غیر مسلموں سے سود لینا حرام ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ۲۰/۷)

علامہ محمد علی صابونی فرماتے ہیں:

الربوا حرام سواء كان مع المسلم او مع غير المسلم، فما يفعله بعض المسلمين، من وضع اموالهم فى النبوك الاوربية أو الامريكية، ثم أخذ فوائد ربوية عليها، بزعمهم أن تلك البلاد . " دار الحرب " لانها بلاد غير الاسلامية انما هو من تزيين الشيطان لهم، لجرهم إلى الوقوع فى المحرم، و استحلال الربا الذى حرمه اللّٰه تعالىٰ .

وهذا الاعتقاد خطا، حسيم، و خطر . فادح، يجر المسلمين إلى مقارنة جريمة الربا، على ظن منهم أن الدين يبيح لهم وما دروا انهم يخالفون تعاليم دينهم صراحةً و جهاراً دون فقه لتعاليمه الرشيده السامية، الى قوله ...... قال ابن قدامة ويحرم الربا فى دار الحرب كتحريمه فى دار الاسلام . "

وعموم الاخبار يقتضى تحريم الربوا، لان ما كان محرما فى دار الاسلام، كان محرما فى دار الحرب، كالربا بين المسلمين و ما

ورد " لا ربا بین اهل الحرب واهل الاسلام خبر مرسل لا تعرف صحته، قال الشافعي هذا لیس ثابت، ولا حجة فیه. "

(المغنی لابن قدامة : ٦/٩٨) (فقه المعاملات : صـ ١٥٧)

قابل غور بات:

یورپی ممالک کے بینکوں میں رقم رکھ کر فوائد حاصل کرنا حرام ہونے کا فتویٰ مندرجہ بالا سطور میں مذکور ہے، البتہ استاذِ محترم حضرت مُفتی محمد تقی عثمانی زید مجد ہم ایک ''مقالہ'' کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''لیکن یہاں ایک بات قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ آج کے موجودہ دور میں عام اسلامی حکومتوں پر مغربی ممالک ہی کا تسلط اور کنٹرول ہے اوران کے کنٹرول کے اہم عوامل میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے مسلم ممالک کی دولت کو یا تو غصب کرلیا ہے یا مسلم ممالک نے ان مغربی ممالک سے جو قرض لیا ہے، اس قرض پر سود کی صورت میں مسلمانوں کا مال حاصل کرلیا ہے، دوسری طرف مسلمانوں نے جو بڑی بھاری رقمیں ان ممالک کے بینکوں میں رکھوائی ہیں، ان رقموں پر بھی ان کا قبضہ ہے اس رقم کو وہ اپنی ضروریات میں خرچ کرتے ہیں، بلکہ اس رقم کو مسلمانوں ہی کے خلاف سیاسی اور جنگی اسکیموں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، لہٰذا مسلمان اپنی رقم پر ملنے والا سود وہاں چھوڑ دیں تو اس کے ذریعہ ان کفار کو تقویت ہوگی، ان حالات کی وجہ سے میرا رجحان اس طرف ہورہا ہے کہ مسلمانوں کے لیے غیر مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے بینکوں سے اپنی رقم پر ملنے والے سود کو وصول کرلینا جائز ہے، لیکن اس رقم کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ بلانیتِ ثواب کسی نیک مصرف میں خرچ کردینا چاہیے، اس طرح جو مسلمان اپنی رقمیں ان بینکوں میں رکھوا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے کام میں ان کافروں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس تعاون میں کمی ہوجائے گی، بہرحال یہ مسئلہ علماء کی خدمت میں پیش ہے، وہ اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ فرمائیں۔ (فقهی معاملات : ٣/٣١)

غیر مسلم مالک کے بینک میں سود چھوڑنا:

بینک کے مالک خواہ مسلم ہوں یا کافر، بہرکیف، بینک میں رقم جمع کرانا جائز نہیں اوراگر کسی نے ناواقفیت یا ضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے بینک میں رقم جمع کرادی تو اس کا سود بینک میں چھوڑنا

جائز نہیں اسلیے کہ بینک میں مختلف لوگوں کی رقوم سے خلافِ شرع حاصل شدہ منافع ارباح فاسدہ ہیں، جو بحکم لقطہ ہیں اور چونکہ ان کا مالک معلوم نہیں، لہٰذا بینک سے سود کی رقم لے کر فقراء پر صدقہ کر دینا واجب ہے۔

وفی الباب الخامس عشر من كراهية الهندية : والسبيل فی المعاصی ردها وذالك ههنا برد الماخوذ أن تمكن من رده بأن عرف صاحبه، وبالتصدق به إن لم يعرفه ليصل اليه نفع ماله إن كان لا يصل إليه عين ماله . (عالمگرية : ٣٤٩/٥)

علاوہ ازیں اس میں سودی کاروبار سے تعاون کا گناہ بھی ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ١٨/٧)

بینک کے سود سے انکم ٹیکس ادا کرنا:

بینک سے ملنے والے سود کو حکومت کی طرف سے عائد کردہ انکم ٹیکس وغیرہ میں ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تاکہ غیر شرعی رقم کے ذریعہ غیر شرعی ٹیکس سے نجات حاصل کی جائے، اس بارے میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بینک سے جو سود ملتا ہے، چونکہ وہ حکومت کے خزانے سے نہیں ملتا اور اس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے اس سے انکم ٹیکس ادا کرنا صحیح نہیں، بلکہ مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

بینک کے چوکیدار کی تنخواہ کا حکم:

جو لوگ بینک میں سودی لین دین کرتے ہیں اس کا حساب وکتاب کرتے ہیں یا سودی معاملہ کرنے میں کسی بھی درجہ میں شریک ہیں ان کی تنخواہ تو حرام ہے، اگر کوئی بینک میں چوکیداری کرے یا کوئی اور ایسا کام کرے جس کا سودی کاروبار سے کوئی تعلق نہ ہو، تو ان کی تنخواہ بھی حرام ہوگی جبکہ ان کا سودی کاروبار سے تعلق نہیں؟ اس بارے میں علماء کی دو رائے ہیں:

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بینک کی رقوم دو قسم کی ہیں، ایک اصل سرمایہ، دوسری منافع یا آمدن اصل سرمایہ میں حلال غالب ہے، اسی وجہ سے بینک میں جمع کردہ رقم واپس لینا جائز ہے اور یہ رقم حلال ہے۔

دوسری قسم بینک کی آمدن ہے، اس میں سود اور دیگر ناجائز منافع کا غلبہ ہے اور عقلاً وعرفاً

قاعدہ یہ ہے کہ ہر قسم کے کاروبار میں ملازمین کی تنخواہوں اور دوسرے مصارف کو آمدن سے متعلق قرار دیا جاتا ہے، مصارف اصل سرمایہ کی بجائے آمدن سے وضع کیے جاتے ہیں اس لے بینک کے ہر قسم کے ملازم کی تنخواہ حرام ہے خواہ سودی کاروبار سے اس کا تعلق بھی نہ ہو۔

(احسن الفتاویٰ بتغیر یسیر)

دوسری طرف بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ بینک ایک کاروباری ادارہ ہے اس میں سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے لہٰذا جولوگ سودی کاروبار کرتے ہیں، کسی بھی درجہ میں ان کا کام سود سے متعلق ہے، ان کی تنخواہ تو حرام ہے، لیکن چوکیدار وغیرہ جو بینک میں حلال کام کرتے ہیں ان کی تنخواہ حلال ہے، اگر چہ یہ قول اوسع ہے اور مبنی بر سہولت ہے تاہم پہلا قول راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ حلال وحرام میں تعارض ہو جائے تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول پہلے گزرا ہے۔

" دعوا الربوا و الريبة ."

یعنی سود کو بھی چھوڑ دو اور جس میں سود کا شبہ ہے اس کو بھی چھوڑ دو، اس لیے بینک کی چوکیداری کی ملازمت بھی اختیار نہ کی جائے۔

حرام مال کے مصارف:

حرام مال سے بچنے اور حلال رزق حاصل کرنے کی قرآن کریم نے مختلف عنوانات سے تاکید فرمائی، ایک آیتِ کریمہ میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو حاصل ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں، تو اس سے اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ صالحہ کا ظہور مشکل ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حلال مال کے لیے کوشش کرے اور حرام مال سے احتراز کرے، لیکن اگر کسی ذریعہ سے مسلمان کے پاس حرام مال آجائے تو اس کا استعمال اس کے لیے جائز نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ حرام مال جہاں سے حاصل کیا ہے وہیں اس کو واپس لوٹا دے۔ یعنی اگر اصل مالک یا اس کا ورثا موجود ہوں اور معلوم بھی ہوں تو مال ان کو واپس کرنا ضروری ہے اور اگر اصل مالک یا اس کے ورثاء موجود نہ ہوں یا معلوم نہ ہوں یا کسی معقول عذر کی وجہ سے یہ مال ان تک پہنچانا مشکل ہو، تو اصل مالک کی طرف سے اس کو صدقہ کرنا ضروری ہے،

اس کا ثواب اصل مالک کو مل جائے گا اور یہ صدقہ مساکین پر کیا جائے۔

ویردونها علی اربابها إن عرفوهم والاتصدقوا بها لإن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه .

(ردالمحتار : ٣٨٥/٦)

والحاصل إن علم ارباب الأموال وجب رده علیهم، والا فإن علم عین الحرام لا یحل له ویتصدق به بنیة صاحبه .

(ردالمحتار : ٩٩/٥)

بینک کی ملازمت:

سود میں خود ملوث اور مبتلا ہونا ہی گناہ نہیں ہے بلکہ اس کے کاروبار میں مدد و معاون ہونا بھی معصیت ہے۔ یوں تو تمام ہی گناہ کے کاموں میں اعانت ناپسندیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ﴾ لیکن خصوصیت سے سود کے متعلق آپ ﷺ کی صراحت موجود ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے:

لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اکل الربوا ومؤکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء .

(صحیح مسلم عن جابر : ٢٧/٢ باب الربا)

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے کاتب نیز گواہوں سبھی پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ وہ سبھی برابر ہیں۔''

یہاں سود کے لکھنے والوں اور گواہوں پر حضور ﷺ کی لعنت سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں آدمی کسی ذمہ دارانہ عہدہ پر فائز ہو یا سودی معاملات لکھنے پڑتے ہوں جائز نہیں، اس لیے کہ ان کی حیثیت ربوا کے کاتبین اور گواہوں کی ہوگئی اور ان کو حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ملعون قرار دیا ہے، بلکہ سود خوروں کے مساوی قرار دیا ہے۔

ہاں! ایسی ذمہ داریاں جن کا تعلق براہِ راست سودی کاروبار سے نہ ہو بلکہ وہ بینک کے دوسرے کام یا اس کی حفاظت پر مامور ہوں، ان کے لیے اس ملازمت کا جاری رکھنا یا حاصل کرنا جائز ہے۔ (ماخوذ جدید فقہی مسائل : ص ٣٨٧)

ماقبل میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کا فتویٰ نقل کر چکے ہیں کہ بینک کے چوکیدار کی تنخواہ بھی حلال نہیں، اس لیے ہر قسم کی ملازمت سے اجتناب کیا جائے۔

مالِ حرام سے مسکین کا کھانا جائز نہیں:

ایک شخص بینک میں ملازم ہے، اس کی بالغ اولاد اگر مسکین ہے تو کیا ان کے لیے والد کی حرام آمدن سے کھانا پہننا جائز ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ

حرام مال واجب التصدق ہے جس میں تملیک مسکین ضروری ہے، اس لیے حرام آمدن والے کے ہاں کھانا مسکین کے لیے بھی جائز نہیں، البتہ وہ مسکین کو مالک بنا دے تو اس کے لیے جائز ہے، مگر تملیک مسکین کے بعد بھی غنی کے لیے جائز نہیں جب تک کہ غنی کو مالک نہ بنائے۔

سوال میں مذکورہ صورت میں یہ تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے کہ والد بالغ اولاد میں سے کسی کو نقد رقم کا مالک بنا دے پھر وہ گھر کے تمام مصارف پر خرچ کرتا رہے، اسی طرح پورا گھرانا حرام خوری سے بچ سکتا ہے۔

فی الباب الخامس عشر من كراهية الهندية : و السبيل فی المعاصی ردها و ذلك ههنا بردا لمأخوذ ان تمكن من رده بأن عرف صاحبه و بالتصدق به ان لم يعرفه ليصل اليه نفع ما له ان كان لا يصل إليه عين ماله . (عالمگيرية : ٥/٣٤٩)

وقال العلامة الحصكفی رحمه الله تعالىٰ : عليه ديون و مظالم جهل اربابها و أيس من عليه ذلك من معرفتهم فعليه التصدق بقدرها من ماله و ان استغرقت جميع ماله . (ردالمحتار : ٣/٢٢٣)

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله تمليكا) فلا يكفی فيها الاطعام الا بطريق التمليك ولو اطعمه عنده ناويا الزكاة لا تكفی .

(ردالمحتار : ٢/٦٢)

قال العلامة الحصكفی رحمه الله تعالىٰ : وطاب لسيده و ان لم يكن مصرفا للصدقة ما ادى اليه من الصدقات فعجز لتبدل الملك و اصله حديث بريرة رضی الله تعالىٰ عنها هی لك صدقة ولنا هدية

کما فی وارث شخص فقیر مات عن صدقة اخذها وارثه الغنی و کما فـی ابـن السبیـل اخـذهـا ثـم وصـل الـی مالہ وھی فی یدہ ای الزکاة و کـفـقـیر استغنی وھی فی یدہ فإنھا تطیب لہ بخلاف فقیر اباح لغنی او ھاشمی عین زکاة اخذھا لا یحل لان الملک لم یتبدل .

قـال الـعـلامة ابـن عـابـدیـن رحمه اللّٰہ تعالیٰ : تحت (قوله لان الـمـلک لـم یتبـدل) لان الـمبـاح لـه یتناوله علی ملک المبیح و نظیرہ الـمشتـری شـراء فـاسـدا إذا ابـاح لغیرہ لا یطیب له ولو ملکه یطیب ھدایة . (ردالمحتار : ٥/٧٢) (احسن الفتاویٰ : ٨/١٣٢)

وضاحت:

اس میں حرام خوری سے بچنے کی جو تدبیر مذکور ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بینک میں نوکری کرتا رہے اور بالغ اولاد میں سے کسی کو مالک بنا کر اس سے کھاتا رہے، بلکہ بینک کی ملازمت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ ملازمت حرام ہے اور ملنے والی تنخواہ بھی حرام ہے اور اگر ناواقفیت کی وجہ سے کسی نے ملازمت اختیار کر لی تو اس سے توبہ کرے اور حتی المقدور کوشش کرنے کے حلال ذریعہ معاش اختیار کرے، جب تک اس کا بندوبست نہ ہو اس وقت تک مذکورہ تدبیر اختیار کرے، البتہ اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ لڑکا بالغ ہو اور مسکین بھی اور اس کو مالک بنا کر دے دیا جائے۔ اگر یہ شرائط نہ پائی جائیں تو یہ تدبیر بھی شرعاً غیر معتبر ہوگی۔

لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کا اجرت یا کمیشن لینا:

جو لوگ باہر سے مال منگواتے ہیں، ان کو کسی بینک میں ایل سی کھلوانی پڑتی ہے، جس کے نتیجے میں بینک اس کے لیے ''لیٹر آف کریڈٹ'' جاری کرتا ہے اور جس میں بینک اس شخص کی ضمانت دیتا ہے اور پھر بینک اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بینک کے لیے اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرنا جائز ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

اس موضوع پر میں نے ڈاکٹر رفیق مصری کی تجاویز کا جائزہ لیا۔ لیکن اس مسئلے میں میرا وہی جواب ہے جو ''سروس چارجز'' کے مسئلے میں عرض کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ کفالت یا ضمانت پر

اجرت لینا شرعاً حرام ہے، میرے علم کے مطابق کسی ایک فقیہ نے بھی اس کو جائز نہیں کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی اجرت ہے جو کسی مال یا عمل کے عوض میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں کفالت کو عقدِ تبرع میں شمار کیا جاتا ہے۔ عقودِ معاوضہ میں شمار نہیں ہوتا اور یہ ایسی واضح بات ہے کہ جس کے لیے دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ "کفیل" کے لیے نفس کفالت پر تو اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر کفیل کو اس کفالت پر کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً: اس کے بارے میں اس کو لکھنا پڑھنا پڑتا ہے اور دوسرے دفتری امور بھی انجام دینے پڑتے ہیں یا مثلاً: کفالت کے سلسلے میں اس کو "مضمون لہٗ" (جس کے لیے ضمانت لی گئی ہے اور "مضمون عنہٗ" جس کی طرف سے ضمانت لی ہے) سے ذاتی طور پر یا خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ کرنا پڑتا ہے' اس قسم کے دفتری امور کو تبرعاً انجام دینا ضروری نہیں، بلکہ کفیل کے لیے مکفول لہ سے یا مکفول عنہ سے ان تمام امور کے انجام دینے پر اجرت مثل کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

آج کل جو بینک کسی کی ضمانت لیتے ہیں تو وہ صرف زبانی ضمانت نہیں لیتے، بلکہ اس ضمانت پر بہت سے دفتری امور بھی انجام دیتے ہیں، مثلاً: خط و کتابت کرنا کاغذات وصول کرنا، پھر ان کو سپرد کرنا، رقم وصول کرنا، پھر اس کو بھیجنا وغیرہ اور ان کاموں کے لیے اسے ملازمین، عملہ، دفتر، عمارت اور دوسری ضروری اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب بینک جو یہ تمام امور انجام دے رہا ہے۔ یہ فری فنڈ میں مفت انجام دینا اس کے لیے واجب نہیں ہے۔ چنانچہ ان امور کی انجام دہی کے لیے بینک کے لیے اپنے گاہکوں سے مناسب اجرت لینا جائز ہے، البتہ نفس ضمانت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اور پھر بینک بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بھی بنتا ہے اور بحیثیتِ دلال یا وکیل کے بہت سے امور انجام دیتا ہے اور شرعاً دلالی اور وکالت پر اجرت لینا جائز ہے۔ لہٰذا ان امور کی ادائیگی میں بھی بینک کے لیے اپنے گاہک سے اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

چنانچہ اب بینک کے لیے گاہک سے دو قسم کی اجرتوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

1- لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کو جو دفتری امور انجام دینے پڑتے ہیں ان امور پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

2- وکالت یا دلالی پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

البتہ بینک اپنے گاہک سے یہ دو قسم کی جو اجرتیں وصول کرے گا، اس میں یہ ضروری ہے کہ وہ اجرت ان کاموں کی اجرت مثل سے زائد نہ ہو، اس لیے کہ اگر یہ اجرت مثل سے زائد ہوگی تو پھر یہ تو نفس ضمان پر اجرت وصول کرنے کا ایک حیلہ بن جائے گا۔

بہر حال، جب بینک کو یہ دو قسم کی اجرتیں حاصل ہو گئیں تو اب نفس ضمان پر اجرت لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔(ماخوذ از فقهي مقالات : ۳ / ۳۰۱ ۔ ۳۰۳)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ درآمد کنندگان کو بینک جو ضمانت فراہم کرتا ہے جس کو لیٹر آف کریڈٹ کہا جاتا ہے، اس پر اجرت لینا جائز نہیں، البتہ لیٹر فراہم کرتے وقت جو دفتری امور انجام دینے پڑتے ہیں ان کی اجرت لینا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ بینک جو رقم اجرت کے نام سے وصول کر رہا ہے وہ ان امور کی اجرت مثل سے زائد نہ ہو۔

جی پی فنڈ پر سود کا مسئلہ:

حکومت سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے ہر ماہ کچھ رقم جبراً وضع کرتی ہے جس کو جی پی فنڈ کہا جاتا ہے، اختتام ملازمت (ریٹائرمنٹ) پر حکومت یہ ساری جمع شدہ رقم ملازم کو اور اس کے انتقال کی صورت میں اس کے ورثاء کو ادا کر دیتی ہے، اس میں سود کے نام سے ایک اضافی رقم بھی ملاتی ہے اب یہ اضافی رقم جو حکومت ادا کرتی ہے اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے کیونکہ سود دو آدمیوں کے درمیان بذریعہ عقد طے ہوتا ہے، جبکہ دونوں طرف سے مال ہو اور ان کا مملوک ہو، مسئلہ مذکورہ میں ملازم سے جو رقم تنخواہ سے وضع کی جاتی ہے وہ ملازم کی ملک نہیں ہوتی، اس لیے کہ ملازم کی تنخواہ ملک میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قبضہ میں ہو:

قال العلامة ابن نجيم : قوله بل بالتعجيل او بشرطه او بالاستيفاء أو بالتمكن اي لا يملك الاجرة الا بواحد من هذه الاربعة. (البحر الرائق : ۷/ ۳۰۰)

چونکہ اس رقم پر ملازم یا اس کے وکیل نے قبضہ نہیں کیا، اس لیے ملازم اس رقم کا مالک نہیں ہوا لہٰذا ملازم کے تصرفات اس میں نافذ نہ ہوں گے، اب حکومت اصل رقم یا سود کے نام پر اضافی رقم

جو کچھ بھی ادا کر رہی ہے، سب اجرت ہی کا حصہ ہے جو حکومت مؤجلاً اکٹھی ادا کر رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جبری پروایڈنٹ فنڈ پر جو سود کے نام سے جو رقم ملتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں بلکہ اجرت (تنخواہ) ہی کا ایک حصہ ہے۔“

(پروایڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ: ص ٤)

جی پی فنڈ پر بیمہ کمپنی یا بینک سے سود لینے کا حکم:

اگر کوئی سرکاری ملازم درخواست دے کر اپنے جی پی فنڈ کی رقم کسی بینک یا بیمہ کمپنی کے حوالہ کر دے تو وہ کمپنی اس کی وکیل بن جائے گی، چونکہ وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے، لہٰذا بیمہ کمپنی یا بینک میں رقم منتقل ہونے کے بعد ملازم اس رقم کا مالک بن جائے گا، اب اس رقم پر جو سود ملے گا وہ شرعاً سود ہی ہے، اس کا استعمال ملازم کے لیے حرام ہے، چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس دوسری صورت کے بارے میں تحریر فرمایا کہ ”اگر بینک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دے تو شرعاً سود ہی ہوگا جس کا لینا ملازم کے لیے قطعاً حرام ہے۔“

(پروایڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ: ص ٢٦)

اختیاری جی پی فنڈ کا حکم:

کوئی ملازم بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے کچھ رقم جی پی فنڈ میں کٹوائے اور پھر اختتامِ ملازمت اصل رقم مع سود وصول کرے شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اصل رقم تو حلال ہے، اس پر حکومت کی طرف سے سود کے نام پر جو اضافی رقم ملے گی، اس میں تشبہ بالربوا ہے آئندہ سود خوری کا ذریعہ بنا لینے کا بھی خطرہ ہے، اس لیے اس سے اجتناب کیا جائے۔

(پروایڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ: ص ٤)

مالِ حرام سے ہدیہ یا دعوت قبول کرنا:

اگر کسی کی آمدن حرام و حلال مخلوط ہو اس کے ہاں دعوت کھانے یا اس سے ہدیہ قبول کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس بارے میں حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے:

اگر حرام مال جدا ممتاز نہ ہو، یعنی خالص حرام یا حلال و حرام مخلوط ہونے کا یقین نہ ہو اور حلال مال زیادہ ہو تو اس سے ہدیہ یا دعوت قبول کرنا جائز ہے۔

اگر حرام زیادہ ہے یا دونوں برابر ہیں یا حرام مال جدا ممتاز ہے تو اسے قبول کرنا جائز نہیں۔

قال فی الھندیۃ اھدی الی رجل شیئا او اضافہ ان کان غالب مالہ من الحلال فلا بأس الا ان یعلم بأنہ حرام فإن کان الغالب ھو الحرام فینبغی ان لا یقبل الھدیۃ ولا یأکل الطعام الا ان یخبرہ بأنہ حلال ورثہ او استقرضہ من رجل کذا فی الینابیع.

وایضا فیھا اکل الربو او کاسب الحرام اھدی الیہ او اضافہ وغالب مالہ حرام لا یقبل ولا یأکل مالم یخبرہ ان ذلک المال اصلہ حلال ورثہ او استقرضہ وإن کان غالب مالہ حلالا لا بأس بقبول ھدیۃ والاکل منہ کذا فی الملتقط. (عالمگیریۃ کتاب الکراھیۃ : ٤)

وفی الاشباہ فی القاعدۃ الثانیۃ من النوع الثانی : إذا اجتمع عند احد مال حرام و حلال فالعبرۃ للغالب ما لم یتبین.

(الاشباہ والنظائر : ۱۴۷/۱)

مال مخلوط کا حکم مذکور اس صورت میں ہے کہ خلط متیقن نہ ہو، اگر خلط کا یقین ہو تو بہر حال حرام ہے خواہ حلال غالب ہو یا مغلوب۔ (احسن الفتاویٰ : ۱۰۳/۸)

البتہ اگر حرام آمدن والا کہیں سے حلال مال قرض لے کر چندہ دے یا کسی کی دعوت کرے یا کسی کو ہدیہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اگر کہیں مشترک کھانے میں حرام مال کو ملالیا جائے تو سب کا کھانا حرام ہو جائے گا، جیسا کہ ایک کلو دودھ میں ایک قطرہ پیشاب ملانے سے سارا دودھ ناپاک ہو جاتا ہے، اس لیے جہاں حرام آمدنی والے کو شریک کرنا پڑے تو یہ حیلہ اختیار کر لیا جائے کہ اس سے کہا جائے کہ کہیں سے حلال رقم قرض لے کر شرکت کریں، نیز قربانی کے جانور میں شرکت کا بھی یہی طریقہ ہے، کہ کہیں سے حلال رقم قرض لے کر شرکت کرے ورنہ سب کی قربانی خراب ہو جائے گی۔

بیمہ

تأمین:

بیمہ بھی آج کل کاروبار کا بڑا حصہ بن گیا ہے، کوئی بھی بڑی تجارت اس سے خالی نہیں ہوتی۔

بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات درپیش ہوتے ہیں کوئی انسان یا ادارہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کردوں گا۔ مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ دوسرے ممالک کی تجارت میں مال بحری جہاز سے روانہ کیا جاتا تھا۔ بحری جہاز ڈوب بھی جاتے تھے اور مال کا نقصان ہوتا تھا۔ بحری جہاز کے نقصان کی تلافی کے لیے ابتداءً بیمہ کا آغاز ہوا۔ علامہ شامیؒ نے بھی ''مستامن'' کے احکام میں ''سوکرہ'' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ جن خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے۔ ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں:

1- تامین الاشیاء: (جنرل انشورنس)

اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ جو شخص کسی سامان کا بیمہ کرانا چاہتا ہے وہ معین شرح سے بیمہ کمپنی کو فیس ادا کرتا رہتا ہے جسے ''پریمیئم'' کہتے ہیں اور چونکہ پریمیئم اکثر قسط وار ادا کیا جاتا ہے، اس لیے عربی میں اسے ''قسط'' کہتے ہیں اور اس چیز کو حادثہ لاحق ہونے کی صورت میں کمپنی اس کی مالی تلافی کردیتی ہے۔ اگر اس سامان کو جس کا بیمہ کرایا گیا تھا کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو بیمہ دار نے جو پریمیئم ادا کیا ہے وہ واپس نہیں ہوتا۔ البتہ حادثے کی صورت میں بیمے کی رقم بیمہ دار کو مل جاتی ہے جس سے وہ اپنے نقصان کی تلافی کرلیتا ہے۔ اس میں جہاز کا بیمہ، گاڑی کا بیمہ، مکان کا بیمہ وغیرہ داخل ہوگئے۔

2- تأمین المسئولیۃ: (تھرڈ پارٹی انشورنس)

جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آسکتی ہے۔ اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لیے بیمہ کرایا جاتا ہے۔ مثلاً: گاڑی روڈ پر لانے سے حادثے کے نتیجے میں کسی دوسرے کا نقصان ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اس صورت میں گاڑی چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہوجائے گا۔ اس کا بیمہ کرالیا جاتا ہے اور حادثے کی وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔ اس کو عموماً (تھرڈ پارٹی انشورنس) کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گاڑی سڑک پر لانے کے لیے یہ انشورنس قانوناً ضروری ہے۔ بعض مغربی ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے سے برف صاف نہ کی اور کوئی شخص اس برف سے پھسل گیا جس سے اس کا جسمانی نقصان ہوا تو وہ گھر والے پر مقدمہ کرکے اس سے بھاری تاوان وصول کرتا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے بھی

گھر کے مالکان بیمہ کرا لیتے ہیں، یہ بھی ''تامین المسئولیۃ'' کی ایک شکل ہے جس میں اگر تاوان دینا پڑے تو بیمہ کمپنی تاوان ادا کرتی ہے۔

-3 تأمین الحیاۃ: (لائف انشورنس)

جس کو (بیمہ زندگی) کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ اگر ایک مخصوص مدت میں بیمہ دار کا انتقال ہو گیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر ہوتی ہے، اس مدت میں انتقال ہو گیا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جائے گی، اگر اس مدت میں انتقال نہ ہوا تو مدت ختم ہونے سے بیمہ ختم ہو جاتا ہے اور رقم مع سود کے واپس مل جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر نہیں ہوتی جب بھی انتقال ہو گا تو بیمہ کی رقم ورثہ کو مل جاتی ہے۔

''تأمین الاشیاء'' اور ''تأمین الحیاۃ'' میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ''تأمین الاشیاء'' کی صورت میں وہ خطرہ پیش نہ آئے تو جو قسطیں (پریمیئم) ادا کی تھیں وہ رقم واپس نہیں ملتی ہے اور ''تأمین الحیاۃ'' میں معینہ مدت میں وفات نہ ہونے کی صورت میں دی ہوئی رقم بمعہ سود واپس مل جاتی ہے۔

بیمہ کی طریق کار اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے تین قسمیں اور ہیں:

-1 التامین الاجتماعی:

حکومت کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس میں افراد کے کسی مجموعہ کو اپنے کسی نقصان کی تلافی یا کسی فائدے کے حصول کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اسے ''گروپ انشورنس'' کہتے ہیں، مثلاً: ملازمین کی تنخواہوں سے تھوڑی سی مقدار ہر ماہ کاٹ کر اسے ایک فنڈ میں جمع کر لیا جاتا ہے، پھر ملازم کی وفات یا کسی حادثے کی صورت میں بھاری رقمیں ورثاء کو یا خود ملازم کو ادا کی جاتی ہیں، اس کی بے شمار صورتیں ہیں ان تمام پر ایک اجمالی حکم لگانا مشکل ہے، ہر صورت کا حکم الگ ہو گا۔

-2 التامین التبادلی یا التامین التعاونی: (میوچل انشورنس)

اس کو انگریزی میں (Mutual Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ میں سے اس کے نقصان کی تلافی کی

جائے گی۔ اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوتی ہے اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے۔ سال کے بعد حساب کرلیا جاتا ہے، اگر ادا کیے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لیے فنڈ میں حصہ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

ابتداء بیمے کی یہی شکل چلی تھی اور شرعاً اس میں کوئی اشکال نہیں اور جتنے علماء نے بیمے پر گفتگو کی ہے وہ اس کے جواز پر متفق ہیں۔

3- التامین التجاری یا التامین بقسط ثابت: (کمرشل انشورنس)

جس کو انگریزی میں (Commecrical Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے، اس کمپنی کا مقصد بیمے کو بطورِ تجارت کے اختیار کرنا ہوتا ہے اور اس کا اصل مقصد بیمے کے ذریعے سے نفع کمانا ہوتا ہے جیسے دوسری کمپنیاں مختلف کاروبار سے نفع کماتی ہیں۔ یہ کمپنی مختلف قسم کے بیمے کی اسکیمیں جاری کرتی ہیں۔ جو بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کے ساتھ بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں گے اور نقصان کی صورت میں کمپنی آپ کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ کمپنی قسطوں کا تعین کرنے کے لیے حساب کر لیتی ہے کہ جس خطرے کے خلاف بیمہ ہوا ہے وہ کتنی بار متوقع ہے تا کہ ان کے معاوضات ادا کر کے کمپنی کو نفع بچ سکے۔ اس حساب کے لیے ایک مستقل فن ہے جس کے ماہر کو ''ایکچوری'' کہتے ہیں۔

بیمے کی اسی قسم کا رواج زیادہ ہے اور اسی کا شرعی حکم علماء معاصرین میں زیادہ محل بحث بنا ہے۔ اس کے بارے میں علماء عرب میں سے شیخ ابو زہرۃ اور مصطفیٰ الزرقاء کا شدید اختلاف رہا ہے۔ شیخ ابو زہرہ اس کی حرمت کے قائل تھے اور مصطفیٰ الزرقا اس کے جواز کے قائل تھے۔ اس وقت عالم اسلام کے تقریباً تمام مشاہیر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں، البتہ مشاہیر میں سے صرف دو عالم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ایک شیخ مصطفیٰ زرقاء اور دوسرے شیخ علی الخفیف۔

جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربوا بھی۔ قمار اس لیے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے۔ جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے۔ اسی کو قمار کہتے ہیں اور ربوا اس طرح کہ

یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے، البتہ تامین الحیاۃ (بیمہ زندگی) میں قمار نہیں، اس لیے کہ وہاں رقم واپس مل جاتی ہے، مگر ربوا اور غرر ہے، ربو تو ظاہر ہے، غرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان عقد (ثمن، مبیع یا اجل) میں سے کسی چیز کا مجہول ہونا یا کسی مجہول اور غیر معین واقعہ پر موقوف ہونا، یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کہ کتنی رقم واپس ہوگی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رقم دی گئی تھی وہی بمعہ سود کے واپس ملے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے۔

(ماخوذ از جدید معیشت و تجارت)

بیمہ زندگی حرام ہونے کی وجوہات:

بیمہ کی مختلف اقسام ہیں ان میں سے زندگی کا بیمہ ناجائز ہونے کی یہ وجوہ ہیں:

1- جو رقم بالاقساط ادا کی جاتی ہے وہ بیمہ کمپنی کے ذمہ قرض ہے اور اس پر جو زائد رقم ملتی ہے جس کو منافع سے تعبیر کرتے ہیں وہ سود ہے، کل قرض جو نفعا فھو ربوا.

اس لیے زندگی کا بیمہ قطعاً ناجائز ہے۔

2- بیمہ کا کاروبار مشروط بالشرط ہوتا ہے اور قرض مشروط حرام ہے۔

قال الامام طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله تعالیٰ: وفی کفالة الاصل فی الباب الاخیر القرض بالشرط حرام والشرط لیس بلازم. (خلاصة الفتاویٰ: ۳/ ۵٤)

3- بیمہ مؤجل ہوتا ہے اور قرض میں تاجیل صحیح نہیں

قال الإمام المرغینانی رحمه الله تعالیٰ: فان تأجیله لا یصح (إلی قوله) وعلی اعتبار الانتهاء لا یصح لانه یصیر بیع الدراهم بالدراهم نسیئة وهو ربوا. (هدایة ۳/ ۷٦)

4- کمپنی والے اس رقم سے لوگوں کے ساتھ سودی معاملہ کرتے ہیں تو بیمہ کرنے میں گناہ پر تعاون ہوگا۔

قال الله تعالیٰ: ﴿ وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان ﴾

علاج کے لیے بیمہ کا حکم:

سوال: امریکہ میں میڈیکل (علاج معالجہ) کی سہولتیں پرائیوٹ اداروں کے سپرد ہیں، حکومت وقت کی طرف سے لوگوں کے علاج کے لیے ہسپتال وغیرہ کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے، حکومت کا کہنا ہے کہ مریض کو چونکہ اچھے سے اچھے علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور پرائیویٹ ادارے زیادہ خوش اسلوبی سے علاج معالجہ کی سہولتیں بہم پہنچا سکتے ہیں، عام لوگوں نے علاج کے لیے پرائیویٹ کمپنیوں سے انشورنس (بیمہ) کرایا ہوتا ہے، ضرورت پڑنے پر مریض کے تمام اخراجات انشورنس کمپنی ہسپتال کو ادا کردیتی ہے، انشورنس کمپنی بیمہ کرانے والے سے ماہانہ کچھ رقم وصول کرتی ہے، کیا امریکہ جیسے ماحول اور صورت حال میں اس مقصد کے لیے انشورنس کروانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مقصد کے لیے بھی بیمہ کرنا جائز نہیں بلکہ عام طریقہ یعنی علاج کے بعد رقم ادا کرنا اس پر عمل کیا جائے۔

گاڑی کا بیمہ:

سوال: امریکہ میں ہر گاڑی رکھنے والا شخص قانونی طور پر اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی کار کے لیے کم از کم ضرور انشورنس کرائے کہ اگر کبھی کار کا حادثہ ہوا اور حادثہ میں اس کی غلطی ہوئی تو وہ دوسرے شخص کی کار کے نقصان اور متاثرہ لوگوں کے علاج کا پورا ذمہ دار ہوگا اور اپنی انشورنس کمپنی کی مدد سے دوسرے کا پورا نقصان ادا کرے گا، کیا اس صورت میں ضرورت کے تحت کار کا انشورنس جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: چونکہ گاڑی کے مالک کی طرف سے بیمہ کا معاہدہ بطیبِ خاطر نہیں بلکہ حکومت کی طرف سے یکطرفہ جبر وظلم ہے، لہٰذا بوقتِ ضرورت گنجائش ہے، لیکن بصورتِ حادثہ جمع کردہ رقم سے زائد واجب التصدق ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۲۵)

انشورنس کمپنی کی ملازمت کا حکم:

بیمہ کی جو موجودہ صورتیں رائج ہیں، وہ شرعی نقطہ نگاہ سے صحیح نہیں ہیں، بلکہ سود اور جوا کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں، اس لیے اپنے اختیار سے بیمہ کرانا جائز نہیں ہے اور اس ادارہ میں ملازمت اختیار کرنا بھی جائز نہیں، اگر کوئی غلطی اور ناواقفیت کی وجہ سے ایسے ادارہ میں ملازمت اختیار کرلے تو اس پر لازم ہے کہ فوری طور پر کوئی حلال ذریعہ معاش کا بندوبست کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی

کرتے رہیں کہ اس حرام خوری کی لعنت سے نجات عطا فرمائے، جب کوئی حلال ذریعہ میسر آجائے تو فوراً چھوڑ دیں اس وقت تک اپنے آپ کو گناہگار سمجھتے ہوئے استغفار کرتے رہیں۔

رشوت کی تعریف اور احکام

رشوت کی تعریف:

رشوت بکسر راء، وہ مال جو اپنے موافق فیصلہ کروانے کے لیے دیا جائے۔

حضرت ابن عطیہ نے رشوت کی جامع تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

اخذ الاموال علی فعل ما یجب علی الاخذ فعله او فعل ما یجب علیه ترکه.

(تفسیر بحر محیط: ٤/٥٣٣، دستور العلماء: ٢/١٣٦)

یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے، اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے۔

رشوت کی جائز و ناجائز صورتیں:

سوال: آج کل ہر طرف رشوت کا بازار گرم ہے، کئی مواقع ایسے آتے ہیں کہ شریف آدمی بھی رشوت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، جواز و عدم جواز کے مواقع معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشانی ہوتی ہے اور بسا اوقات خاصا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

اس لیے کوئی ایسا جامع ضابطہ بیان فرما دیں جسے سامنے رکھ کر ہر موقع کا حکم معلوم ہو جائے تاکہ احکام شرعیہ کی پابندی اور نافرمانی سے بچنے کا اہتمام کیا جا سکے۔ حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

رشوت لینے دینے کی مختلف صورتیں ہیں، ہر ایک کا حکم لکھا جاتا ہے:

1- حکومت سے قضاء یا اس جیسا کوئی منصب حاصل کرنے کے لیے
2- حاکم سے کوئی فیصلہ کروانے کے لیے
3- اعانت علی الظلم کے لیے

ان تینوں صورتوں میں رشوت لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی۔

حاکم سے منع حق کا خطرہ ہو تو اس کو دفع ظلم کے لیے رشوت دینا بھی جائز نہیں، اس لیے کہ اس سے حاکم کی عادت بگڑے گی جو پوری قوم پر ظلم کا باعث بنے گی۔

فهذا داخل في قاعدة: "ان الضرر الخاص يتحمل لدفع الضرر العام."

4- جس سے ضرر کا اندیشہ ہو اسے رشوت دینا جائز ہے، اس کیلئے لینا حرام ہے۔

5- دفع مضرت یا جلب منفعت کے لیے درمیان میں واسطہ بننے والے یعنی صرف سفارش کرنے والے کو رشوت دینا جائز ہے، آخذ کے لیے لینا جائز نہیں، البتہ اگر درمیانی واسطہ کے ذمہ کوئی کام لگایا جائے تو اس کے لیے اس کام کی اجرت لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ یہ کام کرنے پر بنفس خود قادر ہو، قادر بقدرت غیر کا اعتبار نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: وفى الفتح الرشوة اربعة اقسام منها ما هو حرام على الاخذ والمعطى وهو الرشوة على تقليد القضاء والامارة الثانى ارتشاء القاضى ليحكم وهو كذلك ولو القضاء بحق لانه واجب عليه الثالث اخذ المال ليسوى امره عند السلطان دفعا للضرر او جلبا للنفع وهو حرام على الاخذ فقط وحيلة حلها ان يستأجره يوما الى الليل او يومين فتصير منافعه مملوكة ثم يستعمله فى الذهاب الى السلطان للامر الفلانى وفى الاقضية قسم الهدية وجعل هذا من اقسامها فقال حلال من الجانبين كالهداء للتودد وحرام منهما كالاهداء ليعينه على الظلم وحرام على الاخذ فقط وهوان يهدى ليكف عنه الظلم والحيلة ان يستأجره الخ قال اي فى الاقضية هذا إذا كان فيه شرط اما إذا كان بلا شرط لكن يعلم يقيناً انه انما يهدى ليعينه عند السلطان فمشايخنا على انه لا بأس به ولو قضى حاجته بلا شرط ولا طمع فاهدى اليه بعد ذلك فهو حلال لا بأس به وما نقل عن ابن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه من كراهيته فورع الرابع ما يدفع من دفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه او

ما له حلال للدافع حرام على الاخذ لان دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز اخذ المال ليفعل الواجب اهـ ما في الفتح ملخصا .

(ردالمحتار : ٣٠٣/٤) (ماخوذ از أحسن الفتاویٰ)

رشوت دے کر نوکری حاصل کرنا:

بعض لوگ رشوت دے کر نوکری حاصل کرتے ہیں، جبکہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، لیکن بعض آدمی رشوت دینے پر مجبور ہوتے ہیں اس کے بغیر نوکری کا حصول مشکل ہو جاتا ہے، سرکاری افسران رکاوٹ ڈالتے ہیں، ایسی صورت میں دفع ظلم کے لیے رشوت دی جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں فرمائیں گے، باقی رشوت دے کر جو نوکری حاصل کی گئی ہو اس کی تنخواہ کا حکم یہ ہے کہ اگر اس ملازم میں کام کی اہلیت موجود ہے اور جو کام اس کے سپرد کیا گیا اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے تو اس کی تنخواہ حلال ہے اگر وہ اس کام کا اہل ہی نہیں، یا کام ٹھیک انجام نہیں دیتا تو تنخواہ حلال نہیں ہوگی۔

مالِ حرام اور مخلوط مال سے نفع حاصل کرنے کا حکم:

جو مال حلال اور حرام سے اس طرح مخلوط ہو کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو تو ایسی صورت میں خلط کرنے والا تمام مال کا مالک بن جاتا ہے، البتہ جتنا مال حرام کا ہے اس کا ضمان ادا کرنا اس پر واجب ہے۔ جب تک اس کا ضمان ادا نہ کرے یا ضمان کو اپنے ذمہ لازم نہ کر لے اس وقت تک اس مال مخلوط میں کسی قسم کا تصرف کرنا اور اس سے کسی طرح بھی نفع اٹھانا جائز نہیں اور جو مال خالص حرام ہے اس کا حکم بھی بطریق اولیٰ یہی ہے۔

اور اگر کوئی شخص اس غالب حرام والے مخلوط مال یا خالص حرام مال کے ذریعہ کاروبار کر کے نفع حاصل کرتا ہے تو وہ نفع چونکہ اس کے لیے حلال نہیں ہے اس لیے اس نفع کو اصل رقم کے ساتھ اصل مالک یا اس کے ورثاء کو لوٹانا ضروری ہے، اصل مالک یا اس کے ورثاء کے موجود نہ ہونے یا نہ ملنے کی صورت میں اس کی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہے، للخبث فیہ.

اور اگر مخلوط مال کی اکثریت حلال ہو تو پھر اس میں تصرف کرنا اور کاروبار کر کے نفع اٹھانا جائز ہے اور اس کے ذریعے کاروبار کر کے اگر کچھ آمدنی حاصل کی ہے تو وہ بھی حلال ہے، تاہم جس قدر مال حرام کا شامل ہوا ہے وہ اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے معلوم نہ ہونے کی صورت میں

صدقہ کرنا ہوگا اور جس قدر اس حرام مال میں نفع ہوا ہے اس نفع کو صدقہ کرنا بھی لازم ہے، مثلاً: دس فیصد حرام مال شامل تھا تو نفع کا دس فیصد صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

قرض کے احکام اور اس کی تفصیلات

قرض کی تعریف:

هو المال الذي يدفعه الشخص الى غيره، ليرده مثله، عند قدرته فانه على سداد الدين .

یعنی قرض وہ مال ہے جو ایک شخص دوسرے کو دیتا ہے، تاکہ قدرت حاصل ہوتے وقت اس کی مثل واپس کرے۔

قرض کے فضائل:

کسی کو قرض دینا بہت ثواب کا کام ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واقرضوا الله قرضا حسنا ﴾

بلکہ دوسرے کے فائدہ کے لیے بھی نیک کام کیا جائے وہ بھی قرضۂ حسنہ کے اندر داخل ہے:

قوله عليه السلام : من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا، نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة .

(اخرجه مسلم : ٤/ ٢٠٧٤)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کی ایک دنیوی حاجت پوری کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے اخروی حوائج پورے فرمائیں گے۔ (مسلم، ترمذی)

وقوله عليه السلام : من اخذ اموال الناس يريد اداء ها ادى الله عنه اي يسر عليه سدادا دينه ، ومن اخذها يريد اتلافها اتلفه الله .

(اخرجه البخاری)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی سے قرض لیا ادائیگی کے ارادہ سے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے قرض کی ادائیگی کو آسان بنا دیتا ہے اور جس نے قرض لیا دبا لینے کی نیت سے۔ اللہ

تعالی اس کو تلف فرماتا ہے یعنی اس کے لیے آئندہ آسانی کا معاملہ نہیں فرماتے بلکہ اس کو مزید تنگی میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔ (بخاری)

قرض کی ادائیگی میں جلدی کرنے کا حکم:

اگر کسی کے ذمہ دوسرے کا قرض ہو تو قرض کو جلد ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

كما روي أن رجلا سال رسول الله صلى الله عليه و سلم أخ له مات وعليه دين، فقال له صلى الله عليه و سلم : هو محبوس بدينه فاقض عنه . (اخرجه احمد فى المسند)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے ایک بھائی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کے ذمہ دوسرے کا قرض ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اپنے قرض کی وجہ سے قید میں ہے، لہٰذا اس کی طرف سے قرض ادا کردو۔ (مسند احمد)

بھائی کی طرف سے قرض ادا کرنے کا حکم:

اس حدیث میں جو حکم دیا گیا ہے اگر مرنے والے نے مال چھوڑا ہو تو ورثاء کے ذمہ قرض کا ادا کرنا لازم ہے اور اگر مال نہ چھوڑا ہو تو یہ حکم استحبابی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا مقروض کا جنازہ پڑھانے سے انکار فرمانا:

عن أبي سلمة قال : كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يصلي على رجل مات وعليه دين، فاتي بميت فقال : أعليه دين ؟ قالوا نعم ديناران، فقال صلوا على صاحبكم فقال ابو قتادة الانصاري: هما عليّ يا رسول الله، فصلى عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم. (اخرجه البخاری و مسلم والترمذی)

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مقروض اگر قرض کی ادائیگی کے لیے مال چھوڑے بغیر مر جاتا تو رسول اللہ ﷺ اس کا جنازہ نہیں پڑھاتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک میت کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے پوچھا کیا اس کے ذمہ قرض ہے؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! دو دینار (دو اشرفی) ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ساتھی پر خود ہی جنازہ پڑھ لو، اتنے میں ابو قتادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) اس قرض کی ادائیگی کو میں

اپنے ذمہ لیتا ہوں، پھر آپ نے جنازہ پڑھایا۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

شہید اور قرض:

عن حارث بن ربعي أن رجلا قال يا رسول الله ! اريت إن قتلت في سبيل الله، نكفر عني خطا يائ فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم نعم إذا قتلت في سبيل الله، وانت صابر محتسب، أي تطلب الاجر من الله، مقبل غير مدبر، الا الدين، فإن جبرائيل قال لي ذالك .

(اخرجه مسلم، رقم : ١٨٨٥)

حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! اگر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیا جاؤں تو کیا یہ شہادت میری خطاؤں کا کفارہ ہو جائیگی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، جب تو ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید کے ساتھ لڑے اور لڑائی میں دشمن کو پیٹھ دکھانے کی بجائے سینہ سپر ہو، سوائے اس کے تیرے ذمہ کسی کا قرض ہو، تو قرض کے گناہ کو شہادت بھی نہیں مٹا سکتی، یہ بات جبرائیل علیہ السلام نے مجھے بتائی ہے۔ (مسلم)

مقروض کو مہلت دینے کی فضیلت:

تو جس طرح مقروض کے لیے حکم ہے کہ قرض کی ادائیگی میں جلدی کرے، وسعت ہوتے ہوئے تاخیر نہ کرے، ایسے ہی دائن (قرض دینے والے) کو بھی شریعت نے حکم دیا ہے کہ مقروض کو مہلت دے قرض کے مطالبہ میں نرمی سے کام لے۔

قوله تعالىٰ : ﴿ وإن كان ذو عسرة فنظرة الى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون ﴾ (بقرة : آيت ٢٨٠)

اگر (مقروض) تنگدست ہے تو مہلت دینی چاہیے وسعت پیدا ہونے تک اور معاف کر دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم کو سمجھ ہو۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من انظر معسرا أو وضع عنه اظله الله في ظله . (أخرجه مسلم : ٣٠٠٦)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی تنگدست محتاج کو (دین کی ادائیگی میں) مہلت

دے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز عرش کے سایہ میں جگہ دے گا۔ (مسلم)

قرض کے لیے مثلی ہونا شرط ہے:

قرض کے جواز کے لیے مثلی ہونا شرط ہے، جن چیزوں کے مثل نہ ہوان کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز نہیں، کیونکہ قرض میں جو چیز لی گئی ہے اس کی مثل واپس کرنا شرعاً لازم ہے۔

قال علامة الصابوني : ونص الفقهاء على أن قرض المكيل والموزون جائز، كاستقراض الحب والشعير، والتمر والزبيب وكاستقراض السمن والزيت، وكل ما يكال ويوزن، واما ما لا مثل له فلا يجوز اقراضه كاللآلى، والجوهرات، وهذا مذهب ابى حنيفة، واجاز الشافعية والحنابلة اقراض مالا مثل له اذا كان معروف القيمة، فيجب رد القيمة . (فقه المعاملات)

حاصل یہ ہے کہ مکیلی اور موزونی چیز کی مثل موجود ہوتے ہوئے ان کو قرض دینا جائز ہے اور جو چیزیں غیر مثلی ہیں، جن کو "ذوات القیم" کہا جاتا ہے ان کو قرض کے طور پر دینا جائز نہیں، البتہ دراہم ودنانیر اور دیگر کرنسی کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز ہے کیونکہ ہر ملک کی کرنسی اس ملک کے اندر ذوات الامثال ہے۔

قرض دے کر نفع حاصل کرنا حرام ہے:

قرض خالص لوجہ اللہ ہونا ضروری ہے، یعنی ثواب کی نیت ہو کوئی دنیوی نفع مقصود نہ ہو، کیونکہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

"كل قرض جر نفعا فهو ربا ."

ہر وہ قرض جس کے ذریعے نفع کمایا جائے وہ نفع سود کے حکم میں ہے۔

مثلاً: کسی درزی کو ہزار روپے قرض دیا اور شرط رکھی کہ ہزار روپے واپسی کے علاوہ ایک جوڑا کپڑا مفت سی کر دینا ہوگا یا کسی بڑھئی کو دیا اور شرط رکھی کہ ایک الماری مفت بنا کر دینا ہوگی تو اگر وہ قرض کی واپسی کے ساتھ جوڑا بھی تو جوڑا سود ہے اس کا استعمال حرام ہے۔

قرض کی واپسی میں مقدار سے زائد واپس کرنا:

قرض سے جو نفع اٹھانا حرام ہے یہ اس صورت میں ہے کہ قرض دینے والا شرط لگائے یا عادۃً

وہاں معروف ہو کہ قرض لینے والا زائد واپس کرتا ہے، اگر قرض کی واپسی میں زیادتی مشروط نہ ہو بلکہ مقروض حُسنِ قضا کے طور پر زائد واپس کرتا ہے تو یہ شرعاً سود نہیں بلکہ ایسا کرنا بہتر ہے۔

لحدیث جابر بن عبد اللّٰہ قال : کان لی علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حق، فاعطانی و زادنی .

(اخرجہ الشیخان و الإمام احمد)

قرض کے بعد سکے بدل گئے:

اگر سکے یا نوٹ قرض لینے کے بعد بازار میں اس کا رواج بند ہو گیا (یعنی حکومت نے اس پر پابندی عائد کردی) یا اس کی قیمت کم ہوگئی تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس دن قرض لیا تھا اس دن بازار میں اس کی جو قیمت تھی وہ ادا کی جائے گی۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخری دن جس دن بند ہوا ہے اس دن کی قیمت معتبر ہوگی اسی پر فتویٰ ہے۔ (عطر ہدایہ بحوالہ شامیہ)

میت پر قرض کا حکم:

اگر کسی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ذمہ جو قرض ہے وہ ترکہ سے زیادہ ہے تو ایسی صورت میں جو مالِ ترکہ موجود ہے اس کو قرضخواہوں میں بقدرِ حصہ تقسیم کیا جائے گا جس کا جتنا فیصد قرض ہے ترکہ میں سے اسی قدر دے دیا جائے گا اگر مرحوم کے ترکہ میں کچھ بھی مال نہ ہو تو قرض خواہوں کو کچھ نہیں ملے گا، کل دین یا مابقیہ دین آخرت کے حساب میں ہوگا، دنیا میں ورثاء سے اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا ہے، ہاں البتہ ورثاء اپنی طرف سے خوشی سے کل دین یا کچھ حصہ ادا کردیں تو یہ ان کا احسان ہوگا اور اگر ترکہ زیادہ ہے اور قرضہ کم ہے تو کفن دفن کے بعد، ترکہ میں سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا اس کے بعد وصیت نافذ کی جائے گی، اس کے بعد جو مال بچے گا اس کو شریعت کے مطابق ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

مالِ حرام سے قرض ادا کرنے کا حکم:

اگر مثلاً: زید کے ذمہ قرض ہو اور اس کے پاس مالِ حرام کے سواء اور مال نہ ہو تو اس کے لیے مالِ حرام سے قرض ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الربوٰ، و الرشوۃ، و اجرۃ الزنا، و اجرۃ الغناء کل ذلك حرام سحت لم یخرج من ملك صاحبہ فلا یجوز تأدیۃ القرض بہ .

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ زید کے پاس جو حرام مال ہے، اس کا زید خود مالک نہیں ہے شرعاً اس پر لازم ہے کہ وہ اصل مالک یا اس کے ورثاء کو واپس کرے معلوم نہ ہونے کی صورت میں ان کی طرف سے صدقہ کرے۔ جب زید خود اس مال کا مالک نہیں تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس حرام مال سے قرض ادا کرے، تاہم اگر زید نے اس مالِ خبیث کو قرض میں ادا کر دیا تو قرض سے بری الذمہ ہو جائے گا، البتہ غیر کے مال استعمال کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا، زید کے ذمہ لازم رہے گا اس مال کے ضمان اور بدل کے طور پر دوسرا مال مالک کو واپس کرے یا صدقہ کرے، باقی مقرض (دائن) کو اگر معلوم ہو جائے کہ زید حرام مال سے قرض ادا کر رہا ہے تو اس کے لیے قبول کرنے اور اس کو استعمال کر کے فائدہ حاصل کرنے کا کیا حکم ہے؟ اس بارے میں تفصیلی فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

حرام مال سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا:

اگر دائن (قرض خواہ) کو مسلمان مدیون (مقروض) کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کا جو مال ہے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے، مثلاً: سود، قمار، جوا، شراب، خنزیر وغیرہ کی خرید وفروخت کی آمدنی، ناچ گانے، فسق وفجور، بدکاری اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا مال ہے تو ایسی صورت میں دائن کے لیے مدیون کے اس مال حرام سے اپنا دین (قرض) وصول کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ یا ایسی صورت میں دائن اپنا دین (قرض) مدیون کے ذمہ چھوڑ دے اور اس کے حرام مال سے دین وصول ہی نہ کرے اور ایسی صورت میں حلال مال سے دین (قرض) ادا نہ کرنے کی وجہ سے مدیون گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

علماء کا اختلاف:

دائن کے لیے مدیون کے حرام مال سے اپنا قرض وصول کرنے کے جواز اور عدم جواز میں علماء کے درمیان اختلاف ہے اور اس اختلاف کا بنیادی منشاء یہ ہے کہ ملک خبیث یعنی غیر مشروع طریقہ اور ناجائز ذرائع سے جو مال حاصل کیا گیا ہے اس مال کی عین میں حرمت ہے یا حرمت حرام مال حاصل کرنے والے کے ذمے میں ہے؟

اگر حرمت عین مال میں نہیں ہے تو اس حرام مال کے اصل مالک کا حق اس کی عین سے متعلق نہیں ہوگا بلکہ اس طرح حرام مال کے کاسب وحائز کے ذمہ سے متعلق ہوگا، ایسی صورت میں

کاسب کی ملکیت اس مال حرام میں ثابت ہوگی، لہٰذا قضاء اس مال حرام سے قرض وصول کرنا جائز ہوگا، البتہ دیانۃً جائز نہ ہوگا۔

مذاہبِ علماء:

مذکورہ بالا اختلاف کی وجہ سے اس مسئلہ میں علماء کے اقوال بھی مختلف ہیں، چنانچہ اس مسئلہ میں حضرات فقہاء کے چار اقوال مشہور ہیں:

1- حضرت امام محمد شیبانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدیون کے مال حرام سے دین وصول کرنا جائز ہے اور اس سے فائد حاصل کرنا بھی درست ہے اور یہ حکم قضاء ہے البتہ دیانۃً ایسا کرنا جائز نہیں۔

2- حضرت ابن قاسم مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مدیون کے پاس حلال اور حرام دونوں طرح کا مال مخلوط ہو اور حلال مال غالب ہو، تو اس مال سے قرض وصول کرنا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے۔

3- ابن وہب مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدیون کے مال حرام سے قرض وصول کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

البتہ علامہ ابن رشد مالکی رحمہ اللہ نے ابن قاسم اور ابن وہب کے دونوں اقوال کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن قاسم کا قول قیاس کے مطابق ہے اور ابن وہب کا قول استحسان پر مبنی ہے، اس بناء پر ترجیح یہ ہے کہ اگر اس کے مال میں حلال غالب ہے تو اس سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا جائز ہے اور اگر حرام غالب ہے تو اس سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا جائز نہیں۔

4- امام ابن تیمیہ اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ اگر دائن کو معلوم ہے کہ مدیون قرض کی ادائیگی میں جو مال دائن کو دے رہا ہے وہ مال حرام ہے تو ایسی صورت میں مدیون کے حرام مال سے دین وصول کرنا دائن کے لیے جائز نہیں اور اگر دائن کو یہ معلوم نہیں کہ مدیون قرض کی ادائیگی میں دائن کو جو مال دے رہا ہے وہ مال حرام ہے یا حلال؟ تو ایسی صورت میں مدیون کے مال سے قرض وصول کرنا جائز ہے اور مال کے حلال اور حرام ہونے کے متعلق مدیون سے استفسار کرنا دائن پر لازم نہیں، کیونکہ اصل حکم یہ ہے کہ جو چیز

مسلمان کے پاس ہوتی ہے وہ اس کی ملک ہوتی ہے، لہٰذا اس کی حقیقت معلوم کرنا ضروری نہیں۔

راجح اور مفتی بہ قول:

ان چاروں اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ اس بات میں فرق کرنا ضروری ہے کہ اگر دائن کو یہ معلوم ہو کہ مدیون کے پاس جو مال حرام ہے وہ اصل مالک کی رضا اور شریعت کی اجازت کے بغیر ہی حاصل کیا گیا ہے، مثلاً: چوری، ڈکیتی، غصب، رہزنی وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں دائن کے لیے اس مال حرام سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا جائز نہیں۔

اور اگر دائن کو یہ معلوم ہے کہ مدیون کے پاس جو مال حرام ہے وہ اصل مالک کی رضا سے تو حاصل کیا گیا ہے لیکن شریعت کی اجازت کے بغیر یعنی غیر مشروع طریقہ حاصل کیا گیا ہے، جیسے سود، قمار، جوا، بدکاری، ناچ گانے وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہے اور اس مال حرام سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا قضاء جائز ہے، البتہ دیانۃً اگر اس سے اجتناب کرے تو تقویٰ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے، یہی رائے مترشح ہوتی ہے حضرات امام محمد بن الحسن شیبانی، حضرت امام ابن قاسم، حضرت امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال سے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مالِ حرام: ص: ۳۶۴، مولفہ مفتی کمال الدین راشدی)

روٹی عدداً قرض لینا:

کھانے پینے کی جن چیزوں میں عادۃً تسامح سے کام لیا جاتا ہے ان میں قرض دینے اور لینے سے مقصد نفع کمانا نہیں ہوتا بلکہ محض وقتی ضرورت پوری کرنا مقصد ہوتا ہے، اس میں معمولی کمی و زیادتی سود میں داخل نہیں، لہٰذا روٹی کو عدداً قرض لینا جائز ہے۔

وذلك لما روي عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها انها قالت قلت يا رسول الله ! إن الجيران يستقرضون الخبزْ والعجين، ويردون زياده ونقصانا، فقال لا بأس، إن ذالك من مرافق الناس، لا يراد به الفضل .

وعن معاذ بن جبل أنه سئل عن استقراض الخبز فقال سبحان الله، انما هذا من مكارم الأخلاق، فخذ الكبير واعط الصغير، وخذ الصغير واعط الكبير خيركم احسنكم قضاءً سمعت رسول الله صلى

اللّٰہ علیه و سلم یقول ذلك .

(اخرجها ابو بکر الوراق فی کتابه الشافعی کما فی المغنی لابن قدامه : ٦/٤٣٥)

نیز معمولی درجہ کی نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ قرض لینے کا دستور ہے ان میں بھی سود کا تحقق نہیں ہوتا لہٰذا واپسی میں معمولی کی زیادتی کو سود نہیں کہا جائے گا۔

سونے کے زیور قرض دے کر ان کی قیمت واپس لینا:

سوال: کسی نے دوسرے شخص سے کچھ تولہ سونا بصورتِ زیور قرض لیا، اب مقروض اپنا قرض ادا کرنا چاہتا ہے، مقرض (قرض دینے والا) اس سے کہتا ہے کہ آپ بجائے زیوارت کے ان کی قیمت دے دیں تو مناسب ہو، کیا مقروض زیورات کی قیمت دے سکتا ہے؟ اگر دے سکتا ہے تو کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟ واضح رہے کہ بعض علماء نے اس معاملہ کو سود میں شامل کر کے ناجائز قرار دیا ہے۔ نیز یہ بھی فرمائیں کہ ربوا نسیئۃ اور قرض کے درمیان کچھ فرق ہے یا نہیں؟
بینوا توجروا

جواب: زیور کی بجائے اس کی قیمت لینے میں شبہ ربوا کی کوئی وجہ نہیں۔

قال العلائی رحمه اللّٰہ تعالیٰ : (و) صح (بیع من علیه عشرة دراهم) دین (ممن هی له) اي من دائنه فصح بیعه منه (دینارابها) اتفاقا و تقع المقاصة بنفس العقد إذلا ربوا فی دین سقط .

و قال ابن عابدین رحمه اللّٰہ تعالیٰ : (قوله و تقع المقاصیة بنفس العقد) اي بلا توقف علی ارادتهما لها بخلاف المسألة الآتية و وجه الجواز انه جعل ثمنه دراهم لا یجب قبضها و لا تعیینها بالقبض و ذلك جائز اجماعا لان التعیین للاحتراز عن الربوا اي ربوا النسیئة و لا ربوا فی دین سقط انما الربوا فی دین یقع الخطر فی عاقبته و لذا لو تصارفا دراهم دینا بدنانیر دینا صح لفوات الخطر .

(ردالمحتار : ٤/٢٦٦)

البتہ اگر زیور کے قرض کے بدلے زیور ہی لیے جاتے تو مبادلۃ الجنس بالجنس ہونے کی وجہ سے ربوا ہونے کا مغالطہ ہو سکتا تھا، مگر در حقیقت اس صورت میں بھی ربوا نہیں، بلکہ یہ قرض ہے۔

ربوانسیئہ جب ہوتا ہے کہ مبادلۃ الجنس بغیر الجنس ہو یا مبادلۃ الجنس بالجنس ہو اور اس میں لفظ بیع یا مبادلہ یا معاوضہ استعمال کیا گیا ہو، اگر جنس دے کر وہی جنس واپس لینے کا معاملہ کیا ہو مگر بیع یا مبادلہ یا معاوضہ کے الفاظ نہیں کہے تو یہ قرض ہے خواہ قرض کا لفظ کہے یا نہ کہے اور یہ بلا شبہہ جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ۷/ ۱۷٤)

قرض وصول کرنے کی تدبیر:

سوال: ایک عزیزہ مُصر ہیں کہ ان کو حسبِ ذیل معاملہ کے جواز کے متعلق مطمئن کیا جائے، ان سے ان کے والدِ حقیقی نے بطورِ ادھار مبلغ ایک سو روپے لیے تھے مگر اب مدتِ دراز سے وہ ادا نہیں کر رہے حالانکہ وہ اس رقم کو ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ آئندہ وصول ہونے کی قوی امید ہے۔ ان کے والد گھی کا کاروبار کرتے ہیں اور یہ گھی اسی سائلہ بیٹی کے گھر رکھتے ہیں، ایسی صورت میں کیا یہ جائز ہوگا کہ یہ بیٹی اپنے والد کے گھر میں سے وقتاً فوقتاً ان کی اجازت کے بغیر کسی قدر گھی نکال کر فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے اور جب اس طرح وصول ہو جائے تو اپنے والد کو آگاہ کر دے، اگر چہ آگاہ کرنے میں ناراضگی کا اندیشہ بھی ہے لیکن آخر یہ بیٹی جو کہ بیوہ ہے، صاحبِ اولاد اور ضرورت مند ہے کیا کرے؟ اور باپ محتاج نہیں، آیا رقم وصول کرنے کی یہ تدبیر شرعاً جائز ہے۔ بینوا توجروا

جواب: یہ طریقہ جائز ہے مگر اس کا پورا اہتمام رہے کہ اپنے حق سے زیادہ ہرگز نہ لے، وصول ہونے کے بعد والد کو اس کی اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں، خصوصاً جب کہ ناراضگی کا اندیشہ ہو۔

قال في العلائية : ليس لذي الحق ان يأخذ غير جنس حقه وجوزه الشافعي رحمه الله تعالىٰ وهو الاوسع .

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله وجوزه الشافعي) قدمنا في كتاب الحجر ان عدم الجواز كان في زمانهم اما اليوم فالفتوى على الجواز .

(ردالمحتار : ٥/ ٣٠٠، احسن الفتاویٰ : ٧/ ١١٤)

بیع سلم کی تعریف اور احکام

بیع سلم کی تعریف اور مشروعیت:

السلم : بيع شی إلى اجل معين مع قبض الثمن فوراً عند العقد ويسمى : بيع السلف . ايضا

یعنی بیع سلم ایسی بیع ہے جس میں ثمن (یعنی قیمت) پر تو مجلس عقد میں قبضہ ہوتا ہے اور مبیع (مال) پر ایک مدت (کم از کم ایک ماہ) کے بعد قبضہ ہوتا ہے۔

قال القدروي : السلم فی لغة العرب هو : عقد يتضمن تعجيل احد البدلين، وهو الثمن، وتأجيل الاخر وهو المبيع، وهو عقد شرع على خلاف القياس، لكونه بيع المعدوم، الا انا تركنا القياس، بالكتاب والسنة والاجماع . (الاختيار لتعليل المختار : ٢/ ٣٤)

قال العلامة الصابونی :

دليل جواز السلم : أما دليل جوازه فهو الكتاب، والسنة، والإجماع . أما الكتاب فقول الله عزوجل ﴿ يايها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين الى اجل مسمى فاكتبوه ...... ﴾ والدين عام يشمل دين السلم، وغيره من ديون المبايعات . قال ابن عباس : أشهد أن السلف المضمون إلى أجل، قد أحله الله في كتابه، وأذن فيه، وأنزل فيه أطول آية في كتابه، ثم تلا هذه الآية . رواه الطبراني والحاكم والبيهقي .

أما السنة : ١ ـ فهو ما رواه البخاري ومسلم عن ابن عباس أنه قال : "قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يسلفون بالتمر السنتين والثلاث، فقال : من أسلف في شيء، فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم، إلى أجل معلوم ."

(أخرجه البخاري في كتاب السلم رقم : ٢٢٤٠ ومسلم رقم

۱٦۰ في المساقات والترمذي رقم: ۱۳۱۱)

۲۔ وأخرج البخاري عن عبد الله المجالد قال: "أختلف عبد الله بن شداد، وأبو بردة في السلف، فبعثوني إلى ابن أبي أوفى رضى الله عنه فسألته، فقال: إنا كنا نسلف عى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكر و عمر، في الحنطة، والشعير، والزبيب، والتمر، وسألت ابن أبزىٰ فقال مثل ذلك."

(أخرجه البخاري رقم: ۲۲٤۲ ابو داود رقم: ۳٤٦٤)

۳۔ وبما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه "نهى عن بيع ما ليس عند الإنسان، ورخص في السلم." (الاختيار لتعليل المختار: ۲/۳٤) ففي هذه الأحاديث الشريفة، دلالة واضحة على جواز بيع السلم، وأن النبي صلى الله عليه وسلم إنما جوزه للحاجة إليه، واضطرار الناس إلى التعامل به، مع السبب الموجب للمنع، وهو عدم وجوده في ملكه، وعدم قدرة تسليمه في الحال، ولهذا قال الفقهاء: إنه ثبت على خلاف القياس.

وأما الإجماع: فقد أجمع أئمة علماء المسلمين على جوازه من غير خلاف.

قال ابن المنذر: أجمع كل من تحفظ عنه من أهل العلم، على أن السلم جائز، لأن بالناس حاجة إليه، لأن أرباب الزروع والثمار، والتجارات، يحتاجون إلى النفقة على الزروع ونحوها حتى تنصج، فجوز لهم السلم دفعا للحاجة. (فقه المعاملات)

بیع سلم کی شرائط:

بیع سلم کی صحت کے لیے کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، وہ کل آٹھ شرائط ہیں:

1- ''جنس کا معلوم ہونا'' کہ کس چیز میں بیع ہو رہی ہے۔

2- ''نوع کا معلوم ہونا'' کہ کس قسم کی چیز ہوگی۔

3- ''صفت کا معلوم ہونا'' کہ چیز عمدہ اعلیٰ قسم کی ہے یا ادنیٰ قسم کی۔

4- ''اجل (مدت) کا معلوم ہونا'' کہ مال کتنے عرصہ کے بعد مشتری کا حوالہ کیا جائے گا۔

5- ''مجلس عقد میں ثمن (قیمت) پر قبضہ کرنا'' کہ مشتری اسی مجلس میں طے شدہ قیمت بائع کا حوالہ کردے۔

6- ''مؤجلاً ہونا'' یعنی سلم میں ضروری ہے کہ مبیع مال ایک مدت کے بعد حوالہ کیا جائے، اگر مبیع ادھار نہ ہوتو یہ معاملہ عقد سلم نہ ہوگا اور مدت کم از کم ایک ماہ کی ہونی چاہیے۔

7- ''مال کا وقتِ عقد سے لے کر مدت پوری ہونے تک بازار میں موجود ہونا۔''

8- ''رأس المال معلوم ہو۔''

والقاعدة فيه أن كل ما امكن ضبط صفته، معرفة نوعه، مقداره، في المكيلات، والموزونات، والمزروعات والمعدودات، جاز السلم فيه وما لا يمكن ضبط صفته ومعرفته نوعه وقدره . لا يجوز السلم فيه . (فقه المعاملات)

یعنی بیع سلم کے جواز کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی صفت کو ضبط کرنا، نوع اور مقدار کو پہنچانا، ممکن ہو مکیلی، موزونی اور عددی چیزوں میں سے اس میں سلم جائز ہے جس میں ممکن نہ ہو اس میں سلم بھی جائز نہیں۔

جانوروں میں بیع سلم کا حکم:

حیوانات میں بیع سلم کا مسئلہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک چونکہ بیع سلم کے لیے مبیع کا کیلی، وزنی یا عددی متقارب کا ہونا ضروری ہے، جبکہ جانوران میں سے کسی میں داخل نہیں اور حیوانات ایک دوسرے سے، چھوٹے بڑے یا دبلے، موٹے ہونے میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس لیے حنفیہ کے نزدیک حیوانات میں بیع سلم جائز نہیں، البتہ ائمہ ثلاثہ اس کو حیوانات کے قرض پر قیاس کر کے جائز قرار دیتے ہیں۔

گوشت میں بیع سلم کا حکم:

گوشت میں بیع سلم کے متعلق علامہ صابونی فرماتے ہیں کہ اگر گوشت صفات ذکر کے متعین

کرلیا جائے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک گوشت میں بھی بیع سلم جائز ہے۔

قال العلامة الصابونی :

مذهب أبي حنيفة، أنه لا يجوز السلم في الحيوان ولحمه، لأنه يتفاوت تفاوتاً فاحشاً بكبر العظم وصغره، وبالسمن والهزال .

وقال الشافعية والحنابلة والمالكية : يجوز السلم في الحيوان، قياساً على جواز القرض فيه، وذلك لما رواه مسلم عن أبي رافع " أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استسلف من رجل بكرا۔ اي استقرض جملاً فتييا۔ فقدمت عليه إبل من إبل الصدقة، فأمر أبا رافع أن يقضي الرجل بكره فرجع إليه أبو رافع فقال : لا أجد فيها إلا خيارا رباعيا۔ أي ابن ست سنين أفضل من البكر۔ فقال : أعطه إياه، إن خيار الناس أحسنهم قضاء " وأما السلم في اللحم مع العظم، فالجمهور على جوازه بشرط ضبط صفاته، بذكر جنس اللحم، كلحم الشاة أو لحم البقر، ولحمه كذكر أو أنثى، معلوف أو سائم، وسنه كشاة ثني أو جذعه، وصفته كسمين، أو مهزول، أو سط، وإلى هذا ذهب الصاحبان من تلامذة أبي حنيفة، لأنه إذا ضبط الوصف، والنوع، والوزن، جاز السلم فيه لانتفاء الجهالة، ودليلهم قول النبي صلى الله عليه وسلم : " من أسلف فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم ." (اخرجه البخاري و مسلم)

قالوا : وظاهر الحديث إباحة السلم في كل موزون، وباعتبار الوزن ينتفي الغرر والجهالة، وإذا جاز السلم في الحيوان، فاللحم أولى بالجواز .

(انظر مفنى المحتاج : ۱۱۱/۲ والمهذب : ۲۹۸/۱ ، المغنى : ۲۸/۳)

کپڑے میں بیع سلم کا حکم:

1- اگر کوئی تاجر کسی فیکٹری کے مالک سے اس طرح معاملہ طے کرے کہ مثلاً: آئندہ

سال گرمی کے موسم میں مجھے اتنے تھان کپڑا درکار ہے اور جملہ شرائط طے کرکے قیمت فیکٹری کے مالک کے حوالے کردے تو شرعاً یہ عقد جائز ہوگا یا نہیں؟

2- یا آرڈر کرے کہ مجھے ہزار جوڑے کپڑے سلے ہوئے چاہئیں دو مہینے کے بعد اور رقم ابھی ادا کردے اس کا کیا حکم ہے؟

تو شرعاً یہ دونوں صورتیں کپڑے میں بیع سلم کی ہیں، لہٰذا اگر سودا طے کرتے وقت، کپڑے جملہ اوصاف (یعنی کونسا کپڑا ہوگا، سوتی ہوگا یا ریشم؟ کس ڈیزائن میں ہوگا) تمام باتیں واضح کردی جائیں تو شرعاً یہ عقد جائز ہوگا۔

لما في مجلة الأحكام : الكرباس والجوخ وامثالها من المزوعات يلزم تعيين طولها وعرضها ورقتها ومن اي شئ تنسج ومن نسج اي محل هي .

(شرح المجلة رستم باز : صـ ۲۱۸ ماده صـ ۳۸۵ الفصل الثالث فی السلم)

الثياب من العدديات المتفاوتة، فلا يجوز فيها السلم قياسا على الدور، والعقارات، والجواهر، واللآلئ، التي لا يمكن ضبطها بالوصف، ولأن الثياب ليست من ذوات الأمثال، لتفاوت فاحش بين ثوب وثوب، ويجوز فيها السلم استحسانا عند الحنفية، إذا توضح فيها الجنس، والنوع، والصفة، والقدر من الثخانة والغلظ، والطول والعرض، فيلتحق بالمثليات، لحاجة الناس إليهما في تعاملهم، حيث يضطرون إلى شراء الثياب، سواء ما كان منها يخص الرجال أو النساء، من الثياب المخيطة .

وأجاز المالكية والشافعية والحنابلة السلم في الثياب، إذا عرف الوصف، والنوع، والقياس، حتى قال ابن المنذر : وأجمعوا على جواز السلم في الثياب . (انظر المغنى لابن قدامة : ٤/٢٧٦ فقه المعاملات)

مسلم فیہ دینے سے عجز کا حکم:

سوال: ایک شخص نے بیع سلم ایک روپیہ فی کاسہ کے حساب سے کی، اب وقت معین پر مبیع

کے ادا کرنے پر بوجہ افلاس کے قادر نہیں تو رب السلم اس سے دو روپے فی کا سہ ثمن وصول کرنا چاہتا ہے، کیا شرعاً اس کے لیے یہ فعل جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: مدت معینہ تک اگر مسلم إلیہ مسلم فیہ ادا نہ کرسکا تو اس کے عوض کوئی دوسری چیز لینا یا ثمن سے زیادہ لینا جائز نہیں، لہٰذا مشتری کو چاہیے کہ یسر تک بائع کو مہلت دے یا اپنا ثمن واپس لے لے، بائع کی رضا سے بھی استبدال یا ثمن سے زائد لینا جائز نہیں۔

قال في الهندية : ولا يجوز الاستبدال بالمسلم فيه .

(عالمگيرية : ۱۸٦/۳)

وقال في شرح التنوير : ولو انقطع بعد الاستحقاق خير ربّ السلم بين انتظار وجوده والفسخ واخذ رأس ماله .

(ردالمحتار : ۲۳۸/٤)

وايضاً فيه : ولا يجوز التصرف للمسلم اليه في رأس المال ولا لرب السلم في المسلم فيه قبل قبضه نحو بيع وشركة ومرابحة وتولية ولو ممن عليه (إلى قوله) لقوله عليه الصلاة والسلام لا تأخذ الا سلمك او رأس مالك اي الا سلمك حال قيام العقد او رأس مالك حال انفساخة فامتنع الاستبدال .

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : وتقدم اوّل فصل التصرف في المبيع ان بيع المنقول من بائعه قبْل قبضه لا يصح ولا ينتقض به البيع الاول بخلاف هبته منه لأنها مجاز عن الاقالة .

(ردالمحتار : ۲۳۳/٤) (احسن الفتاویٰ : ٤٨١/٦)

اجارہ (کرایہ داری) کے احکام

اجارہ کی تعریف:

هي عقد على منافع بين اثنين او جماعة، مقابل عوض مالي، كاستئجار دار للسكنى . ودابة أو سيارة للركوب، او عامل للخدمة .

یعنی اجارہ دو آدمیوں کے درمیان منافع کو مال کے عوض فروخت کرنے کا عقد ہے، جیسے مکان کو رہائش کے لیے، جانور کو مال برداری کے لئے اور گاڑی کو سواری کے لیے کرایہ پر لینا یا نوکر کو خدمت کے لیے رکھنا۔

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله : الاجارة عقد على المنافع بعوض .

ودليل جوازه : قوله تعالىٰ : ﴿ إن أريد أن انكحك احد ابنتي هتين على أن تاجرني ثمني حجج ﴾ (قصص : ٢٧)

وقوله تعالىٰ : ﴿ فإن أرضعن لكم فأتوهن أ جورهن ﴾ (طلاق : ٦)

وقوله عليه السلام : اعطوا الاجير اجره قبل أن يجف عرقه . (اخرجه ابن ماجه)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دے دو۔

وفي صحيح البخاري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استاجر رجلاً ليدله على الطريق، وهو ابن الاريقط . (اخرجه البخاري ومسلم)

وفي الحديث القدسي الذي رواه البخاري : ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة ومن كنت خصمه خصمت : رجل اعطى بي ثم غدر ورجل باع حراً فأكل ثمنه ورجل استاجرا جيراً فاستوفى منه ولم يعطه اجره . (اخرجه البخاري رقم : ٢٤٢٧ في البيوع)

حدیث قدسی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تین آدمیوں کی طرف سے مخاصمت کرتا ہوں اور میں جس کا طرف دار بنتا ہوں اس کو غالب کرتا ہوں۔

1- جس نے میرے نام پر عہد کیا پھر بھی غداری کی۔
2- جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے قیمت استعمال کی۔

-3 جس نے کسی سے مزدوری کروا کر یا کام پورا لینے کے بعد اس کو مزدوری نہیں دی۔ (بخاری)

اجارہ صحیح ہونے کے لیے درج ذیل شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہے:

-1 اہلیۃ العاقدین: کہ عاقدین عاقل، بالغ، سمجھدار ہوں۔

-2 طرفین کی رضامندی سے عقد کیا جائے۔

-3 منفعت کا متعین ہونا، یعنی کس قسم کے کام کے لیے کون سی چیز کرایہ پر لی گئی ہے، تا کہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو، مثلاً: اگر مکان کرایہ پر لیا تو پہلے مکان کو دیکھ لیا جائے یا درزی کو کپڑے دیا تو یہ طے کر لے کہ کتنی مدت میں سی کر دے گا وغیرہ۔

-4 اسی طرح معقود علیہ قابل انتفاع ہو، لہٰذا مغصوبہ زمین کرایہ پر دینا، اسی طرح بدکنے والا اونٹ کرایہ پر دینا یا جو مکان غاصب یا ظالم کے قبضہ میں ہو اس کو کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ کرایہ دار کے لیے اس سے انتفاع ناممکن ہے۔

-5 اجرت کی مقدار متعین ہو۔

لقوله عليه السلام: من استاجر أجيرا فليعلمه اجره.

(مصنف عبد الرزاق)

-6 وہ کام اجیر کے ذمہ فرض نہ ہو لہٰذا نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کے لیے کسی کو اجرت پر لینا جائز نہ ہوگا اور اس پر اجرت وصول کرنا حرام ہوگا۔

اجیر کی اقسام:

اجیر کی دو قسمیں ہیں:

-1 اجیر خاص　　　-2 اجیر مشترک

اجیر خاص:

جو مزدور، ملازم کل وقت یا بعض متعین وقت کسی ایک ہی مالک کے لیے کام کرتا ہے، مہینہ بھر یا سال بھر یا طویل مدت کے لیے چاہے یومیہ تنخواہ وصول کرے یا ماہانہ اس کو اجیر خاص کہتے ہیں۔

اجیر مشترک:

وہ مزدور جو مخصوص مالک کا کام نہیں کرتا بلکہ متعدد مالکوں کا کام کرتا ہے، اس کو اجیر مشترک

کہتے ہیں، جیسے رنگریز، درزی، دھوبی، حجام، خاکروب وغیرہ۔

اجیر خاص کے احکام:

1- اجیر خاص جب خود کام کے لیے حاضر ہو (یعنی ڈیوٹی پر موجود ہو) چاہے مالک پورے وقت کام لے یا کچھ وقت وہ پوری اجرت کا مستحق ہے، ہاں اگر مفوضہ کام انجام نہیں دیا تو اجرت کا مستحق نہیں ہوگا۔ (شرح مجلہ)

2- اپنے مالک سے کام کا جو وقت طے ہوا (یعنی جتنے گھنٹہ کام کا معاہدہ ہوا) اس وقت میں کسی دوسرے کا کام کرنا جائز نہیں (ہدایہ) اگرچہ اجرت بہت زیادہ ملتی ہو۔ (عالمگیری)

3- اجیر خاص کے ہاتھ سے کوئی چیز بغیر تعدی کے ضائع ہو جائے تو اس پر ضمان لازم نہ ہوگا اور اگر خود تلف کردے تو ضمان لازم ہوگا۔

اجیر مشترک کے احکام:

1- اجیر مشترک کا کوئی وقت کسی کام لینے والے کے لیے مختص نہیں کہ اس وقت میں کسی دوسرے کا کام ناجائز ہو یا آرام کرنا جائز نہ ہو، کیونکہ یہاں اجرت کام سے متعلق ہے، اگر کام پورا کرے گا تو اجرت کا مستحق ہوگا ورنہ نہیں، وقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں، البتہ کام پورا کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر کیا ہو تو وعدہ کے طور پر اس کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔

2- اجیر مشترک کام پورا کیے بغیر اجرت کا مستحق نہیں۔

3- صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک نقصان کی صورت میں اجیر مشترک کو ضامن بنایا جائے گا۔

قال في الموسوعة الفقهية: والأجير الخاص هو أن يعمل الرجل لغيره عملا مدة معلومة، كشهر، أو سنة، كأن يرعى غنمه، أو يقود سيارته، ولا يجوز لهذا الأجير أن يعمل لغيره في هذه المدة.

ويستحق الأجرة إذا حضر عمله في مدة الإجارة وإن لم يعمل بعد، ما لم يطلب منه ذلك. ويستحق الموظف الأجرة، في أيام العطلة والإجازة، جريا على العادة (الموسوعة الفقهية للشيخ خليل كوناج: ١/ ٨) وهو أمين لا يضمن. بهلاك الشيء في يده، من غير

تقصير منه، فإذا غرقت السفينة من ريح أو موج، وهلك ما فيها، لا يكون ضامنا، أما إذا هلك بمده و حذفه فيضمن، و كذلك أمر السيارة والشاحنة أيضا، فإنه لا يضمن السائق إذا تعطلت السيارة من نفسها، من غير تقصير منه، و سببت تلف المال. أما إذا كان له تقصير في ذلك، فيكون ضامنا . (فتاوى قاضيخان : ٢ / ٣٣٥)

والأجير المشترك : هو الذي يعمل لأكثر من واحد كالخياط، والنجار، والحداد، والصباغ، وأمثالهم، سمي مشتركا، لأن الناس يشتركون في نفعه ...... وليس لمن استأجره أن يمنعه من العمل لغيره، لأنه لم يستأجره لنفسه، ولا يستحق الأجرة إلا بالعمل، خلافا للأجير الخاص .

اجیر مشترک پر ضمان کا حکم:

ذهب المالكية وبعض فقهاء الشافعية، إلى أن يد الأجير المشترك (يد ضمان) بمعنى أنه إذا تلف الشيء في يده، فإنه يضمنه، ولو بغير تعد أو تقصير فيه، حفاظا على أموال الناس، ورعاية لمصالحهم، حتى يهتم بما عهد إليه، ويستشعر بالمسئولية، فلا يقصر ولا يفرط في عمله .

واستدلوا بما روي أن عليا رضي الله عنه، كان يضمن الصانع، والصباغ، وكان يقول : " لا يصلح أمر الناس إلا ذاك ." (رواه البيهقي عن على رضى الله عنه) .

وروي أن شريحا القاضي، كان يضمن القصار - أي الصباغ - فضمن قصارا احترق بيته فقال : أتضمنني وقد احترق بيتي ؟

فقال له شريح : أرأيت لو احترق بيته، أكنت تترك له أجرك !؟

وذهب أبو حنيفة وأحمد : إلى أن يد الأجير المشترك يد أمانة، فلا يضمن إلا بالتعدي، أو بالإهمال والتقصير .

(انظر ردالمحتار : ٥/٤٠٥)

وهو الصحيح من أقوال الشافعي رضي الله عنه، والراجح من مذهب أحمد .

قال ابن حزم : لا ضمان على أجير مشترك أو غير مشترك، ولا على صانع أصلا، إلا ما ثبت أنه تعدى فيه أو أضاعه .

وقال في الاختيار : والأجراء نوعان : مشترك كالصباغ والقصار، ولا يستحق الأجرة حتى يعمل، والمال أمانة في يده، لأنه قبضه بإذن المالك فلا يضمنه، إلا أن يتلف بعمله، كتحريق الثوب من دقه، وانقطاع الحبل من شده، ونحو ذلك، إلا أنه لا يضمن الآدمي إذا غرق في السفينة، أو سقط من الدابة يسوقه وقوده، لأن الآدمي لا يضمن بالعقد، وإنما يضمن بالجناية !

ولو غرقت من موج أو ريح، أو اصطدام بجبل، فلا ضمان عليهم، لأنه لا فعل لهم بذلك . وأجير خاص، كالمستأجر شهراً للخدمة، ورعي الغنم ونحوه، ويستحق الأجرة بتسليم نفسه، وإن لم يعمل، ولا يضمن ما تلف في يده ولا بعمله إذا لم يتعمد الفساد .

(الاختيار لتعليل المختار للموصلى : ٢/٥٣)

وما ذهب إليه مالك من تضمين (الأجير المشترك) هو الأصح والأرجح، وهو مذهب الصاحبين أبي يوسف ومحمد فقد قالا : إنه يضمن سواء هلك بفعله، أو بغير فعله، إلا ما لا يمكن الاحتراز عنه، كالموت، والحرق، والغرق الغالب، والعدو المكابر، لأنه مأمور بحفظه، فإذا تركه ضمن، كما إذا هلك بفعله، وهو مروي عن عمر، وعلي رضي الله عنهما . (المرجع السابق : ٢/٥٤)

وإنما قلنا : إن هذا المذهب أصح وأرجح، لأنه إذا عرف الأجير المشترك، أنه ضامن لما أتلف، يهتم بعمله ولا يقصر فيه، ويبذل

قصاری جهده لإتقان عمله، حتى لا يغرم قيمة ما أتلفه، فتضمن حقوق الناس، وتؤمن مصالحهم، أما إذا كان الشيء خارجا عن طاقته وقدرته، كالحرق، والغرق، فلا يكلف الله نفسا إلا وسعها، والله اعلم . (فقه المعاملات للصابونی)

دورانِ ملازمت حقوق اللہ ساقط نہیں ہوں گے:

ملازم کے ذمہ جو حقوق اللہ ہیں وہ کسی عقد سے نہ ساقط ہو سکتے نہ متاخر، جیسے: نماز اور حج فرض کی ادائیگی کے لیے سفر، مسلمانوں کے علاقہ پر کفار کے طرف سے حملہ کی صورت میں مسلمان مجاہدین کی مدد یا کسی جلنے اور ڈوبنے والے کو بچانا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بشرطیکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اس کے سوا اور کوئی نہ ہو، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی سے مستاجر کو کوئی ایسا ضرر نہ پہنچے جو ان حقوق کے برابر یا ان سے زیادہ ہو مثلاً: جیسے زید سخت بیمار ہے صاحبِ فراش ہے کوئی اس کا مددگار یا خادم نہیں اب بکر جو اس کا ملازم ہے اس کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا یا اس کی عورتیں چھوٹے بچے یا اس کی ماں ان سب کی دیکھ بھال ملازم کے ذمہ ہے وہ ملازم اب کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جو ان کے یا مال کے ضائع ہونے کا سبب ہو۔ اللہ تعالیٰ مستغنی ہے بندہ محتاج ہے اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرمانے والے ہیں بندے حقوق وصول کرنے والے ہیں، اب دونوں حقوق میں تقابل ہو جائے تو حقوق العباد کی ادائیگی مقدم ہو گی، البتہ ملازم کوشش کرے کہ فرائض کو اس طرح ادا کرے کہ بندہ (آقا کی) حق تلفی نہ ہو تو یہی مناسب اولیٰ ہے۔ (عطر ہدایہ)

ملازم کے لیے جماعت چھوڑنا جائز نہیں:

ملازم کے لیے پانچوں وقت کی نمازیں، مع سنتوں کے، اسی طرح جمعہ، عیدین اور ان کے مقدمات، جیسے غسل، استنجاء، وضو اور مسجد میں حاضری وغیرہ، سارے کام دورانِ ملازمت جائز ہیں، مالک کے لیے جائز نہیں کہ ملازم کو ان عبادات کی ادائیگی سے منع کرے۔

اگر ملازمت کے وقت ان سے روکنے کی شرط لگائے یا شرط لگائے بغیر روکے تو ملازم کے لیے حکم ماننا جائز نہیں، کیونکہ آقا کا ہر وہ حکم جو حکم الٰہی کے مقابل ہو اس کا ماننا شرعاً جائز نہیں۔

مسئلہ: البتہ دورانِ ملازمت آقا کی اجازت کے بغیر نوافل پڑھنا جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر مسجد دور ہو تب بھی جماعتِ جمعہ چھوڑنا جائز نہیں۔

۔ اسی طرح آقا کے لیے روکنا جائز نہیں، البتہ اتنے وقت کی تنخواہ کاٹی جا سکتی ہے۔(عطر ہدایہ)

سرکاری ملازم کا کمیشن لینا رشوت ہے:

سرکاری ملازم کو حکومت ان کے فرائض منصبی کی ادائیگی پر باقاعدہ تنخواہ دیتی ہے اور جب حکومت کی طرف سے ان کی تنخواہ مقرر ہے، تو ان کے ذمہ عوام کا جو کام ہے اس کے کرنے پر عوام سے کمیشن لینا ہرگز جائز نہیں۔ یہ رشوت اور خیانت ہے جو شرعاً ناجائز اور حرام ہے، بعض صاحبِ منصب یہ کہتے ہیں کہ ہم ذاتی محنت اور کوشش سے ان کا کام کرا کے دیتے ہیں، ان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ یہ کام ان کے فرائض منصبی میں داخل ہیں، مثلاً: کسی شہری کو پاسپورٹ کی ضرورت ہے وہ افسر کے پاس جاتا ہے افسر کہتا ہے کہ بنا کردوں گا مگر اتنی رقم لوں گا یہ رشوت ہے اس کا لینا حرام ہے کچھ بھی تاویل کرے جواز کی کوئی صورت نہیں۔

حرام لباس تیار کرنے کی اجرت:

سونے، چاندی کے ایسے زیور جو صرف مرد استعمال کرتے ہیں اسی طرح وہ ریشمی لباس جو صرف مرد استعمال کرتے ہیں ایسے زیورات یا لباس تیار کر کے دینا اور ان کی اجرت حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ جس لباس کا استعمال مردوں کے لیے ناجائز اور عورتوں کے لیے جائز ہو لیکن دونوں استعمال کرتے ہوں تو اس کو تیار کرنا اور فروخت کرنا دونوں کام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہیں، کیونکہ مرد اگر اس کو استعمال کرے گا تو چونکہ وہ خود مختار ہے، لہٰذا گناہ اسی کی طرف منسوب ہوگا، جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں کام ناجائز ہیں۔(ماخوذ از عطر ہدایہ)

ڈاڑھی مونڈھنے کی اجرت حرام ہے:

واضح ہو کہ اپنی ڈاڑھی مونڈھنا یا ایک مشت سے کم کرنا حرام ہے ایسے ہی دوسرے کی ڈاڑھی مونڈھنا مقدارِ مذکورہ سے کم کرنا بھی حرام ہے، ڈاڑھی مونڈھنے کی اجرت وصول کرنا بھی حرام ہے، لہٰذا باربری کا پیشہ اختیار کرنے والے اپنی روزی حرام نہ کریں۔

ومن آفات الید حلق رأس المرأۃ ولحیۃ الرجل وقص اقل من قُبضۃ ولو باذن منہ لانہ اعانۃ علی معصیۃ فیکون معصیۃ ایضا.

(شرح طریقۃ محمدیہ)

دونوں ہاتھوں کے آفات (گناہوں) میں سے عورت کے سر کے بال یا مرد کی ڈاڑھی کا مونڈھنا اور مٹھی سے کم کا تراشنا بھی ہے چاہے یہ مونڈھنا اور کترنا اس مرد یا عورت کی اجازت سے ہی کیوں نہ ہو کیونکہ گناہ کے کام میں مدد کرنا ہے گناہ کے کام میں مدد اور بھی گناہ ہے۔

نیز ''کشاف القناع'' میں ہے کہ ڈاڑھی منڈھوانے کے لیے کسی کو اجرت دینا یا اجرت کا لینا دونوں حرام ہیں۔ (کشاف : ۹/٤ ، ماخوذ از داڑھی کی اسلامی حیثیت)

باغی حاکم کی فوجی نوکری کا حکم:

ایسے باغی حاکم کی فوجی نوکری کرنا ہمیشہ حرام ہے جو امام عادل سے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے یا کفار کی مدد سے مسلمانوں کو دھمکی دیتا ہے کیونکہ امن کی حالت میں تو اس کی فوج اللہ والوں کو ڈارتی ہے اور ان کو ان کے مبارک خیالات وعقائد سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے اور حالتِ جنگ میں تو علی الاعلان کلمۂ کفر اور علمِ بغاوت بلند کرتی ہے اور یہ لوگ اسلام اور اہل اللہ کی کھلم کھلا دشمنی پر اتر آتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) مگر ایسی نوکریاں بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نزدیک خدمات کی تاویل سے قابل اجرت ہیں اگر چہ گناہ سے خالی نہیں، صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک ایسی نوکری گناہ بھی ہے اجرت بھی حلال نہیں، خاص اسی کام کی اجرت بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والو! ایسی نوکری سے دور رہو۔ (عطر ہدایہ)

ٹیکسی ڈرائیور کا میٹر سے زیادہ کرایہ لینا:

بعض ٹیکسی ڈرائیور میٹر سے زیادہ کرایہ وصول کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ ڈرائیور پر حکومت کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کی پابندی کرنا لازم ہے، اس کے خلاف کرنا گناہ ہے، مگر اس کے باوجود اگر میٹر سے زیادہ کرایہ پہلے سے طے کر لیا جائے تو یہ اجرت حلال ہے۔

البتہ میٹر کو تیز کر کے دھوکے سے زیادہ اجرت لینا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کر لیا تو میٹر تیز کرنے کی وجہ سے جتنی اجرت زیادہ حاصل ہوئی ہے وہ حرام ہے، وہ رقم مالک کو واپس کر دینا فرض ہے اگر بعد میں خیال آیا کہ یہ زائد رقم حرام ہے اور اب مالک تک پہنچانا ممکن نہیں رہا تو مساکین پر صدقہ کرنا فرض ہے۔

گناہ کا کام کروانے کے لیے اجرت پر لینے کا حکم:

اس کے تین درجے ہیں:

1- مقود علیہ عین معصیت ہو، جیسے ناچ، گانا بجانا، زنا، چوری، جعل سازی، چغل خوری، تعزیہ بنانا، بت سازی، تصویر سازی، شراب کشی، شرک، کفر اور حرام کاموں کی ترویج اور بدعات وفسق وفجور، یہ اجارہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی اجرت لازم نہیں اس سے احتراز کرنا واجب ہے۔ ان گناہ کے کاموں کی انجام دہی سے جو اجرت یا نفع حاصل ہوا وہ ملک خبیث ہے اگر مالک معلوم ہو تو اسی کو واپس کرنا یا بلا نیتِ ثواب صدقہ کردینا واجب ہے۔

2- معقود علیہ کوئی اور مباح چیز ہو مگر اس کے ضمن میں گناہ اور فعل حرام کا ارتکاب پایا جائے، جیسے ایک شخص نے مطلق ملازمت اختیار کی لیکن آقا شراب فروخت کروائے یا ناقوس بجوائے، بت خانہ بنوائے، تعزیہ اٹھوائے یا مکان کرایہ پر دیا پھر اس میں زنا کاری ہو جوا بازی ہو یا رقص وغیرہ کی محفل منعقد ہو یا فوجی سپاہی کو دشمن سے لڑنے کے لیے بھیجا جائے اور اس میں خونِ ناحق بھی بہانا پڑے یا سپاہی سے ظلم کے قوانین نافذ کرانا ان سب صورتوں میں فعل حرام ہے ان امور کی انجام دہی سے گناہ لازم ہوگا لیکن آقا کے ذمہ تنخواہ واجب ہوگی۔

3- وہ اجارہ ایسے افعالِ ممنوعہ کی طرف منسوب ہو جیسے عقد ملازمت کے وقت ہی طے پایا کہ شراب فروخت کرنا ہوگی، یا تعزیہ اٹھوائیں گے، بت خانہ کی خدمت کرنا ہوگی یا عورت کو نوکر رکھا کہ خلوت میں پنکھے سے ہوا دیگی، پاؤں دبائے گی۔ اس میں امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک عقد کا اعتبار کرتے ہوئے اجرت ثابت ہوگی۔

صاحبین رحمہ اللہ کے نزدیک فعل کا اعتبار کرتے ہوئے یہ عقد حرام ہے اور اجرت بھی ساقط، مگر ایسے کاموں کو ترک کرنا بالاتفاق واجب ہے، خلاصہ یہ کہ امام صاحب رحمہ اللہ نفس عقد پر نظر فرماتے ہے وہ صحیح ہے یا نہیں اور اجرت کو عقد ہی سے معلق فرماتے ہیں اور صاحبین رح غرض اور انجام پر نظر فرماتے ہیں اگر وہ باطل ہو تو عقد کو باطل قرار دیتے ہیں۔ (عطر ہدایہ)

قال العلامة الصابوني: أن لا يكون العمل المستأجر له معصية، فلا يجوز الاستئجار على النوح على الميت، ولا على الملاهي، والرقص، والغناء الماجن، وسائر المنكرات، وما أخذ من الأجرة على

ذلك فحرام، يجب رده إلى صاحبه إن علم، وإلا فيجب إنفاقه للتخلص من إثمه، لأنه كسب خبيث، و " كل لحم نبت من السحت۔ أي الحرام۔ فالنار أولى به " كما ورد في الصحيح . كما لا يجوز للإنسان أن يؤجر نفسه لفندق تقام فيه الدعارة الزنى۔ ولا في مطعم يقدم فيه الخمر، ولا لبنك۔ مصرف۔ يتعامل بالربا، لأن من أعان على معصية كان شريكاً في الإثم، كما وضحته الأحاديث النبوية الشريفة . وقد نص الفقهاء على أن من استأجر رجلا ليقتل آخر ظلما، أو رجلا ليحمل له الخمر، أو أجر داره أو دكانه لمن يبيع بها الخمر، ويلعب فيها القمار، أو أجرا أرضه لمن يجعلها كنيسة، فإن هذه الإجارة فاسدة، لأنه اشتملت على معصية الله، وكل من المؤجر والمستأجر آثم . (فقه المعاملات)

شریک کو ملازم رکھنے کا حکم:

سوال: بیس آدمی مثلاً: اپنے مختلف المقدار سرمایہ سے ایک کمپنی بناتے ہیں اور کمپنی کے قواعد و ضوابط اور اختیارات بقدرِ سرمایہ نفع تقسیم کرنے اور کمپنی کو چلانے کے لیے ڈائریکٹر مقرر کرتے ہیں اور اُسے یہ اختیار دیتے ہیں کہ آپ کمپنی کو چلانے کے لیے ماہر عملہ کو تنخواہ پر مقرر کر سکتے ہیں خواہ شرکاء میں سے ہوں یا دوسرے باہر کے افراد ہوں۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ آیا اس کمپنی کے شرکاء میں سے اگر کوئی کمپنی کے کام میں شریک ہو، تو اس کو نفع کے علاوہ اپنے عمل اور کام کی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

بعض علماء نے اس معاملہ کے ناجائز ہونے کے لیے صفقة فی صفقة کو علت قرار دیا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: اس بارے میں فقہ حنفی میں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ سے کوئی روایت منقول نہیں، البتہ امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق شریک کو ملازم رکھنا جائز نہیں۔

اگر ملازم رکھا اور اس نے عمل کیا تو وہ اجرت کا حقدار نہیں ہوگا کیونکہ یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے اپنی ذات کے لیے کام کیا، لہٰذا اجرت کا مستحق نہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ اجارۃ المشاع کی طرح شریک کو اجیر رکھنے کے جواز پر متفق ہیں، نیز کمپنی کے شرکاء کو اجیر رکھنے کا تعامل بھی عام ہوگیا ہے، اس لیے اس زمانہ میں شریک کو ملازم رکھنا جائز ہے، جیسا کہ اس کی تائید مضاربت سے بھی ہوتی ہے، کہ مضارب عمل مشترک سے نفع حاصل کرتا ہے۔

وقال الامام المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : قال وإذا كان الطعام بين رجلين فاستأجر احدهما صاحبه او حمار صاحبه على ان يحمل نصيبه فحمل الطعام كله فلا اجرله، وقال الشافعي له المسمى، لان المنفعة عين عنده وبيع العين شائعا جائز، فصار كما إذا استأجر دارالمشتركة بينه وبين غيره ليضع فيها الطعام او عبدا مشتركا ليخيط له الثياب، ولنا انه استأجره لعمل لا وجود له لان الحمل فعل حسي لا يتصور في الشائع . (الهداية مع البناية : ٩/ ٣٧٠)

وقال الحافظ العيني رحمه الله تعالىٰ : (قال) اي في الجامع الصغير (وإذا كان الطعام بين رجلين فاستأجر احدهما صاحبه او حمار صاحبه على ان يحمل نصيبه فحمل الطعام كله فلا اجرله) يعني لا المسمى ولا اجر المثل وعلى قياس قول ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ ينبغي ان يجب اجر المثل كما في اجارة المشاع لكن الفرق ان فساد العقد هناك للعجز عن استيفاء المعقود عليه على الوجه الذي اوجبه العقد لا لانعدام الاستيفاء اصلا وهنا البطلان لتعذر الاستيفاء اصلا وبدون الاستيفاء لا يجب الاجر في العقد الفاسد .

وقال الكرخي في مختصره قال ابن سماعة عن محمد رحمه الله تعالىٰ (إلى قوله) ثم قال الكرخي قال محمد رحمه الله تعالىٰ وكل شيء استأجره من صاحبه مما يكون حملا فانه لا يجوز وإن عمله فلا اجر له وكل شيء ليس يكون عملا استأجر احدهما من صاحبه فهو جائز .

(انه استأجره لعمل لا وجود له) قيل هذا ممنوع بل لعمله وجود (الى قوله) وفيه نظر لان معنى قوله لا وجود له يتميز وجوده.

(لان الحمل فعل حسى لا يتصور فى الشائع) إذا لحمل يقع على معين والشائع ليس بمعين (الى قوله) فان قلنا إذا حمل الكل فقد حمل البعض لا محالة فيجب الاجر قلت حمل الكل حمل المعين ونصيبه ليس بمعين فيما وجد نصيبه . (البناية : ٩/ ٣٧٠، ٣٧١)

وقال العلامة معين الدين الهروى المعروف بملا مسكين : (وان استأجره لحمل طعام بينهما فلا اجرله له) اي إذا كان الطعام مشتركا بين رجلين فان استاجر إحدهما صاحبه او حمار صاحبه ليحمل نصيبه منه الى مكان كذا فحمل الطعام كله فلا اجر له لا المسمى ولا اجر المثل وقال الشافعي رحمه الله تعالىٰ له المسمى .

(شرح الكنز لملا مسكين مع الحاشية فتح المعين : ٣/ ٢٥٠)

وقال العلامة المفتى ابو السعود رحمه الله تعالىٰ : (قوله وقال الشافعي رحمه الله تعالىٰ له المسمى) وبه قال مالك واحمد رحمهما الله تعالىٰ عينى . (فتح المعين : ٣/ ٢٥٠)

وقال الحافظ العينى رحمه الله تعالىٰ : (وقال الشافعى رحمه الله تعالىٰ له المسمى لان المنفعة عين عنده وبيع العين شائعا جائز) وبه قال احمد رحمه الله تعالىٰ (فصار كما إذا استأجر دارا مشتركة بينه وبين غيره ليضع فيها الطعام او عبدا مشتركا ليخيط له الثياب) . حيث يجب الاجر . (البناية : ٩/ ٣٧٠)

وقال الإمام الحصكفى رحمه الله تعالىٰ : ولو استأجره ليحمل له نصف هذا العطام بنصفه الآخر لا اجرله اصلا لصيرورته شريكا .

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : قال فى التبين ومشايخ بلخ والنسفى يجيزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض

المنسوج لتعامل اهل بلادهم بذلك ومن لم يجوزه قاسه على قفيز الطحان والقياس يترك بالتعارف ولئن قلنا انه ليس بطريق القياس بل النص يتناوله دلالة فالنص يخص بالتعارف الا ترى ان الاستصناع ترك القياس فيه وخص من القواعد الشرعيه بالتعامل ومشايخنا رحمهم الله لم يجوزوا هذا التخصيص لان ذلك تعامل اهل بلدة واحدة وبه لا يخص الاثر بخلاف الاستصناع فإن التعامل به جرى فى كل البلاد وبمثله يترك القياس ويخص الاثر اهـ.

(ردالمحتار: ۵/ ۴۰ ـ ۴۱) (والتفصل فى احسن الفتاوىٰ: ۷/ ۳۲۱)

اجرت علی الطاعات کا حکم:

امامت، اذان، تدریس وغیرہ دیگر امور دینیہ کی انجام دہی پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں اس کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ اس بارے میں شریعت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ یہ سب کام عبادات ہیں اور عبادات کو خالص اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب لینے کے لیے انجام دینا چاہے، قرآن و حدیث نے بھی اس کی ترغیب دی ہے، بلکہ بعض روایات میں ایسے امور پر اجرت لینے پر وعید بھی آئی ہے، اس لیے فقہاء متقدمین کی رائے یہی تھی کہ ان طاعات پر اجرت لینا جائز نہیں جیسا کہ فی نفسہٖ نماز روزہ وغیرہ کی ادائیگی پر کسی اجیر سے اجرت لینا جائز نہیں، لیکن فقہاءِ متاخرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل تو یہی ہے کہ ان طاعات کو اللہ تعالیٰ کے لیے انجام دیا جائے اس پر اجرت نہ لی جائے، لیکن دوسری طرف لوگوں کی سستی وغفلت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان شعائرِ دینیہ کو بلا اجرت انجام دینے والے بہت کم لوگ رہ گئے اب اگر ایسی خدمات کے انجام دینے والوں کو اجرت نہ دی جائے تو دین کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لیے ابقاء دین کی مصلحت کے پیش نظر ان خدماتِ دینیہ، امامت، تدریس، قضاء، افتاء وغیرہ پر اجرت لینا جائز ہے البتہ جن عبادات پر ابقاءِ دین موقوف نہیں ہے، مثلاً: قرآن خوانی، فاتحہ خوانی، تہلیل خوانی، وغیرہ ان پر اجرت حاصل کرنا اب بھی حرام ہے۔ حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کہ اصل مذہب یہ ہے کہ کسی طاعت مقصودہ پر اجرت لینا جائز نہیں، مگر طاعات میں دوام اور پابندی کی ضرورت ہے اور وہ شعائر دین میں سے ہیں کہ ان کے بند ہونے سے دین میں خلل

لازم آئے گا اور ایسے کسی کو فرصت نہیں کہ ان امور کو مفت انجام دے، لہٰذا ایسے امور اس کلیہ (عدم جواز سے) مستثنیٰ ہیں (یعنی ان پر اجرت لینا جائز ہے)

باقی قرآن خوانی تہلیل خوانی وغیرہ کے متروک ہونے سے دین میں کوئی خلل نہیں آئے گا اس لیے یہ قاعدہ عدم جواز سے مستثنیٰ نہ ہوں گے۔ (ماخوذ از امداد الفتاویٰ: ۳/۳۳۴)

جواز کے سلسلہ میں علامہ صابونی فرماتے ہیں کہ چونکہ خلفاء راشدین اور بعد کے زمانہ میں ایسی خدمات انجام دینے والوں کے لیے حکومت کی طرف سے وظائف مقرر تھے لہٰذا وہ بے فکری کے ساتھ تنخواہ لیے بغیر ہی خدمات سرانجام دیتے تھے لیکن بعد کے زمانہ میں سرکاری وظیفہ کا سلسلہ بند ہو گیا، اب ضرورۃً اسکی اجازت دی گئی ہے اور درحقیقت یہ طاعات کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ جس وقت اور اپنے آپ کو پابند بنانے کا ایک معمولی صلہ ہے اب ان کی مکمل تحقیق نقل کی جاتی ہے۔

قال العلامة الصابوني: عرفنا مما تقدم أن أخذ الأجرة على الفرائض والواجبات والطاعات، لا يصح، لأنها فرائض دينية، فرضها الله على عباده، ولما كان الأذان، والإقامة، والإمامة من الشعائر الدينية الواجبة، فهل يصح أخذ الأجرة عليها؟

اختلف الفقهاء في ذلك، كما اختلفوا في أخذ الأجرة على تلاوة القرآن وتعليمه.

مذهب أبي حنيفة وأحمد:

أنه لا تصح الإجارة على شيء من الطاعات، كاستئجار من يقرأ القرآن ليهدي ثوابه إلى الميت، أو كمن يؤذن يؤم الناس في الصلاة، أو يعلم القراان والفقه والحديث، لأن هذه طاعات وعبادات، ينبغي أن تؤدى لوجه الله تعالىٰ.

واستدلوا بما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال:

"اقرءوا القرآن ولا تأكلوا به."

(أخرجه أحد وأبو يعلى، قال في فتح الباري: ٩/١٠١ وإسناده قوي)

أي لا تأخذوا أجرة تأكلونها مع قراءته، وبما روي عن عثمان

بن أبي العاص رضي الله عنه أنه قال: "آخر ما عهد إلي رسول الله صلى الله عليه وسلم أن لا أتخذ مؤذنا يأخذ على الأذان أجرا."

(أخرجه الترمذي رقم: ٢٠٩، والنسائي: ٢٠، ابن ماجه: ١/٣٣٦)

وقالوا: إن هذه الطاعات تقع من العامل عن نفسه، فلا يجوز أخذ الأجرة عليها من غيره، كالصوم والصلاة، وكل عبادة يحرم أخذ الأجرة عليها، كالأذان والإمامة وقراءة القرآن، لأنه يؤديها قربة صلى الله عليه وسلم؟ فهي له، ينال أجرها من الله، لقوله سبحانه: ﴿وأن ليس للإنسان إلا ما سعى﴾.

وكذلك تعليم القرآن واجب ديني، فلا يصح أخذ الأجرة عليه، كما لا يجوز أخذ الأجرة على تعليم الفقه، والحديث، وسائر العلوم الشرعية، لأنها واجبات دينية.

وهذه نظرة مثالية رائعة، تسمو بقدسية العلم إلى آفاق سامية، وتجعل نشره وتعليمه فريضة على المسلم، عليه أن يؤديها، كما يؤدي الصوم والصلاة، وقد قال صلى الله عليه وسلم: "من سئل عن علم فكتمه ألجم يوم القيامة بلجام من نار."

(أخرجه الترمذي رقم: ٢٦٥١، وأبو داؤد رقم: ٣٦٥٨)

فهل هناك نظرة أعلى وأسمى، من هذه النظرة الكريمة، إلى قداسة العلم ومكانته؟ ولكن هل تتحقق مثل هذه النظرة من هذا العصر المادي؟

لقد أفتى المتأخرون من فقهاء المذهب، بجواز أخذ الأجرة على تعليم القرآن والفقه والحديث، لئلا تضيع العلوم الشرعية، ويذهب العلم وأهله، بعد أن انقطعت العطايا والهدايا من بيت مال المسلمين للعلماء، بانهدام الخلافة الإسلامية، وضياع بيت مال المسلمين.!

قال في كتاب الاختيار : ولا تجوز الإجارة على الطاعات، كالحج، والأذان، والإمامة، وتعليم القرآن والفقه، وبعض أصحابنا المتأخرين قال يجوز على التعليم، والإمامة في زماننا، وعليه الفتوىٰ لحاجة الناس إليه، وظهور التواني في الأمور الدينية، وكسل الناس في الاحتساب، فلو امتنع الجواز، يضيع حفظ القرآن .

(الاختيار لتعليل المختار : ٢/٦٠)

وقال في المغني : وما كان من القرب ـ أي العبادات ـ كالإمامة، والأذان، وتعليم القرآن، فلا يجوز اخذ الأجرة عليه، وبه قال أبو حنيفة ...... وكره الزهري تعليم القرآن بأجر، وقال ابن شقيق : هذه الرغف التي يأخذها المعلمون من السحت ـ أي الحرام .

وعن أحمد رواية أخرى : يجوز ذلك، وروي عنه أنه قال : التعليم أحب إلي من أن يتوكل لهؤلاء السلاطين، ومن أن يستدين ويتجر، لعله لا يقدر على الوفاء، فيلقى الله بأمانات الناس، التعليم أحب إليّ !!

وهذا يدل على أن منعه كان للكراهة لا للتحريم، وممن أجاز ذلك مالك، والشافعي، لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم زوج رجلا بما معه من القرآن، وإذا جاز تعليم القرآن في باب النكاح، وقام مقام المهر، جاز أخذ الأجرة عليه في الإجازة .

ووجه الرواية الأولى " التحريم " ما ورد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال : " اقرءوا القرآن، ولا تغلوا فيه، ولا تجفوا عنه، ولا تأكلوا به، ولا تستكثروا به ."

(والحديث اخرجه احمد فى المسند : ٣/٤٢٨)

لأن هذا قربة إلى الله، فلم يجز أخذ الأجر عليه، فأما أخذ الأجرة على الرقية، فإن أحمد اختار جوازه وقال : لا بأس به، للحديث

الصحيح الوارد فيه، لأن الرقية نوع مداوة .

(المغني لابن قدامه الحنبلي : ١٧/١٣٦)

مذهب المالكية والشافعية :

وذهب المالكية والشافعية إلى جواز أخذ الأجرة على تعليم القرآن والعلم، لأنه استئجار لعمل معلوم، بأجر معلوم، وكما يجوز أخذ الأجرة على تعليم القرآن، يجوز أخذها على الحج، والأذان، لأنها مقابل الالتزام بما كلف به، واستدلوا بما رواه البخاري عن ابن عباس رضي الله عنهما " أن نفرا من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم مروا بماء فيه لديغ، فعرض لهم رجل من أهل الماء، فقال : هل فيكم من راق ؟ فإن عندنا رجلا لديغا، فانطلق رجل منهم، فقرأ بفاتحة الكتاب على شياه، ـ فشفي الرجل ـ فجاء بالشياه إلى أصحابه، فكرهوا ذلك، وقالوا : أخذت على كتاب الله أجرا !!

حتى قدموا المدينة فقالوا : يا رسول الله صلى الله عليه وسلم : أخذ على كتاب الله اجراً !! فقال صلى الله عليه وسلم : " إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله ."

(أخرجه البخاري في كتاب الاجارة والطب : ٩٠/١٩٩)

فدل الحديث على جواز أخذ الأجر، على قراءة القرآن الكريم، ويقاس عليه سائر العلوم الدينية .

قال ابن حزم : والإجارة جائزة على تعليم القرآن، وعلى تعليم العلم، مشاهرة وجملة، كل ذلك جائز، كما تجوز على الرقى ـ أي القراءة على المريض . وعلى نسخ ان مصاحف، ونسخ كتب العلم، لأنه لم يأت في النهي عن ذلك نص بل قد جاءت الإباحة ، والله أعلم .

أقول : إن الفتوىٰ قد استقرت على جواز أخذ مرتب على تعليم

القرآن، والفقه، والعلوم الدينية، وعلى الأذان، والإمامة، والخطابة، من المتأخرين من الفقهاء و هذا الذي يتفق مع عصرنا الذي طغت فيه المادة، وقل فيه من يعلم الناس العلم لوجه الله، ولا بد من تأمين حاجات المعلمين، والأئمة والخطباء، والمال الذي يأخذونه ليس على الأذان والإمامة إنما هو مقابل الجهد الذي يبذلونه، والتفرغ لهذا العمل الجليل، والانقطاع له، حتى يؤدي المعلم واجبه في خدمة الدين والمسلمين . (فقه المعاملات)

وعظ کہنے پر اجرت لینے کا حکم:

وعظ کہنے پر اجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں اس بارے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ اجرت علی الطاعات میں داخل ہے اس لیے جائز نہیں لیکن بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جائز ہے، چنانچہ دونوں اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر وعظ کہنے کی نوکری اختیار کر لی جائے امامت کی طرح تو اجرت لینا جائز ہے اور اگر (مستقل) نوکری نہیں کی، بلکہ عین وقت پر اجرت لینے کی شرط طے کرے، (یعنی کسی کو وقتی طور پر وعظ کے لیے بلایا جائے اور وہ اجرت دینے کی شرط رکھے) تو یہ صورت جائز نہیں جیسے کوئی مستقل امام نہ ہو بلکہ نماز کا وقت ہو گیا اور وہ مسجد میں موجود ہے اس کو نماز کے لیے کہا گیا تو عین وقت پر امامت پر اجرت مانگنے لگے، یہ بھی جائز نہیں۔'' (امداد الفتاویٰ بتغیر یسیر)

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اگر کسی کو وعظ کہنے کے لیے ملازم رکھا گیا ہے یا کسی نے اپنے کو اسی کام کے لیے فارغ کر رکھا ہے کہ کوئی کہیں بھی وعظ کہلوانے کے لیے لے جا سکتا ہے تو اس صورت میں وعظ پر اجرت لینا جائز ہے اگر کسی خاص موقع پر کسی عالم سے وعظ کہنے کی درخواست کی جائے تو وعظ پر اجرت لینا جائز نہیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۳۰۰)

ریڈیو پر تلاوت کرنے اور تفسیر بیان کرنے کی اجرت:

سوال: ریڈیو پر قرآن کریم کی تلاوت اور تفسیر بیان کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: محض تلاوت دو وجہ سے ناجائز ہے:

1- عموماً تلاوت کرنے والا اجرت لیتا ہے اور تلاوت محضہ پر اجرت لینا حرام ہے۔

2- اسی مجلس میں گانا بجانا بھی ہوتا ہے جس میں قرآن کریم کی توہین ہے، لہٰذا اس کا سننا بھی جائز نہیں۔

البتہ تفسیر بیان کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ۱۹۹/۸)

جانور چرانے کی اجرت میں نصف جانور دینا:

زید نے بکر کو ایک گائے نصف بٹائی پر دی کہ اس کو کھلاتے رہو جب یہ بچہ دے گی تو بچہ آپ کا اور گائے میری ہوگی، اس کو نصف بٹائی کہا جاتا ہے، اسی طرح کی اور بہت سی صورتیں مختلف علاقوں میں رائج ہیں جس میں اجرت مجہول ہوتی ہے اور مدت بھی اکثر مجہول ہوتی ہے حالانکہ صحت اجارہ کے لیے دونوں کا معلوم ہونا ضروری ہے، اس لیے یہ اجارہ فاسد ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ اجارہ فاسد ہے، اس لیے کہ اس میں اجرت اور مدت دونوں مجہول ہیں، چرانے والے کو اجر مثل ملے گا اور بچہ گائے کے مالک کا ہوگا۔''

قال فی التنویر و شرحه : فکل ما افسد البیع مما مر یفسدها کجهالة ماجور واجرة او مدة او عمل و کشرط طعام عبد و علف دابة و مرمة الدار الخ . (ردالمحتار : ۳۲/۵)

وقال العلامة المرغینانی رحمه الله : بخلاف دفع الغنم والدجاج و دود القز معاملة بنصف الزوائد لانه لا اثر هناك للعمل فی تحصیلها فلم یتحقق الشرکة . (هداية : ٤٢٥/٤)

قال فی الهندیة : ولا تجوز اجارة الشجر علی أن الثمر للمستأجر و کذالك لو استاجر بقرة أو شاة لیکون اللبن أو الولد له کذا فی محیط السرخسی .

(عالمگیریة : ٤٤٣/٤) (أحسن الفتاویٰ : ۳۰۹/۷)

البتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کتب إلی بعض الاصحاب من فتاوی ابن تیمیه کتاب

الاختيار ان ما نصه لو دفع دابته أو نخله إلى من يقوم له وله جزء من نمائه صح وهو رواية عن احمد . " (٤/٨٥)

پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد نا جائز ہے، کما نقل عن العالمگیریۃ، لیکن بناء بر نقل بعض اصحاب امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز (اجتناب) احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو تو توسع کیا جا سکتا ہے۔ (امداد الفتاوی : ۳/۳٤۳)

دلال کی اجرت جائز ہے:

خرید وفروخت و دیگر معاملات جن کو آدمی ناواقف ہونے کی بناء یا فرصت نہ ہونے کی بناء پر خود انجام نہیں دے پاتا اب جو شخص دلال (ایجنٹ) بن کر یہ کام انجام دے رہا ہو، شرعاً اس کے لیے اجرت لینا حلال ہے یا نہیں، اس بارے میں مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اجرتِ دلال کے بارے میں فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی عبارات مختلف ہیں، مگر لوگوں کی ضرورت اور حاجت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواز کا قول مختار اور مفتیٰ بہ ہے۔ البتہ بوقت عقد تعیین اجرت ضروری ہے۔

قال في التتارخانية : وفي الدلال والسمسار يجب اجر المثل وما تواضعوا عليه إن في كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم، وفي الحاوي سئل محمد بن سلمة عن اجرة السمسار فقال ارجو انه لا باس به وإن كان في الاصل فاسداً لكثرة التعامل و كثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام .

(ردالمحتار : ٥/٤٤)

اجرة السمسار والمناوي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة .

(ردالمحتار : ٥/٣٢) (احسن الفتاوی : ٧/٢٧٣)

کمیشن پر چندہ کرنے کا حکم:

بعض اہل مدارس چندہ کے لیے سفراء مقرر کرتے ہیں اور یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ حاصل شدہ چندہ کا تہائی یا چوتھائی حصہ بطورِ اجرت دیا جائے گا شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ '' حنفیہ کے اصول پر یہ اجارۂ فاسد ہے دوسرے مذاہب کی تحقیق نہیں۔'' (امداد الفتاوی : ۳/۳۷۶)

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ دو وجہ سے جائز نہیں:

1- اجرت من العمل ہے لہٰذا قفیز الطحان کے حکم میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

2- اجیر اس عمل پر بنفسہٖ قادر نہیں، بلکہ قادر بقدرۃ الغیر ہے، اس کا عمل چندہ دینے والوں کے عمل پر موقوف ہے اور قادر بقدرۃ الغیر بحکم عاجز ہوتا ہے جبکہ صحت اجرۃ کے لیے قدرت بنفسہٖ شرط ہے، چنانچہ قفیز الطحان کے فساد کی علت بھی یہی ہے کہ مستاجر قادر علی الاجرۃ بقدرۃ العامل ہے بنفسہٖ قادر نہیں۔

جب کہ حسب تصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ بقدر عقد اجیر کا قادر علی العمل ہونا اور مستأجر کا قادر علی تسلیم الاجرۃ ہونا صحت عقد کے لیے شرط ہے۔

البتہ اس معاملہ کو صحیح بنانے کی یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ اجرت من العمل کا ذکر بطورِ شرط نہ ہو بلکہ صرف تعیین وتحدید کے لیے ہو یہ مفسد نہیں، یعنی قفیز الطحان میں اگر یہ شرط نہ ہو کہ اسی طحین (پسے ہوئے آٹا) سے دیا جائے گا تو جائز ہے۔

(ماخوذ از احسن الفتاوی : ۷/۲۷۶)

کرایہ پر لی ہو چیز دوسرے کو کرایہ پر دینے کا حکم:

زید نے مثلاً: ایک زمین آدھی پیداوار کے عوض کرایہ پر لی اب اس کا کچھ حصہ آگے دوسرے کو تہائی پیداوار پر بطورِ کرایہ کے دیتا ہے یا مال منتقل کرنے کے لیے جہاز میں ایک جگہ کرایہ پر حاصل کی پھر اس کا ایک حصہ دوسرے کو کرایہ پر دیتا ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے۔ بشرطیکہ اپنے موجر (یعنی جس سے کرایہ پر لی) کے ساتھ نہ ہو اور اجرتِ اولیٰ سے کم پر ہو اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ کے ساتھ ہو تو زائد رقم حلال نہ ہوگی اس کا تصدق واجب ہوگا۔

اِلا یہ کہ دوسرا عقد پہلے عقد کے خلاف جنس سے ہو، یا یہ کہ کرایہ دار اس میں کوئی مرمت واصلاح کرے، مثلاً: اگر مکان ہو تو اس کی مرمت، رنگ وروغن وغیرہ کرے، اگر زمین ہو تو اس کی نالی وغیرہ درست کرے۔

وفی الهندية : وإذا استاجر دار وقبضها ثم اجرها فإنه يجوز ان اجرها بمثل ما استاجرها او اقل وإن اجرها باكثر مما استاجرها فهي جائزة ايضا الا انه إن كانت الاجرة الثانية من جنس الاجرة الأولى فإن الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها، وإن كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة ولو زاد في الدار زيادة كما لو وتد فيها وتدا أو حفر فيها بئرا او اصلح ابوابها أو شيئا من حوائطها طابت له الزيادة .

(الفتاوىٰ الهندية : ٤/ ٤٢٥ ، كتاب الاجارة)

قال ابن عابدين رحمه الله : (قوله المستاجر ان يوجر الموجر الخ) اي ما استاجر بمثل الاجرة الأولى او ما نقص، فلو باكثر تصدق بالفضل الا في المسئلتين كما مر اول باب ما يجوز من الاجارة.

(ردالمحتار : ٦/ ٩١ مسائل شتىٰ، مطلب في اجارة المستاجر)

تعویذ پر اجرت لینا جائز ہے:

تعویذ کے جواز کی شرائط یہ ہیں کہ

1- الفاظ صحیح ہوں۔
2- الفاظ منقولہ یعنی قرآن وحدیث میں وارد شدہ ہوں۔
3- شرکیہ الفاظ نہ ہوں۔
4- تعویذ کو مؤثر بالذات نہ سمجھے

اگر یہ شرائط پائی جائیں تو تعویذ جائز ہے اور اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے، کیونکہ تعویذ علاج کے حکم میں ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : لان المتقدمين المانعين الاستيجار مطلقاً جوزوا الرقية بالاجرة ولو بالقرآن كما ذكره الطحاوى لانها ليست عبادة محضه بل من التداوى .

(ردالمحتار : ٦/ ٥٧ باب الإجارة الفاسدة)

ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے:

سوال: مثلاً اسکولوں کے اساتذہ نے حکومت کے سامنے کچھ مطالبات پیش کیے لیکن حکومت نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا بار بار یاددہانی کے باوجود حکومت نہیں مانی تو اساتذہ نے مجبور ہو کر ہڑتال کر دی اور طالبعلموں کو پڑھانا چھوڑ دیا لیکن خود اسکول میں پابندی سے حاضری دیتے رہے، تو کیا ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ حلال ہوگی؟ جبکہ انہوں نے پڑھایا نہیں؟

جواب: چونکہ جمہوری حکومتوں میں ملازمین کو ہڑتال کرنے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں، ان کی تنخواہ حلال ہوگی۔ (ماخوذ از فتاویٰ حقانیه : ٦/٢٦١)

ویزہ نکلوانے پر رقم وصول کرنے کا حکم:

ایک آدمی کو دوسرے ملک کے ویزہ کی ضرورت ہے، لیکن خود حاصل کرنا دشوار ہے، اب ایک دلال مقررہ فیس سے کئی گناہ زیادہ رقم لیکر ویزہ حاصل کر کے اس کے حوالے کرتا ہے تو اس معاملہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب: اگر ویزہ اس آدمی کا حق بنتا ہو مگر بغیر رشوت حاصل نہ کر سکتا ہو، تو دینے والے کے لئے حرام نہیں البتہ رشوت لینے والے کے لئے حرام ہے، اب جو آدمی درمیان میں کام کر رہا ہے، اس کی اجرت کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ باقاعدہ طور پر بھاگ دوڑ کر کے وقت خرچ کر کے اس کام کو انجام دیتا ہے تو اس کی اجرت جائز ہوگی۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: اهل بلدة تقلت عليهم المؤنات فاستاجروا رجالا باجر معلوم ليذهب الى السلطان ويرفع القصه يخفف عنهم السلطان نوع تخفيف واخذ الاجر من عامة اهل البلدة من الاغنياء والفقراء، قالوا: ان كان بحال لوذهب الى بلدة السلطان يتهيء اصلاح فی يوم أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل المقصود فی يوم أو يومين وانما يحصل فی مدة فان وقتو الاجارة وقتاً جازت الاجارة وله كل المسمى وان لم يؤقتوا فسدت الاجارة وكان له الاجر المثل على اهل البلدة على قدر مؤنتهم ومنا فعهم.

(فتاویٰ قاضی خان : ٣/١٨، باب الاجارة الفاسدة)

مکانوں اور دکانوں کی پگڑی کا حکم:

آج کل مکانوں اور دکانوں کی پگڑی کا عام رواج ہو گیا ہے جس کا نام حق قرار بھی ہے، بسا اوقات مالک مکان ردکان اپنا مکان، دکان طویل مدت کے لئے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یکمشت لیتا ہے، کرایہ دار یکمشت رقم دے کر اس بات کا حقدار ہو جاتا ہے کہ کرایہ دار طویل مدت تک یا تاحیات باقی رکھے پھر بسا اوقات کرایہ دار اپنا حق دوسرے کرایہ دار کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور اس سے یکمشت رقم وصول کرتا ہے اور اس معاملہ کو عرف میں پگڑی فروخت کرنا کہا جاتا ہے اب رقم ادا کرنے کے بعد دوسرا شخص مالک مکان دکان سے عقد اجارہ کا حقدار ہو جاتا ہے یا اگر مالک مکان دکان کرایہ دار سے مکان یا دکان جو واپس لینا چاہے تو اس کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے کہ کرایہ دار کو اتنی رقم ادا کرے جس پر دونوں راضی ہوں اس یکمشت لی جانے والی رقم کو مختلف بلاد عربیہ میں ''خلو'' کہا جاتا ہے جبکہ ہند و پاک میں ''پگڑی'' یا ''سلامی'' کہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے یہ لینا جائز ہے یا ناجائز؟

شرعاً اس کا لین دین دونوں ناجائز ہیں کیونکہ یہ رقم یا تو ''رشوت'' ہے یا ''حق مجرد'' کا عوض ہے اب اگر کسی نے ایسا معاملہ کر لیا تو دونوں فریق پر توبہ کرنا اور اس رقم کو واپس کرنا لازم ہے۔

قال العلامة الصابونی: اذا نتهت مدةُ الاجارة، فعلی المستأجر أن یسلمها لصاحبها، ولیس له حق فی أن یخلیها لغیره، علی أن یأخذ منه مبلغاً فی نظیر الاخلاء، کما یفعله بعض الناس الیوم، لأن ملك الدار أو الدکان لصاحبها المالك، فتکون المنفعة له، لاللمستأجر، یتحکم فیها کیف شاء، وهذا الذی یسمیه الناس "حق الخلو" أو "حق نقل القدم" لیس بالأمر الشرعی.

ویمکنه أن یستأجرها مدة أخریٰ، ثم یؤجرها لغیره، أو یأخذ قیمة الزینة المسمی "الدیکور" من المستأجر الثانی، ویتعاقد هذا المستأجر مع مالکها، الأصلی بالمبلغ الذی یتفقان علیه أمّا أن یأخذ ماشاء من خلو، کأنه مالکها، ویمنع مالکها من تأجیرها الأن یرضیٰ بذلك المالك، وکما لایحق للمستأجر أن یفوت علی المؤجر

التصرف بملكه، كذلك لايجوز للمالك أن يضيع حق المستأجر، فيما أنفق على المحل من مالٍ لتحسين المحل و تزيينه، بل يكرمه ويرضيه، فهذا هو شرع الله وينه المحكم العادل ﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾

قال الشيخ خليل فى الموسوعة الفقهية :

الخلو المعروف الآن فى زماننا أن يستأجر شخصٌ دكاناً مثلاً: بأجرةٍ شهرية أو سنوية، ثم يريد اخلاء ه لغيره، على أن يأخذ منه مبلغاً فى نظير الاخلاء، وهو غير صحيح عند جمهور العلماء، لأنّ يد المستأجر عليه، يدُأمانة، لايستحقُّ أن يأخذ عليها شيئاً،و الدكان ليست ملكاً له .

ولا يُقال هذه ضرورة لا يمكن الاحتراز عنها فتحل، فان الضرورة هى التى لا يمكن لأحدٍ أن يتجنّبها، مثل ضرورة ماء، أى طين، الشوارع فى الشتاء، ولأنه لو صحَّ بيعه لأحدٍ لصح لمالكه .

(الموسوعة الفقهية : ٣٥٥/٦)

وقد قال بعض العلماء المتأخرين، يجوز للمستأجر أن يأخذ شيئاً، مقابل تنازله عن اختصاصه بمنفعة العقار المأجور،لشخص آخر يحلُّ محلَّه، بناءً على العرف الخاص فى التنازل عن الوظائف، الذى أفتى به بعضُ المتأخرين، والخلو عند الفقهاء معناه أن توجد مثلاً: دار خربة، أوأرضٌ موقوفة وليس للواقف ريعٌ يعمر به الأرض، فيدفع شخص مبلغاً لجهة الوقف لبناء الأرض، أو تعمير الدار الخربة، على أن يدفع أجرةً كلَّ سنة تسمى " حِكْراً " فهو يملك المنفعة، وتسمى هذه المنفعة با الخلو، وهذا الذى ذكره الفقهاء غير الخلو فى زماننا، ومن هذا يتبيَّن لنا أنه لا يجوز اخلاء لغيره على أن يأخذ منه مبلغاً فى نظير الاخلاء، فانه من قبيل أكل أموال الناس بالباطل،

ولیس الأمر کما یدّعیه البعض من أنه یجوز عملاً بعرف الناس، فانه لاقیمة للعرف اذا خالف النصَّ، فانه لا یجوز أن یُقال :یباح شرب الخمر مثلاً: فی هذا الزمان استناداً الی العرف . (فقه المعاملات)

خلاصہ یہ ہے کہ بعض عبارات فقہاء سے بعض علماء کو مروجہ پگڑی کے جواز کا شبہ ہوا کہ وہ اس کو ''جدک'' پر قیاس کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''جدک'' اور ''خلو'' دونوں جدگانہ الگ الگ چیزیں ہیں، اس لئے خلو کو جدک پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ الرحمہ نے تنقیح الحامدیہ میں ذکر کیا ہے چنانچہ موصوف ''سکنیٰ'' کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"وهو غیر الخلو الذی هو عبارة عن القدمیة ووضع الید، خلا فالمن زعم هو، واستدل بذلك علی جواز بیع الخلو، فانه استدلال فاسد، لما علمت من ان السکنی اعیان قائمة مملو كة، کما اوضحه العلامة الشر نبلالی فی رسالة خاصة لکن اذا کان هذا الجدك المسمی بالسکنی قائما فی ارض وقف فهو من قبیل مسألة البناء او الغرس فی الارض المحتکرة، لصاحبه الاستبقاء باجرة مثل الارض، حیث لاضرر علی الوقف، وان ابی الناظر، نظراً للجانبین علی ما مشیٰ علیه فی متن التنویر.......... ولا ینافیه ما فی التجنیس من ان لصاحب الحانوت ان یکلفه رفعه، لان ذاك فی الحانوت الملك، بقرینة مافی الفصولین : والفرق ان الملك قد یمتنع صاحبه عن ایجاره، ویریدان یسکنه بنفسه او یبیعهُ او یعطله، بخلاف الموقوف المعد لا یجار، فانه لیس للناظر الاان یوجره، فایجاره من ذی الید باجرة مثله اولیٰ من ایجاره من اجنبی لما فیه النظر للوقف ولذی الید. " (تنقیح الفتاویٰ الحامدیة لابن عابدین : ۲/ ۲۰۰)

''سکنیٰ'' اس خلو کے علاوہ ہے جو محض پرانا کرایہ دار ہونے اور قابض ہونے کا نام ہے ان لوگوں کے برخلاف جن کا یہ گمان ہے کہ ''سکنیٰ'' ہی ''خلو'' ہے اور اس سے ''خلو'' کی بیع کے جواز پر

استدلال کیا ہے یہ استدلال فاسد ہے کیونکہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ ''سکنی'' پائیدار اور مملوک اعیان کا نام ہے جیسا کہ علامہ شرنبلالی نے ایک مستقل رسالہ میں اس کی وضاحت کی ہے، لیکن اگر یہ ''جدک''، جس کو ''سکنی'' کہا جاتا ہے وقف کی زمین میں قائم ہو تو یہ اسی طرح کی چیز ہوگی جیسا کہ محکرہ زمین میں عمارت تعمیر کرنے یا درخت لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اس صورت میں صاحب جدک کو کرایہ مثل دے کر اسے اپنے قبضے میں باقی رکھنے کا اختیار ہے کرایہ مثل کی شرط اس واسطے ہے تاکہ وقف کا نقصان نہ ہو، اگر چہ وقف کا متولی اس پر راضی نہ ہو، دونوں فریقوں کی رعایت کرتے ہوئے یہی قول التنویر میں اختیار کیا گیا ہے......... التجنیس میں یہ جو لکھا ہوا ہے کہ دوکان کے مالک کو اختیار ہے کہ کرایہ دار کو جدک ہٹانے پر مجبور کرے یہ بات ہماری مذکورہ بالا بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ التجنیس میں جو بات لکھی ہوئی ہے وہ اس دوکان کے بارے میں ہے جو شخصی ملکیت ہے اس کا قرینہ جامع الفصولین کی یہ عبارت ہے: ملکیت اور وقف میں فرق یہ ہے کہ جو مکان شخصی ملکیت ہو اس کا مالک مکان کبھی اس کو کرایہ پر دینے سے باز آجاتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خود اس میں رہائش اختیار کر لے یا اسے فروخت کر دے یا معطل چھوڑ دے لیکن جو مکان وقف کی ملکیت ہے اور کرایہ پر دینے کے لئے بنایا گیا ہے اس کے بارے میں وقف کے متولی کو کرایہ پر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، لہٰذا اس مکان پر جس شخص کا قبضہ ہے اسی کو اجرت مثل پر کرایہ پر دینا کسی اجنبی شخص کو کرایہ پر دینے سے زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ اس میں وقف اور صاحب قبضہ دونوں کی مصلحت کی رعایت ہے۔''

مروج پگڑی کا متبادل:

ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ دکان یا مکان کرایہ پر لیتے وقت ''پگڑی'' یا سلامی کے نام سے جو رقم وصول کی جاتی ہے، شرعاً اس کا لین دین ناجائز ہے، اس لئے ایسا معاملہ کرنے سے اجتناب کیا جائے، البتہ پیشگی کرایہ وصول کرنا جائز ہے، لہٰذا اس کی جائز صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کرایہ کا معاملہ کرتے وقت کرایہ دار سے خاص مقدار میں یک مشت رقم لے لی جائے، جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، اب آگے، ماہانہ کرایہ کے ساتھ اس رقم کا ایک حصہ کٹوا دے، یا یہ کہ جب تک یہ رقم ختم نہ ہو مزید کرایہ وصول نہ کیا جائے اور اگر جتنے مہینے کا کرایہ بنتا ہے اس سے پہلے اجارہ فسخ ہو جائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ حساب کر کے بقیہ رقم واپس

کردے۔

ناجائز ملازمت کی پنشن کا حکم:

ایک شخص کوئی ناجائز ملازمت کر رہا تھا، اب پینشن مل رہی ہے، تو کیا اس پینشن سے اس کو یا کسی دوسرے کو انتفاع کرنا جائز ہے؟

اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی پینشن جائز ہے بشرطیکہ پینشن دینے والے ادارے کے ذرائع آمدن حلال ہوں، ورنہ اصل تنخواہ کی طرح اس پینشن کا لینا بھی حرام ہوگا، جیسے بینک کی پینشن کہ تنخواہ اور پینشن دونوں سود سے دیجاتی ہیں۔(احسن الفتاوی: ۳۱۷/٤)

نکاح خوانی کا حکم:

نکاح پڑھانے کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ اس سے اجرت لی جائے جس نے بلایا ہے اور وہی شخص اجرت لے جس نے نکاح پڑھایا ہے اور یہ جو رواج ہے کہ بلانے والا لڑکی والا ہوتا ہے اور اجرت لڑکے والے دیتے ہیں یہ ناجائز ہے۔

نیز یہ رواج بھی ناجائز ہے کہ نکاح پڑھانے والے کو تھوڑی سی اجرت دیکر باقی روپیہ قاضی کو بطور حق کے دیا جاتا ہے، قاضی نے جب کام نہیں کیا اس کا حق کچھ نہیں۔

(امداد الاحکام: ۶۱۱/۳، کتاب الاجارہ)

البتہ قاضی اگر نکاح رجسٹرار ہو تو سرکاری فیس اور فارم کی لکھوائی وصول کرسکتا ہے، جو پہلے سے متعین کرلی جائے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔

مدرسہ کا مکان بینک کو کرایہ پر دینا:

مدرسہ کا مکان یا دکان بینک کو کرایہ پر دینا اعانۃ علی المعصیت ہونے کی وجہ سے شرعاً ممنوع ہے، سود کی برائی اور وعیدوں کے پیش نظر مدرسہ کا مکان/دکان بینک کو کرایہ پر دینے کی جرأت نہ کی جائے اگرچہ کرایہ زیادہ ملتا ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبك کثرۃ الخبیث فاتقوا اللّٰه یا اولی الالباب لعلکم تفلحون ﴾ (المائدۃ)

"آپ فرمادیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو تجھ کو ناپاک کی کثرت تعجب میں ڈالتی ہو

پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم کامیاب ہو۔'' (مائدہ) (فتاویٰ رحیمیہ: ۲۹۱/۷)

ناجائز اشیاء فروخت کرنے والے پر ملازمت کا حکم:

ایسی دکان میں ملازمت کا حکم جہاں ناجائز اشیاء کی فروخت، سودی لین دین اور دھوکہ فریب ہو اسی طرح جس دکان میں ناجائز خرید وفروخت ہو اس میں ملازمت کا کیا حکم ہے اس سلسلہ میں اس طرح کا سوال جواب امداد الاحکام سے نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: ایک بڑی دکان پر مختلف قسم کی اشیاء جائز و ناجائز فروخت ہوتی ہیں، مگر بمقابلہ اشیاء ناجائز کے کثرت اشیاء جائزہ کی ہے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ معاملات بیع وشراء میں سودی معاملہ بھی کبھی کبھی برتا جاتا ہے، اگرچہ تاجر دوکان مشتری سے سود لیتا تو کم ہے مگر بعض اوقات خود دوسرے کو دینے سے چارہ نہیں ہوتا، اس دوکان پر متعدد ملازم ہوتے ہیں جن میں بعض جاہل محض ہوتے ہیں اور بعض کچھ شدبد والے، یہ ملازم دغا کذب وغیرہ بے کھٹکے اعلیٰ درجہ کا برتتے ہیں اور مالک دوکان باوجود وقوف آگہی کے ان افعال پر ملازمین سے کچھ تعرض نہیں کرتا۔

حاصل یہ کہ اس دکان پر ایک روپیہ میں آٹھ آنہ سے زائد کی نسبت سے لین دین کذب و دغا برتی جاتی ہے اور بعض معاملات بیع فاسد کے بھی ہوتے ہیں (مگر یہ بیع فاسد کے معاملات بوجہ لاعلمی مسائل فقہیہ ہوتے ہیں) پس ایسی دوکان پر ملازمین از قسم منشی گری، یا تعلیم اطفال، یا خرید وفروخت اشیاء دوکان درست ہے یا نہیں؟ اور یقین کامل ہے کہ تنخواہ اس ہی رقم دوکان سے ملے گی اور ایسی دوکان پر بطور مہمان دعوت کھانا، یا پان وچائے معمولی اشیاء دوستانہ رسم کی خورد ونوش درست ہے یا نہیں؟

جواب: سود دینے سے دُکان کے مال میں حرمت نہیں آتی، دینے والوں کو گناہ ہوتا ہے اگر بدون سخت مجبوری کے دیں اور سود لینا مسلمان سے تو مطلقاً حرام ہے اور کفار سے لینا بھی بعض علماء کے نزدیک حرام ہے، مگر جب وہ قلیل ہے اور زیادہ آمدنی بے سودی ہے تو ملازمِ دکان کو تنخواہ لینا جائز ہے جبکہ تنخواہ مال مخلوط سے دی جائے، اس طرح جب اشیاء حلال زیادہ ہیں تو غلبہ حلال کو ہے اور ملازموں کی دغا وفریب سے ان کو گناہ عظیم ہوتا ہے، اسی طرح دوکان دار کو بھی اگر وہ اس سے واقف ہے لیکن جو قیمت حاصل ہوتی ہے وہ حلال ہے گو کراہت سے خالی نہیں، لیکن دکاندار کی ملک ہو جاتی ہے، اسی طرح بیع فاسد میں قبضہ سے دوکان دار کی ملک ہو جاتی ہے، البتہ کراہت

وخبث ضروری ہے اب اگر ملازم دکان کو یہ معلوم ہو کہ یہ تنخواہ جو مجھے دی گئی ہے یہ بیع فاسد کے ثمن سے دی گئی ہے یا سود کی آمدنی سے، جب تو اس کا لینا درست نہیں اور اگر سب مخلوط ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ یہ تنخواہ بیع صحیح کی قیمت سے ہے یا فاسد کی تو تنخواہ لینا حلال ہے۔

قال في الأشباه :غلب على ظنه أن اكثر بياعات أهل السوق لا تخلو عن الفساد، فان كان الغالب هو الحرام تنزه عن سرائه، لكن مع هذا الواشتراه يطيب له اه، قال الحموى: ووجهه أن كون الغالب هو الحرام لايستلزم كون المشترى حراماً، لجواز كونه من الحلال المغلوب والاصل الحل اهـ . (ص ۹۲)

اور ایسے دوکاندار کی دعوت وضیافت وہدیہ وغیرہ قبول کرنا درست نہیں، لعدم تبدل الملک فیہ بیعاًوشراء، ولعدم الحاجۃ الی ذلک۔

وقال الشيخ دام ظله: اذا اعطى الموجر الأجرة من المال المخلوط والأجير عالم بالخلط، فكيف يجوز له أخذها، والخبث قد تمكن بها بالخلط، قلت: هذا على قولها، وهو الأحوط، ولكن على قول أبي حنيفة فالخلط مستهلك، فان قيل هذا يفيد ملكه لأجل استمتاعه به، قلت: عبارات الفتاوى تدل على جواز الاستمتاع أيضاً على قوله قال في فتاوىٰ قاضي خان ان كان غالب مال المهدى من الحلال، لا بأس بان يقبل الهدية ويأكل مالم يتبين عنده أنه حرام، لأنه اموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فيعتبر الغالب، واذا مات عامل من عمال السلطان وأوصى أن يعطى الحنطة للفقراء، قالوا: ان كان مأخذه من الناس مختلطا بماله لابأس به، وان كان غير مختلط لا يجوز للفقراء أن يأخذه اذا علم أنه مال الغير، فان كان ذلك الغير معلوماً رده اليه، وان لم يعلم الآخذ أنه من ماله أو مال غيره، فهو حلال حتّٰى يتبين انّه حرامٌ، قال الفقيه ابو الليث ان كان مختلطاً بماله على قول أبي يوسف ومحمد هو على ملك صاحبه، لايجوز أخذه

الالیرد ہ علی صاحبہ، وعلیٰ قول أبی حنیفة یملك الما ل بالخلط ویکون لِلأخذ أن یأخذ اذا کان فی بقیة مال المیت وفاء بمقدار مایؤدی بہ حق الخصماء اھ.

(امداد الاحکام: ۳/۵۳۳ ـ ۵۳۵ اجارۃ)

مچھلی شکار کرنے کی اجرت کا حکم:

بعض لوگ مچھلی شکار کرنے کے لئے لوگوں کو مزدور رکھتے ہیں وہ سمندر سے مچھلی شکار کر کے لاتے ہیں اور مالک کے حوالے کرتے ہیں مالک ان کو اجرت دیتا ہے کیا شرعاً یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللّٰہ: استاجرہ لیصید لہ أو یحتطب لہ فان وقت لذالك وقتا جاز والا لا.

وقال ابن عابدین رحمہ اللّٰہ: (تحت قولہ جاز) لانہ اجیر وحد وشرطہ بیان الوقت وقولہ والالا ای والحطب للعامل.

(جـ ٦، کتاب الاجارہ)

وفیہ فلو لم یوقت وعین الحطب فسد والحطب للمستاجر وعلیہ اجر مثلہ. (امداد الفتاویٰ: ۳/۳۷۳)

مذکورہ عبارت سے ثابت ہوا کہ اگر ان کو ماہانہ یا سالانہ ملازم رکھے اور اجرت وقت کی ادا کرے چاہے مچھلی ملے یا نہ ملے تو یہ معاملہ جائز ہے، اجرت حلال ہوگی، مچھلی جو ملے سب مالک کی ہوگی اور اگر وقت مقرر نہ کرے بلکہ مزدوروں کو جال حوالہ کر کے شکار کے لئے بھیجے اور مچھلی کی کچھ مقدار کو اجرت ٹھہرائے جیسا کہ فی زمانہ مروج ہے یہ صورت ناجائز ہے یہ اجارہ باطل ہوگا، مچھلی شکار کرنے والے کی ملک ہوگی، جال والے کو جال کی اجرت مثل ملے گی۔

(ھکذا فی امداد الفتاویٰ: ۳/۳۷٦)

رشوت لینے والے ملازم کی تنخواہ کا حکم:

اگر کوئی ملازم سرکاری ہو یا پرائیوٹ دوران ڈیوٹی رشوت لیتا ہو اس کی تنخواہ حلال ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

رشوت اکل بالباطل ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے باطل طریقہ پر لوگوں کے مال کھانے کو حرام قرار دیا۔

قوله تعالیٰ: ﴿ ولا تا کلوا اموالکم بینکم بالباطل ﴾

لہٰذا رشوت کھانا تو حرام ہے، البتہ نوکری میں حلال کام انجام دے اور جو وقت طے ہو اس میں مکمل ڈیوٹی کرے تو اس کام کی تنخواہ حلال ہوگی۔

(ماخوذ از امداد الفتاویٰ بتغیر: ۳۷۸/۳)

رشتہ طے کرانے پر اجرت لینے کا حکم:

اس زمانے میں بعض لوگوں نے رشتہ طے کرانے کو بطور پیشہ کے اختیار کرلیا ہے کیا شرعاً اس عمل پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ رشتہ طے کرانا اس کی حیثیت سفارش کی ہے اور سفارش ایک باعث اجر و ثواب عمل ہے، لیکن یہ عمل شرعاً غیر متقوم ہے، لہٰذا اس پر اجرت لینا ناجائز ہے۔

لما فی امداد الفتاویٰ: لانه لم ینقل تقومه و تقوم المنافع بغیر القیاس فمالم ینقل لایجوز القول بتقومه و ایضاً فلا تعب فی الشفاعة ولایعطون الاجر علیها من حیث انه عمل فیه مشقة بل من انها مؤثرة بالوجاهة والوجاهة وصف غیر متقوم فجعلوا اخذ الاجر علیها رشوة وسحتاً. (امداد الفتاویٰ: ۳۴۲/۳)

ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی پر اجرت لینا حرام ہے:

بلا معاوضہ ایصال ثواب کرنا جائز ہے کارثواب ہے، اپنے طور پر صدقات نافلہ، یا تلاوت یا تسبیح وتہلیل وغیرہ کا ثواب میت کو پہنچانا حدیث سے ثابت ہے البتہ ایصال ثواب کے لئے اجتماع کا اہتمام اس میں رسم ورواج کی پابندی کرنا اس کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا سب امور بدعت ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں۔

نیز اس پر اجرت لینا اور دینا بھی حرام ہے، چنانچہ حضرت علامہ ظفر احمد عثانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، "قرأة القرآن عند القبر" اور اس پر اجرت کو عالمگیریہ اور جوہرہ میں اگرچہ جائز لکھا ہے جبکہ مدت متعین کر کے معاملہ کیا جائے لیکن عالمگیریہ وغیرہ کے اس فتویٰ کی علامہ شامی رحمہ اللہ نے

تردید وتغلیط کی ہے اس لئے صحیح یہ ہے کہ "قرأة القرآن" پر اجرت لینا حرام ہے۔

لکونه استجارا للطاعة وهو لا يجوز واستثناء التعليم والاذان والامامة للضرورة ولا ضرورة فيه كما صرح به في ردالمحتار، ٥٢/٥. (امداد الاحکام: ٣/٥٥٨)

مدارسِ دینیہ کا عقد اجارہ مسانہہ ہے:

مدارس دینیہ میں جو مدرسین ہوتے ہیں یہ اجیر خاص ہیں، جن کا عقد اجارہ عمل کی بجائے وقت پر ہے، جس کی مدت عرفِ مدارس دینیہ میں ایک سال ہے وہ شعبان اور رمضان کی تنخواہ کے بھی حقدار ہیں، البتہ اگر بوقت عقد اس بات کی تصریح کردی گئی تھی کہ یہ تعاقد آخر شعبان تک ہے تو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں، یعنی یہ قاعدہ مقرر کرے کہ ہمارا معاہدہ یکم شوال سے ۲۹ شعبان تک ہے، اس کے بعد نیا معاہدہ ہوگا۔

(اس بارے میں مزید تفصیلات احسن الفتاوی: جـ ۷، کتاب الاجارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا حکم:

وکالت کا پیشہ اختیار کرنا فی نفسہ جائز ہے، اس میں جائز طریقہ پر مقدمہ کی پیروی کر کے اجرت لینا بھی جائز ہے البتہ اس زمانے میں چونکہ وکیل کو جھوٹے مقدمات کی پیروی کرنا پڑتی ہے، جبکہ ظالم کی ظلم میں مدد کرنا حرام ہے، لہٰذا جھوٹے مقدمات کی پیروی سے جو کمائی حاصل ہوگی وہ حرام ہوگی اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اس لئے جھوٹے مقدمات کی پیروی سے اجتناب کرنا لازم ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾ کہ گناہ اور ظلم میں کسی کے ساتھ تعاون مت کرو۔

نمازِ جنازہ پر اجرت لینا ناجائز ہے:

نمازِ جنازہ ایک عبادت ہے اور فرض کفایہ ہے جس طرح تلاوت قرآن مجید پر روپیہ پیسہ لینا جائز نہیں اسی طرح جنازہ پڑھانے والے کو بھی اجرت دینا لینا جائز نہیں۔

(ماخوذ از عزیز الفتاوی: صـ ٦٣٦)

گندم کی کٹائی کی اجرت میں گندم دینا:

گندم، دھان وغیرہ کی فصل کی کٹائی کی میں گندم کو بطور اجرت دینے کا کیا حکم ہے اس

بارے میں ایک سوال جواب احسن الفتاویٰ سے نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: آج کل لوگ عام طور پر گندم اور چاول کی فصل کٹوا کر گندم اور چاول کی گٹھریاں اجرت میں دیدیتے ہیں یہ مرض گاؤں میں زیادہ ہے، مزدور پیسے بالکل نہیں لیتے زمینوں کے مالک اس بارے میں مجبور ہیں اور یہ مرض تقریباً عموم کی صورت اختیار کرگیا ہے، حالانکہ فقہ کی رو سے جس چیز پر عمل ہو اسی سے اجرت دینا جائز نہیں ہے اس مسئلہ کا کوئی حل بتایئے جس سے مسلمان گناہ سے بچ جائے۔

جواب: یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ عمل سے اجرت دینا ناجائز ہے نیز گٹھے مقدار میں مختلف ہوتے ہیں اس لئے یہ اجرت مجہول ہے۔

جواز کی صورت یہ ہے کہ جس رسی میں گٹھا باندھا جائے گا اس کا طول متعین کرلیا جائے اور یہ طے کرلیا جائے کہ مزدور کی کاٹی ہوئی فصل میں سے دینا شرط نہیں، بلکہ فلاں خاص قسم کے گندم کا اتنا بڑا گٹھا اجرت میں دیا جائے گا، خواہ وہ کہیں سے بھی دے۔(احسن الفتاویٰ :۷/ ۳۱۲)

کتابیں کرایہ پر دینے کا حکم:

بعض دکان دار کتابیں کرایہ پر دے کر کمائی حاصل کرتے ہیں اسی طرح بعض لوگ قرآن کریم کے سپارے قرآن خوانی کے لئے کرایہ پر دیتے ہیں، شرعاً یہ اجارہ ممنوع ہے اگر کسی نے لیکر مطالعہ کرلیا تو اس پر اجرت لازم نہیں۔(ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ : ۴/ ۳۵۹)

وفی الهندية قال : ولو استاجر كتبا ليقراء فيها شعراً كان او فقها او غير ذالك لايجوز ولااجرله وان قراء، و كذالك اجارة المصحف، وكان هذا كله نظير من استاجر كرماً ليفتح له بابه فينظر فيه للاستئناس من غير ان يد خله الخ .

(عالمگیریه : ۴/ ۵۰۸ الاستئجار على الطاعة)

ناول کرایہ پر دینا:

بعض لوگ دکان میں مختلف قسم کے فحش ناول قصہ کہانی کی کتابیں رکھتے ہیں ان کو کرایہ پر دیکر آمدنی حاصل کرتے ہیں، اولاً تو فحش تصاویر والے لیٹریچر اسی طرح ناول، جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار وغیرہ اسی طرح اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ کرنا بھی عوام

کے لئے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے اس کے لئے کتب فراہم کرنا یہ ناجائز کام میں تعاون ہونے کی وجہ سے گناہ کا کام ہے، ثانیاً فی نفسہ کتابوں کو کرایہ پر دیکر اجرت حاصل کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے، خواہ وہ کتابیں اچھی ہوں، چہ جائیکہ ایسے مخرب اخلاق کتابوں کو کرایہ پر دیا جائے۔(حوالہ بالا ملاحظہ فرمائیں) اس کی آمدنی بطریق اولیٰ حرام ہوگی۔

کرایہ پر دی ہوئی چیز گم ہو جانے کی صورت میں ضمان کا حکم:

اگر کسی نے کوئی چیز کرایہ پر لی پھر اس کے ہاتھ سے گم ہوگئی اس پر ضمان لازم ہوگا یا نہیں اس بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر اس کرایہ دار نے مکمل حفاظت کا اہتمام کیا اس کے باوجود گم ہوگئی تو ضمان لازم نہیں ورنہ لازم ہے، اس بارے میں ایک سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: ایک شخص میری دکان سے سائیکل کرایہ پر لے گیا تھا اس کا بیان ہے کہ میں نے سائیکل کارخانہ کے دروازہ پر رکھی تھی لیکن جب میں واپس آیا تو سائیکل وہاں پر نہیں تھی، کسی شخص نے اٹھالی، اب دکاندار کو اس سائیکل کی قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: وہ سائیکل کرایہ دار کے ہاتھ میں امانت تھی اس کی حفاظت لازم تھی اگر وہ جگہ جہاں سائیکل رکھی تھی محفوظ جگہ نہیں ہے وہاں سے کسی کے اٹھا لینے کا اندیشہ تھا، پھر بھی حفاظت کے انتظام کئے بغیر وہاں رکھ دی اور کسی نے اٹھالی تو حفاظت میں کوتاہی کی جس کی وجہ سے دکاندار کو ضمان وصول کرنے کا حق حاصل ہے ورنہ نہیں۔(فتاویٰ محمودیة : ۱۲/۴۳۲)

تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا حرام ہے:

بیس رکعت تراویح جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت موکدہ ہے اور اگر نیک صالح حافظ قرآن میسر ہو جائے تو اس سے ایک ختم قرآن سننا بھی سنت ہے اور بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے، اگر کوئی ایسا صالح حافظ قرآن میسر نہ ہو جو بلا اجرت قرآن سنائے تو اجرت لیکر قرآن سنانے والے حافظ کی اقتداء میں تراویح پڑھنے کا کیا حکم ہے اس بارے میں ایک سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں جو امداد الاحکام میں مذکور ہے۔

سوال: زید و عمر ایک ہی محلّہ کے رہنے والے ہیں اور اس محلّہ میں ایک ہی مسجد ہے، جس میں جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہے، زید نے اس مسجد میں ختم تراویح کے لئے اجرت پر ایک حافظ مقرر کیا، عمرو اس فعل کو حرام جانتا ہے اور حافظ کی اجرت کی شرط سے منکر ہے، اس حالت میں عمرو

ختم تراویح میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: جو حافظ اجرت پر ختم قرآن شریف کے لئے رکھا گیا ہے، اگر وہ اس تنخواہ میں مہینہ بھر پانچوں نمازوں کی امامت بھی کریگا، تو اس کو واضح کر کے سوال کیا جائے اور اگر ایسا نہیں تو اس کے پیچھے قرآن سننے سے ثواب نہ ملے گا اور ایسا حافظ جو کہ فاسق بھی ہے، اس لئے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، پس عمرو اس حالت میں الگ نماز پڑھ لے، اس حافظ کے پیچھے نہ پڑھے۔

قال فی مراقی الفلاح ولذا کره امامة الفاسق لعدم اهتمامه بالدین فتجب اهانتهٗ شرعاً، فلایعظم بتقدیمه، للامامة واذا تعذر منعهٗ ینتقل عنه الی غیره للجمعة وغیرها وان لم یقم الجمعة الا هو یصلی معه اهـ. (صـ ١٧٦)

اور اگر اپنے گھر میں تراویح کی جماعت کر لے تو اور بھی اچھا ہے، باقی فرضوں کی جماعت ترک نہ کرے، اگر اس امام مذکور کے سواء اور کسی کے پیچھے فرض جماعت نہ ملے تو اس کے ہی پیچھے پڑھ لے۔

والاصل فیه ما حققه ابن عابدین فی رسالته "شفاء العلیل وبل الغلیل" من حرمة الاجارة والاستیجار علی مجرد تلاوة القرآن ولا یخفی ان الحافظ الذی لایؤم فی الصلوات الخمس وانما للتراویح ویختم فیها یأخذ الاجر علی ذالك انما هو یأخذ الاجر علی الامامة فامامة التراویح بمجردها لا یجوز أخذ الأجر علیها لعدم الضرورة التی بها ابیح الاجرة فی تعلیم القرآن وامامة المکتوبة والأذان وغیرها فانها فرائض او سنن موکدة من شعائر الاسلام وامامة التراویح سنة کفایة وتتأتی بقرأئة سورةٍ قصیرةٍ من اخر القرآن ولا تتوقف علی الختم، قال فی مراقی الفلاح: وسنن ختم القرآن فیها مرة فی الشهر علی الصحیح، وان مل به القوم قرأ بقدر مالا یودی الی تنفیر هم فی المختار، لان تکثیر القوم افضل من تطویل القرأة وبه یفتی، قال الزاهدی: یقرأ کما فی المغرب ای بقصار المفصل بعد الفاتحة اهـ.

(صـ ٢٤١)

قال الصدر الشهيد : الجماعة سنة على الكفاية فيها حتى لو اقامها البعض في المسجد بجماعة و باقي اهل المحلة اقامها منفرداً في بيته لايكون تاركاً للسنة لأنه يروى عن افراد الصحابة التخلف اهـ . (من مراقي الفلاح : صـ ٤٢٠)

بخلاف جماعة المكتوبات فانها واجبة على العين او سنة مؤكدة وايضاً فانها من الشعائر فتحققت الضرورة فيها دون جماعة التراويح فلايجوز أخذ الأجرة على امامتها مجردة و لا على الختم فيها و التخلف عن مثل هذا الامام اولىٰ . و اللّٰه اعلم .

(امداد الاحكام : ٥٥٩/٣ ، كتاب الاجارة)

جن ہوٹلوں میں شراب خنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہو، ان میں ملازمت کا حکم:

سوال: وہ مسلمان طلبہ جو حصول تعلیم کے لئے غیر مسلم ممالک کا سفر کرتے ہیں وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے معاشی اخراجات کے لئے وہ رقوم ناکافی ہوتی ہیں جو ان کے والدین وغیرہ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہیں، چنانچہ وہ طلبہ معاشی اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وہاں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض اوقات ان طلبہ کو وہاں ایسے ہوٹلوں میں ملازمت ملتی ہے جن میں شراب اور خنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا ان طلبہ کے لئے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے؟

سوال: بعض مسلمان غیر مسلم ممالک میں شراب بنا کر بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، کیا اس طرح غیر مسلموں کے لئے شراب بنا کر بیچنا جائز ہے؟

جواب: ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے کا عمل نہ کرے اس لئے کہ شراب پلانا یا اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا حرام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لعن اللہ الخمر و شاربها و ساقیها و بائعها و مبتاعها و عاصرها و معتصرها و حاملها و المحمولة الیه .

اللہ جل شانہٗ نے شراب پر اس کے پینے والے اس کے پلانے والے، اس کے بیچنے والے، اس کے خریدنے والے، اس کو نچوڑنے والے اور جس کے لئے وہ نچوڑی جائے اور اس کے اٹھانے والے اور جس طرف اٹھا کر لے جائے، ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔

(ابو داؤد، کتب الاشربه، باب العنب یعصر للخمر،
حدیث نمبر ۳۶۷۴، ۳/۳۲۶)

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم فی الخمر عشرة عاصرها و معتصرها و شاربها و حاملها و المحمولة الیه و ساقیها و بایعها و آکل ثمنها و المشتری لها و المشتراة له .

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے متعلق دس اشخاص پر لعنت فرمائی ہے شراب نچوڑنے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، اس کو پینے والا، اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے، پلانے والا، بیچنے والا، شراب بیچ کر اس کی قیمت کھانے والا، خریدنے والا، جس کے لئے خریدی جائے۔

(ترمذی شریف، کتاب البیوع، باب ماجاء فی بیع الخمر،
حدیث نمبر ۱۳۱۳، ۲/۳۸۰)

ابن ماجہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ اسی طرح ہیں:

عاصرها، و معتصرها، و المعصورة له و حاملها و المحموله له و بائعها و المبیوع له و ساقیها و المستقاة له۔

شراب نچوڑنے والا، نچوڑنے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، اس کو اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے، اس کو فروخت کرنے والا، جس کو فروخت کی جائے، پلانے والا، جس کو پلائی جائے۔

(ابن ماجه: ۲/۱۱۲۲، کتاب الاشربة، باب لعنت الخمر علی عشرة اوجه،

حدیث نمبر ۳۳۸۱)

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث روایت کی ہے:

قالت : لما نزلت الايات من آخر سورة البقرة خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فأقرأ هن على الناس، ثم نهى عن التجارة فى الخمر .

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے اور وہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی تجارت اور خرید وفروخت کی ممانعت فرمادی۔

(بخارى شريف، كتاب البيو ع، كتاب المساجد، و كتاب التفسير، تفسير سورة البقرة، مسلم شريف كتاب البيو ع، باب تحريم بيع الخمر)

امام مسلم رحمہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول مرفوعاً نقل کیا ہے کہ:

جس ذات نے شراب پینے کو حرام قرار دیا ہے، اسی ذات نے اس کی خرید وفروخت بھی حرام قرار دی ہے۔

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:

عن عبد الرحمن بن وعلة قال سالت ابن عباس فقلت انا بارض لنا بها الكروم، وان اكثر غلا نها الخمر، فذكر ابن عباس ان رجلا اهدى الى النبى صلى الله عليه وسلم راوية خمر، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الذى حرم شربها حرم بيعها .

عبدالرحمٰن بن وعلۃ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں ہمارے پاس انگور کے باغات ہیں اور ہماری آمدنی کا بڑا ذریعہ شراب ہی ہے اس کے جواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شراب کی ایک مشک بطور ہدیہ کے پیش کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا: جس ذات نے

اس کے پینے کو حرام قرار دیا ہے اس کی خرید وفروخت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

(مسند احمدؒ : ۱/ ۲۴۴)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ شراب کی تجارت بھی حرام ہے اور اجرت پر اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جانا، یا پلانا سب حرام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید وفروخت کا عام رواج ہو، وہاں بھی کسی مسلمان کے لئے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں۔

اور میرے علم کے مطابق فقہاء میں سے کسی فقیہ نے بھی اس کی جازت نہیں دی۔

(فقهي مقالات : ۱/ ۲۵۲)

تعطیلات کی تنخواہوں کا حکم:

یہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ مدرسین اور خادمینِ دین کو جن کا ہفتہ میں ایک دن تعطیل کا ہوتا ہے یا سال میں بعض طویل تعطیلات دی جاتی ہیں ان کی تنخواہیں دی جائیں گی یا نہیں؟

اس سلسلہ میں یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مدرسہ کی انتظامیہ کی حیثیت عوام کی طرف سے وکیل اور نمائندہ کی ہوتی ہے اور مدرسین بالواسطہ عوام کے اجیر ہوتے ہیں، اس طرح چندہ دینے والے عام لوگ مدرسین کے لئے جتنے دنوں کی رخصت باتنخواہ اور عام تعطیل کو گوارہ کریں اتنے دنوں اساتذہ کے لئے اس کا حق حاصل ہے، یہی حال بیماری کی رخصت کا بھی ہے، اب ظاہر ہے کہ ہر چندہ دینے والے سے اس کی تحقیق اور اس پر رائے لینا دشوار ہی نہیں تقریباً محال ہے، ان حالات میں دراصل عرف وعادت کا اعتبار ہے اور عرف یہ ہے کہ مدرسہ کی بڑی تعطیلات عموماً مشہور ہیں اور باتنخواہ اتفاقی اور مرض کی وجہ سے رخصت کا ضابطہ بھی عام ہے، اس کے باوجود عام مسلمان، مدرسوں کا تعاون کرتے ہیں اس پر اعتراض نہیں کرتے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں یہ رخصتیں اور تعطیلات گوارہ ہیں، لہٰذا ان کا تنخواہ لینا اور دینا جائز ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے ''العادۃ محکمۃ'' کے اصول کے تحت اسے جائز رکھا ہے اور یہی رائے علامہ شامیؒ کی بھی ہے اور فقیہ ابواللیثؒ کی بھی، فرماتے ہیں:

حيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة وفي

رمضان والعیدین یحل الاخذ وکذا لو بطل فی غیر معتاد لتحریر درس الااذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیہ ..... قال الفقیہ ابو اللیث ان یاخذ الاجر من طلبۃ العلم فی یوم لا درس فیہ ارجون ان یکون جائزاً ۔ (در المختار : ۳/ ۳۸)

ترجمہ: جہاں منگل اور جمعہ نیز رمضان کی عیدین میں تعطیل رہا کرتی ہو ان دنوں کی تنخواہ لینا حلال ہے، ایسے ہی اگر خلاف عادت کسی دن درس قلم بند کرنے کے لئے فرصت دیدی تو بھی تنخواہ لے سکتا ہے سوائے اس کے کہ وقف کرنے والا صرف ان ہی ایام کو تنخواہ دینے کی قید لگادے جس میں درس ہوا کرے ..... فقیہ ابواللیثؒ نے کہا کہ اگر استاد طلبہ سے ایسے دن کی اجرت بھی لے جس میں درس نہ ہوا ہو تو امید ہے کہ یہ جائز ہوگا۔ (جدید فقہی مسائل : ۱/ ۳۹۳)

ریلوے/بس ٹکٹ کی حیثیت:

ریلوے، بس ٹکٹ وغیرہ کی حیثیت اجارہ کے وثیقہ کی ہے، یہ گویا اس بات کی سند ہے کہ ہم نے کرایہ ادا کردیا ہے، اس لئے ہمیں سواری کرنے حق حاصل ہے، عام اجارہ میں اور اس میں صرف اس قدر فرق ہے کہ یہاں اجرت یعنی کرایہ پہلے وصول کرلیا جاتا ہے تاکہ نظم میں سہولت ہو۔

بس اور ریلوے میں اصل مالک اور ''آجر'' حکومت ہوتی ہے، مسافروں کی حیثیت کرایہ داروں اور ''مستاجروں'' کی ہے، ٹکٹ دینے والے حکومت کے وکیل ہوتے ہیں، جب یہ بات معلوم ہے کہ حکومت نے بلاٹکٹ سفر کی اجازت نہیں دی ہے تو اب کسی صورت بلاٹکٹ سفر کرنا درست نہیں، چاہے ریلوے اور بس کے سرکاری عہدہ دار بلاٹکٹ چلنے کی اجازت ہی کیوں نہ دے دیں، ٹکٹ کے بغیر سفر سفرِ معصیت ہے اور گویا اس کی حیثیت غاصب کی ہے۔

(ماخوذ از جدید فقہی مسائل)

بینک کا اپنے گاہک کو اولاً سامان خریداری کا وکیل بنانا، پھر اس کے ساتھ کرایہ داری کا معاملہ کرنا:

سوال: اسلامی ترقیاتی بینک کرایہ پر دینے کا جو معاملہ کرتا ہے وہ اس طرح کرتا ہے کہ مثلاً: ذرائع نقل وحمل جیسے آئل ٹینکر، جہاز وغیرہ کی خریداری اور پھر ان کو آگے کرایہ پر دینے کے لئے

سرمایہ کاری کرتا ہے، یا بعض اوقات ممبر ممالک کے لئے ان کے صنعتی منصوبوں کے اسباب اور سامان کی خریداری اور پھر ان کو کرایہ پر دینے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ اسلامی ترقیاتی بینک مندرجہ ذیل پر کرایہ کا معاملہ کرتا ہے:

(ا) جس پروجیکٹ میں بینک ''کرایہ داری'' کے طریقے پر سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے، جب اس پروجیکٹ میں بینک کو مالی فائدے کے حصول کا یقین ہو جاتا ہے، اس وقت بینک اس پروجیکٹ کو چلانے والی کمپنی (مستاجر) کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیتا ہے اور بینک اس کمپنی کو اپنے نام پر مطلوبہ سامان خریدنے کی اجازت دے دیتا ہے، (جس کی تعین اور تخمین مصارف کی تحدید ایگریمنٹ میں طے شدہ ہوتی ہے) اور معاہدہ کے مطابق بینک سپلائرز کو سامان کی قیمت ایگریمنٹ میں طے شدہ مدتوں کے مطابق براہ راست ادا کر دیتا ہے۔

(ب) اس کے بعد کمپنی (مستاجر) بینک کی طرف سے نائب بن کر اس سامان پر قبضہ کرتی ہے اور ایگریمنٹ میں بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں یقین حاصل کر لیتی ہے اور پھر اگر اس مشینری کو نصب کرنے کی ضرورت ہو تو اس کی تنصیب کی نگرانی کرتی ہے، تاکہ ایگریمنٹ کے مطابق پورا کام صحیح طور پر انجام پائے۔

(ج) پروجیکٹ پر کام کرنے والی کمپنی کی معلومات کے مطابق اور کمپنی اور بینک کے فنی ماہرین کے اندازوں کے مطابق سامان کی خریداری اور اس کی تنصیب کی عملی تنفیذ جس کے بعد اس مشینری سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکے، ان دونوں کاموں کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کی تحدید ''ایگریمنٹ'' کرے گا، تاکہ اس کی بنیاد پر جو وقت مقرر کیا گیا ہے، اس کے بعد ''کرایہ داری'' کی ابتداء ہو سکے اور اس کے بعد سامان کرایہ پر دینے کے قابل ہو سکے اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

(د) مدت کرایہ داری کے دوران کرایہ دار عقد کرایہ داری میں طے شدہ قسطیں ادا کرتا رہے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کمپنی بینک کی مفاد کی خاطر سامان کی حفاظت اور اس کی انشورنس کی ذمہ داری بھی لے گی۔

(ہ) ایگریمنٹ کے مطابق بینک اس بات کا پابند ہوگا کہ مدت کرایہ داری پوری ہونے کے بعد بینک اس سامان کو معمولی قیمت پر کرایہ دار کمپنی کو فروخت کر دے گا اور کرایہ دار طے

شدہ تمام قسطیں اور دوسرے تمام التزامات ایگریمنٹ کے مطابق ادا کریگا۔

کیا بینک کے لئے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کرایہ داری کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: کسی چیز کو کرایہ پر دینے کا معاملہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ بینک اشیاء اور سامان کو خود خریدے اور پھر بطور مالک کے اس پر قبضہ بھی کرے اور پھر بینک وہ چیز مدت معلومہ اور اجرت معلومہ پر اپنے گاہک کو کرایہ پر دیدے، اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اشیاء اور سامان دوبارہ بینک کے قبضہ میں آجائے گا اور پھر فریقین کو اختیار ہوگا، چاہیں تو دوبارہ تجدید عقد اجارہ کرلیں یا فریقین آپس میں اس وقت کوئی ثمن طے کر کے عقد بیع کرلیں اور بینک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اشیاء اور سامان کو دوسرے گاہک کو کرایہ پر دیدے اور یا دوسرے گاہک کے ہاتھ فروخت کردے۔

مذکورہ بالا طریقہ شرعاً بالکل جائز ہے، اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۲) دوسری صورت جس کے بارے میں سوال بھی کیا گیا ہے، وہ یہ کہ بینک ایسی اشیاء اور سامان کرایہ پر دے جو عقد اجارہ کے وقت اس کی ملکیت میں نہیں ہے، بلکہ عقد اجارہ کرنے کے بعد بینک وہ سامان سپلائر سے اپنے گاہک کے نام ہی پر خریدے اور پھر بینک اپنے گاہک کو اس سامان پر قبضہ کرنے اور اس کو وصول کر کے اپنے یہاں نصب کرنے کا وکیل بنادے اور بینک ایک تاریخ مقرر کردے گا کہ فلاں تاریخ پر عقد بیع مکمل ہو کر عقد اجارہ شروع ہو جائے گا، چنانچہ اس مقررہ تاریخ کے بعد بینک اس چیز کا کرایہ گاہک سے وصول کرتا رہے گا، یہاں تک کہ عقد اجارہ کی مدت معاہدہ کے مطابق پوری ہو جائے اور بینک اپنے تمام واجبات گاہک سے وصول کرلے تو پھر بینک وہ سامان معمولی ثمن پر اسی گاہک کے ہاتھ فروخت کردیگا۔

اس دوسری صورت میں فقہی اعتبار سے چند امور قابل غور ہیں:

۱۔ جس وقت بینک عقد اجارہ کرتا ہے، وہ اس چیز کا مالک بھی نہیں ہوتا، اس پر قبضہ ہونا تو دور کی بات ہے اور جس چیز کا انسان مالک نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اسی طرح جو چیز انسان کے قبضے میں نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اس لئے کہ یہ "ربح مالم یضمن" کی قبیل سے ہے، جو حدیث کی رو سے منھی عنہ ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ الشرح الکبیر میں ہے:

وکذلك لا یصح هبته ولا رهنه، ولا دفعه اجرة، وما اشبه ذلك، ولا التصرفات المنعقده الی القبض، لانه غیر مقبوض، فلا سبیل الی اقباضه .(الشرح الکبیر لابن قدامة : ۱۱۹/٤)

اسی طرح ہبہ رہن اور اجارہ اور دوسرے معاملات جو قبضہ کے ساتھ تام ہوتے ہیں، قبضہ میں آنے سے پہلے ان کو ہبہ کرنا، رہن رکھنا یا کرایہ پر دینا صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ چیز قبضہ میں نہیں ہے، لہٰذا دوسرے کو اس پر قبضہ کرانا بھی ممکن نہیں ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"ومنها (ای من شرائط صحة الاجارة)ان یکون مقبوض المؤجر اذا کان منقولاً، فان لم یکن فی قبضه فلا تصح اجارته ."

(الفتاوی الهندیه : ٤١١/٤)

''اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اگر وہ چیز منقول ہے تو موجر کے قبضے میں ہو، اگر وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے تو پھر عقد اجارہ درست نہیں۔''

شوافع کا بھی صحیح قول یہی ہے۔(دیکھئے ، مغنی المحتاج : ۶۸/۲ - ۶۹)

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جس وقت بینک اور گاہک کے درمیان معاہدہ ہو، اس وقت عقد اجارہ کو منعقد نہ مانا جائے ، بلکہ اس معاہدہ کو عقد اجارہ کے لئے محض ایک وعدہ تصور کیا جائے ، پھر جب گاہک سپلائر سے سامان وصول کر کے اپنے قبضے میں لے آئے اور اپنے یہاں نصب کرنے کا کام مکمل ہو جائے اس کے بعد بینک اپنے گاہک کے ساتھ اس تاریخ پر بالمشافہ یا تحریری مراسلت کے ذریعہ عقد اجارہ کرے اور عقد اجارہ کی اس تاریخ سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا، لہٰذا اگر وہ سامان بلا تعدی کے ہلاک اور ضائع ہو جائے تو گاہک ضامن نہیں ہوگا۔

۲۔ اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ کی چیز پر آفات سماویہ آجائے تو اس صورت میں مستاجر ضامن نہ ہوگا، جب تک مستاجر اس چیز کی حفاظت میں تعدی سے کام نہ لے، اس اصول کے پیش نظر مدۃ اجارہ کے دوران حوادث اور آفات سے حفاظت کے لئے اس سامان کی انشورنس کرنا ضروری ہو تو بینک بحیثیت مالک کے اس کا انشورنس کرائے۔

یہ انشورنس بھی اس وقت جائز ہے جب وہ تعارفی اور جائز انشورنس ہو، اگر وہ انشورنس

دھوکہ، سود، قمار وغیرہ پر مشتمل ہو تو ایسا انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں۔

۳۔ سوال میں عقد اجارہ مذکور ہے، اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد موجرہ وہ سامان معمولی قیمت پر مساجر کو فروخت کردے گا۔

فقہی اعتبار سے اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس سامان کی بیع اجارہ کے ختم کے ساتھ معلق کردی جائے، اس صورت میں بیع دو چیزوں کے ساتھ مشروع ہوگی ایک یہ کہ مدت اجارہ پوری ہوجائے اور دوسرے یہ کہ مستاجر کا ذمہ تمام واجبات سے فارغ ہوجائے یہ صورت شرعاً جائز نہیں، اس لئے کہ بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے اور مستقبل کے کسی زمانے کی طرف عقد بیع کی اضافت کرنا بھی درست نہیں ہے۔"

علامہ خالد الاتاسی شرح المجلہ میں فرماتے ہیں:

"واما الذی لایصح نعليقه بالشرط شرعاً فضا بطه كل ما كان من التمليكات ...... كالبيع والاجارة ."

(شرح المجلة العدلية : ۱/ ۲۳٤)

شرعاً جن عقود کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ ہر وہ عقد جن کا تعلق تملیکات سے ہو...... مثلاً: عقد بیع اور عقد اجارہ۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس وقت بیع نہ کی جائے، بلکہ وعدہ بیع کرلیا جائے جو عقد اجارہ کے اندر مشروط ہے۔

اس صورت میں ایسی شرط ہوگی جو مقتضاء عقد کے خلاف ہے اور اس جیسی شرط حنفیہ اور شوافع کے نزدیک عقد اجارہ کو فاسد کردیتی ہے جہاں تک مالکیہ اور حنابلہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک بہت سی شرطیں جو اگرچہ مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، لیکن وہ شرطیں عقد کو فاسد نہیں کرتیں، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی صفقہ میں اجارہ کے اندر بیع کی شرط لگانا جائز ہوگا۔

چنانچہ شرح الخرشی علی مختصر الخلیل میں ہے:

"ان الاجارة اذا وقعت مع الجعل فی صفقة واحدة فانها تكون

فاسدة لتنافر الاحكام بينها، لان الاجارة لا يجوز فيها الغرر، و تلزم بالعقد، و يجوز فيها الاجل، و لا يجوز شئي من ذلك في الجعل، بخلاف اجتماع الاجارة مع البيع في صفقة واحدة، فيجوز سواء كانت الاجارة في نفس المبيع، كما لو باع له جلوداً على ان يخرزها البائع للمشتري نعالاً، او كانت الاجارة في غير المبيع، كما لو باع له ثوباً بدراهم معلومة على ان ينسج له ثوباً آخر."

(الخرشي على مختصر خليل: ۷ ـ ٤)

''اگر عقد اجارہ اور عقد جعل ایک ہی صفقہ میں کیا جائے تو یہ صورت فاسد ہے اس لئے کہ ''اجارہ'' اور ''جعل'' کے درمیان تنافر ہے، اس لئے کہ عقد اجارہ کے اندر ''غرر'' جائز نہیں، معاملہ کرنے سے اجارہ لازم ہو جاتا ہے اور اجارہ کے اندر مدت کی تعیین جائز ہے، جبکہ ''جعل'' میں اس میں سے کوئی بھی چیز جائز نہیں، بخلاف اس کے کہ اجارہ کو بیع کے ساتھ ایک صفقہ میں جمع کر دیا جائے، یہ صورت جائز ہے، چاہے وہ اجارہ اسی مبیع میں ہو، جس کی بیع ہوئی ہے، مثلاً: کوئی شخص کھال اس شرط پر فروخت کرے کہ بائع مشتری کے لئے اس کھال کے جوتے کاٹ کر بنا کر دے گا ...... یا یہ صورت ہو کہ عقد اجارہ مبیع کے علاوہ کسی دوسری چیز میں ہو، مثلاً: کوئی شخص معین دراہم میں اس شرط پر کپڑا فروخت کرے کہ وہ اس کے لئے دوسرا کپڑا بن کر دے گا۔ (تو یہ صورت شرعاً جائز ہے)

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ جواز اس وقت ہے جب بیع بھی حالاً ہو، موجل نہ ہو اور بیع کے اندر جو اجارہ مشروط ہو وہ بھی حالاً ہو، لیکن زیر بحث مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے، یعنی اس میں اجارہ تو حالاً ہے، لیکن اسی اجارہ کے اندر جو بیع مشروط ہے وہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد منعقد ہوگی، اس مسئلہ کا صریح حکم اگرچہ مالکیہ کی کتابوں میں تو مجھے نہیں ملا، لیکن ان کتابوں کی عبارت سے یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک عقد کے اندر شرط لگانا بنیادی طور پر جائز ہے اور صرف دو صورتوں کے علاوہ کوئی شرط بھی عقد کو فاسد نہیں کرتی، ایک یہ کہ وہ شرط اس عقد کے منافی ہو، مثلاً: بائع اپنی چیز فروخت کرتے وقت یہ شرط لگا دے کہ مشتری اس چیز میں کوئی تصرف نہیں کرے گا، یا موجر اس شرط پر ایک چیز کرایہ پر دے کہ مستاجر اس سے نفع نہیں اٹھائے گا، چونکہ یہ

دونوں شرطیں مقتضاء عقد کے خلاف ہیں، اس لئے یہ عقد فاسد ہو جائے گا، دوسرے یہ کہ وہ شرط ایسی ہو جس کی وجہ سے ثمن مجہول ہو جائے، یا تو ثمن میں زیادتی ہو جائے یا کمی ہو جائے، اس قسم کی شرط سے عقد فاسد ہو جائے گا۔

(دیکھئے: مواهب الجليل للحطاب: ٤/٣٧٣، الخرشي ٥/٨٠ - ٨١، هداية المجتهدين: ٢/٣٣ - ١٣٤)

ظاہر ہے کہ موجر کا مدت اجارہ کے ختم کے ساتھ بیع کی شرط لگانا مندرجہ بالا دو صورتوں میں داخل نہیں ہے، اس لئے یہ صورت مالکیہ کے نزدیک جائز معلوم ہوتی ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ۔

بہرحال! مندرجہ بالا تفصیل کے بعد مالکیہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے اس مسئلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک وعدہ بیع ہے جو اجارہ کے ساتھ مشروط ہے، لیکن اس صورت میں مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد بیع منعقد ہوگی، لہٰذا جب مدۃ اجارہ ختم ہو جائے اس وقت فریقین مستقل ایجاب وقبول کے ذریعہ بیع کا معاملہ کریں، اب چاہے وہ ایجاب وقبول بالمشافہ ہو، یا خط و کتابت کے ذریعہ ہو۔

زیر بحث مسئلہ کے جواز کی تیسری شکل اور بھی ہو سکتی ہے، جو میرے خیال میں چاروں ائمہ کے مسلک کے مطابق درست ہوگی، وہ یہ کہ وعدہ بیع کو اجارہ کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے، بلکہ وہ وعدہ ایگریمنٹ میں ہو جائے، جس میں اسی بات کا وعدہ ہو کہ فریقین پہلے عقد اجارہ کریں گے اور پھر بیع کریں گے، پھر وعدہ کے مطابق وقت مقرر پر فریقین کے درمیان اجارہ ہو جائے، جس میں بیع کا ذکر نہ ہو، اس کے بعد جب اجارہ کی مدت ختم ہو جائے تو مستقل بیع کر لی جائے، جس میں کوئی شرط وغیرہ نہ ہو، اس طرح دونوں عقد مستقل اور غیر مشروط ہو جائیں گے اور اس طرح فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہوگا۔ وہ تین باتوں پر مشتمل ہوگا:

١. بینک گاہک کو سامان خریدنے کا وکیل بنائے گا

٢. گاہک یہ وعدہ کرے گا کہ وہ سامان وصول کرنے اور اس کو اپنے قبضے میں لانے اور نصب کرنے کے بعد اس کو کرایہ پر لے لے گا

٣. بینک یہ وعدہ کرے گا کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ سامان اس گاہک کو فروخت کر دے گا، اس معاہدہ کے مکمل ہو جانے کے بعد گاہک صرف سامان خریدنے کے سلسلے

میں بینک کا وکیل ہو جائے گا، پھر وکالت کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد وعدہ کے مطابق عقد اجارہ مستقل طور پر اپنے وقت پر منعقد ہوگا اور پھر وعدہ کے مطابق اجارہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان مستقل طور پر بیع منعقد ہو جائے گی۔

اور گاہک کی طرف سے اجارہ پر لینے کا وعدہ اور بینک کی طرف سے فروخت کرنے کے وعدہ کو دیانۃً تو پورا کرنا فریقین کے ذمے بالاجماع واجب ہے، جہاں تک قضاءً اس وعدہ کے ایفاء کا تعلق ہے، تو مالکیہ کے مذہب کے مطابق اگر وعدہ کرنے والے نے وعدہ کر کے موعود لہ کو کسی ایسے معاملے میں داخل کر دیا ہے جو اس وعدہ کی وجہ سے اس پر لازم ہوا ہے تو اس صورت میں قضاءً اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر وعدہ کرنے والا وعدہ خلافی کرے اور اس وعدہ خلافی کی وجہ سے موعود لہ کو کوئی مالی نقصان ہو جائے تو وعدہ کرنے والا اس مالی نقصان کا ضامن ہوگا۔

چنانچہ علامہ قرافی مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الفروق'' میں فرماتے ہیں:

قال سحنون: الذی یلزم من الوعد یقوله: اهدم دارك، وانا اسلفك ماتبنی به، واخرج الی الحج وانا اسلفك، او اشتر سلعة او تزوج امراة وانا اسلفك، لانك ادخلته بوعدك فی ذلك اما مجرد الوعد فلا یلزم الوفاء به، بل الوفاء به من مکارم الاخلاق.

(کتاب الفروق: ٤/ ٢٤-٢٥)

امام سحنون فرماتے ہیں کہ وہ وعدہ جو لازم ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ مثلاً: ایک شخص دوسرے سے یہ وعدہ کرے کہ تم اپنے گھر کو منہدم کر دو، میں اس کو دوبارہ بنانے کے لئے قرض فراہم کروں گا، یا یہ کہے کہ تم حج کے لئے چلو، میں تمہیں خرچ کے لئے قرضہ دونگا، یا یہ کہے کہ تم یہ سامان خرید لو، یا فلاں عورت سے شادی کر لو، میں خرچ کے لئے قرضہ دوں گا (اس قسم کے وعدہ کو پورا کرنا قضاءً لازم ہے) اس لئے کہ اس وعدہ کے ذریعہ تم نے اس کو اس معاملے میں داخل کیا ہے، البتہ اگر محض وعدہ ہو، جس کے ذریعہ موعود لہ کو کسی معاملے کے اندر داخل نہ کرے تو اس وعدہ کو پورا کرنا قضاءً تو لازم نہیں، البتہ اس وعدہ کو پورا کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے۔

شیخ علیش مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ میں وعدہ کے لازم ہونے کے بارے میں تین اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"والرابع :يقضى بها ان كانت على سبب، ودخل الموعود بسبب العدة فى شئى، وهذا هو المشهور من الاقوال . قال اسبغ سمعت اشهب سئل عن رجل اشترى من رجل كرما، فخاف الوضيعة فاتى ليستوضعه فقال له: بع وانا ارضيك قال: ان باع براس ماله او بربح فلاشئى عليه وان باع بالوضيعة كان عليه ان يرضيه ...... وهذا القول الذى شهرة ابن رشد فى القضاء بالعدة اذا دخل بسببها فى شئى قال الشيخ ابو الحسن فى اول كتاب الاول انه مذهب المدونة، لقولها فى آخر كتاب الغرر، وان قال :اشترعبد فلان وانا اعينك بالف درهم فاشتراه لزمه ذلك الوعد ، وهو قول ابن القاسم فى سماعه من كتاب العارية وقول سحنون فى كتاب العدة ."

(فتح العلى المالك : ۱/۲۵۵)

''چوتھے یہ کہ اس وعدہ کو قضاء لازم ہونے کا حکم دیا جائے گا، اگر یہ وعدہ کسی معاملے پر مبنی ہو اور اس وعدہ کی وجہ سے موعود لہ اس معاملے کو اختیار کرلے یہی قول زیادہ مشہور ہے ..... اسبغ فرماتے ہیں کہ میں نے اشہب سے یہ مسئلہ سنا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے انگور خریدے، لیکن خریدنے کے بعد مشتری کو نقصان کا اندیشہ ہوا، چنانچہ وہ اس کی قیمت کم کرانے کے لئے بائع کے پاس آیا، تو بائع نے اس سے کہا کہ تم یہ انگور آگے فروخت کردو، اگر تمہارا نقصان ہوا تو میں اس کی تلافی کر کے تمہیں راضی کردوں گا، اس صورت میں اگر وہ مشتری وہ انگور اسی قیمت پر آگے فروخت کردے، جس قیمت پر اس نے خریدے تھے، یا منافع پر فروخت کردے تو اس صورت میں بائع کے ذمے کوئی چیز لازم نہیں ہوگی، لیکن اگر مشتری نقصان کے ساتھ فروخت کرے اس صورت میں بائع کے ذمے لازم ہے کہ وہ نقصان کی تلافی کر کے مشتری کو راضی کرے ..... علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو لیا ہے کہ قضاء ایسا وعدہ پورا کرنا لازم ہے، جس وعدہ کے ذریعہ موعود لہ کسی معاملے میں مبتلا ہو جائے، شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کتاب اول کے ابتداء میں فرماتے ہیں کہ ''صاحبِ مدونہ'' کا بھی یہی مسلک ہے اس لئے کہ کتاب الغرر کے آخر میں ہے کہ اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ تم فلاں شخص کا غلام خرید لو، میں ایک ہزار درہم کے ذریعہ تمہارے

ساتھ (ثمن کی ادائیگی میں) تعاون کروں گا، اگر اس نے وہ غلام خرید لیا تو اس صورت میں اس وعدہ کرنے والے کے ذمہ ایک ہزار درہم لازم ہو جائیں گے۔ کتاب العاریۃ میں ابن القاسم کا یہی قول مذکور ہے، امام سحنون کا بھی کتاب العدۃ میں یہی قول مذکور ہے۔''

حنفیہ کے اصل مسلک میں وعدہ اگرچہ قضاءً لازم نہیں ہوتا، لیکن متاخرین فقہاء حنفیہ نے کئی مقامات پر وعدہ کو لازم قرار دیا ہے۔

چنانچہ درالمختار میں ''شرط فاسد'' کے بیان میں ہے کہ:

"وفی جامع الفصولین ایضا: لو ذکر البیع بلا شرط ثم ذکر الشرط علی وجه العدة جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد، اذا المواعید قد تکون لازمة فیجعل لازما لحاجة الناس."

جامع الفصولین میں بھی ہے کہ اگر بیع بلاشرط کی جائے اور پھر شرط کا ذکر بطور وعدہ کے کیا جائے، تو اس صورت میں وہ بیع جائز ہو جائے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ وعدے کبھی لازم بھی ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس وعدہ کو بھی لازم کیا جائے گا۔

اس کے بعد علامہ رملیؒ کے فتاوی خیریہ سے نقل کیا ہے کہ:

"فقد صرح علماء نا بانهما لو ذکرا البیع بلا شرط ثم ذکرا الشرط علی وجه العدة جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد."

''ہمارے علماء نے بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر عاقدین بلاشرط کے بیع کرلیں اور پھر بطور وعدہ کے کوئی شرط لگالیں تو اس صورت میں بیع درست ہو جائے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا''

پھر اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

"وقد سئل الخیر الرملی عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقده وعقد البیع خالیاً عن الشرط فاجاب بانه صرح فی الخلاصة والفیض والتتارخانیة وغیرها بانه یکون علی ما تواضعا."

علامہ خیرالدین رملی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر دو آدمی عقد سے پہلے بیع

الوفاء کے انعقاد پر معاہدہ کرلیں۔ اور پھر عقد بیع غیر مشروط طور پر کریں۔ (تو یہ جائز ہے یا نہیں؟)

علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ خلاصہ فیض اور تتارخانیہ وغیرہ میں صراحت کے ساتھ یہ موجود ہے کہ اگر عاقدین اس طرح عقد کرلیں تو یہ عقد اسی طرح منعقد ہو جائے گا جس طرح عاقدین نے معاہدہ کیا تھا۔"

(رد المحتار: ٤/ ١٣٥، باب البيع الفاسد مطلب في الشرط الفاسد اذا ذكر بعد العقد او قبله)

چنانچہ علماء حنفیہ نے ان عبارات فقہیہ میں اسی بات کی تصریح کی ہے کہ "وعدہ" بعض اوقات لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے، اسی طرح علامہ خالد الاتاسی نے "بیع الوفاء" کی بحث میں فتاوی خانیہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ:

"وان ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة فالبيع جائز، ويلزم الوفاء بالوعد لان المواعيد قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس." (شرح المجلة لخالد الاتاسي: ٢/ ٤١٥)

اگر بیع غیر مشروط طور پر کی جائے اور پھر بطور وعدہ کے شرط کا ذکر کیا جائے تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہوگا، اس لئے کہ وعدے کبھی لازم ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کی ضرورت کے لئے اس وعدہ کو لازم کیا جائے گا"۔

لہٰذا فقہاء کے مندرجہ بالا اقوال کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ مستقبل میں ہونے والے اجارۃ اور بیع کے ایگریمنٹ میں فریقین آپس میں جو وعدہ فی الحال کرلیں تو وہ وعدہ قضاءً بھی لازم ہوگا۔

جواب کا خلاصہ:

اوپر ہم نے جو تفصیلی جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بینک کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس تفصیلی جواب کے بالکل ابتداء میں ہم نے جو پہلا طریقہ بیان کیا تھا، اس کے مطابق بینک گاہک کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرے، اس لئے کہ اس طریقے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے اور اختلاف اور شبہات سے دور رہنا زیادہ بہتر ہے۔

البتہ اگر کسی وجہ سے اس طریقہ پر عمل ممکن نہ ہو تو پھر بینک نے جو صورت پیش کی ہے، اس کو

شرعی طور پر جائز کرنے کے لئے اس میں مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہے:

(۱) بینک اور گاہک کے درمیان جو ایگریمنٹ لکھا جائے، اس میں گاہک کو سامان خریدنے کے لئے وکیل بنانے کا معاملہ تو قطعی اور یقینی ہو، لیکن اس ایگریمنٹ میں اجارہ اور بیع کا تذکرہ صرف بطور وعدہ کے ہو، قطعی اور فیصلہ کن طریقہ پر ان کا عقد نہ کیا جائے۔

(۲) جب گاہک سامان خرید کر اس پر قبضہ کر لے اور اس کو اپنے یہاں نصب کر لے، اس کے بعد عقد اجارہ بالمشافہ یا مراسلت کے ذریعہ کیا جائے اور اس عقد اجارہ کے وقت بیع کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

(۳) سامان کی خریداری کے بعد اور عقد اجارہ ہونے سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا۔

(٤) مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد پھر بیع قطعی طور پر کی جائے۔

(٥) ایگریمنٹ میں فریقین کی طرف سے اجارہ اور بیع کا جو وعدہ ہوگا، قضاء اور دیانۃ اس وعدہ کو پورا کرنا فریقین پر لازم ہوگا۔

(٦) اگر فریقین میں سے کوئی ایک وعدہ اجارہ یا وعدہ بیع کی خلاف ورزی کرے گا تو اس وعدہ خلافی کے نتیجے میں فریق ثانی کو جو مالی نقصان ہوگا فریق اول اس نقصان کی تلافی کرے گا۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم (فقہی مقالات: ص ۲۷۹ ـ ۲۹۲)

عیب دار چیز دلوانے کا حکم:

دلال اگر عیب دار چیز دلوائے تو اجرت کا حقدار نہ ہوگا تفصیل درج ذیل سوال و جواب میں ملاحظہ فرمائیں:

سوال: زید نے بکر سے ایک رکشہ خریدا، دلال نے ان کے درمیان بیع کرائی اور مبلغ پچاس روپے دلالی طے ہوئی تھی، اب رکشہ خریدنے کے بعد اس کا ایک پرزا اس سے کم قیمت کا نکلا جو بیع سے پہلے مالک نے دلال کو بتائی تھی، زید کو اس پرزے کی وجہ سے دوسو روپے کا نقصان ہوا تو کیا اس دلال کو پچاس روپے دلالی دینے کے دینے ضروری ہیں؟ بینوا توجروا

جواب: دلال اجرت کا اس وقت مستحق ہوتا ہے جب وہ معقود علیہ صحیح سالم مع شرط و قیود خریدار کے سپرد کرے، اس لئے صورت سوال میں دلال اجرت کا مستحق نہیں بلکہ خریدار ضرر عیب

کی بنا پر یہ رکشہ دلال کے ذریعہ واپس کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں خریدار کے پاس مزید کوئی عیب نہ پیدا ہو گیا ہو، اگر مزید کوئی عیب پیدا ہو گیا تو رد مبیع کی بجائے بائع پر رجوع بالنقصان کرسکتا ہے۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی)

کرایہ دار نے دو روز کے بعد مکان چھوڑ دیا:

زید نے ایک مکان تین ہزار روپے ماہوار کرایہ پر لیا اور مبلغ ہزار روپے پیشگی دے دیئے اور دو دن اس مکان میں قیام کر کے چلا گیا تو کیا مالک مکان کو ہزار روپے دو دن کے عوض رکھنا جائز ہو گا یا دو دن کا کرایہ وضع کر کے باقی رقم واپس کرنا ضروری ہو گی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ

اگر یہ شخص کسی ایسے عذر کی وجہ سے جا رہا ہے جو شرعاً معتبر ہے تو دو روز کے بعد عقد اجارہ فسخ کرسکتا ہے اور مالک مکان چاہے تو دو روز کا کرایہ اس سے وصول کرسکتا ہے اور اگر بلا عذر معتبر جا رہا ہے تو چونکہ یہ عقد ماہانہ ہوتا ہے اس لئے پورے مہینے کا کرایہ ادا کرنا اس کے ذمہ ہے، اس صورت میں یہ شخص مکان اپنے قبضہ میں رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

ایسی ملازمت کا حکم جس میں رشوت دینا پڑتی ہو:

ایک شخص ایسی کمپنی میں کام کرتا ہے جو درآمد برآمد کا کام کرتی ہے، کمپنی کے اس ملازم کو اس کاروبار کے سلسلہ میں مختلف مراحل میں رشوت دینا پڑتی ہے، کیا ایسی ملازمت جائز ہے اور ایسے شخص کے ہاں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟ اس کا حکم یہ ہے کہ

رشوت دینا اور لینا دونوں حرام ہیں، اس ملازم پر فرض ہے کہ یہ ملازمت ترک کر کے دوسرا کوئی ذریعہ معاش اختیار کرے، اس کے ہاں کھانا کھانا بہرحال جائز ہے رشوت کی جائز و ناجائز صورتوں کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ریل میں وزن سے زائد سامان لے جانے کا حکم:

ریل، جہاز وغیرہ میں مسافر کے لئے سامان کی ایک مقدار متعین ہے اگر اس مقدار سے زائد سامان لے جائے تو سامان کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے، اب اگر اپنا کوئی زائد سامان ساتھ جانے والے مسافر دوست احباب کے حوالے کر دے تاکہ کرایہ سامان اور ریلوے کی گرفت سے بچ جائے تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں البتہ سوار ہونے سے قبل ہی پورا سامان دوسرے کے ذمہ لگا دیا تو جائز ہے۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی بتغییر یسیر)

حرام آمدن والوں کے ہاں نوکری کا حکم:

جن لوگوں کی آمدنی حرام ہے، ان کے ہاں نوکری کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا ایک مدلل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص نے ایک کسبی یا سود خور یا شراب فروش کی نوکری کر لی یا کسی ایسے شخص نے اپنے گندم یا کوئی اور چیز کسی شراب فروش کے ہاتھ فروخت کی اور اس نے آمدنی ناجائز سے قیمت دی تو اب اس کے لیے وہ قیمت وہ حلال ہے یا نہیں، اس مسئلہ کی اچھی طرح تشریح فرمائیے؟

جواب: جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے جیسے کسبی یا شراب فروش یا سود خور وغیرہم ان کی نوکری کرنا جائز نہیں اور جو تنخواہ اس میں سے ملتی ہو وہ حلال نہیں اور اسی طرح اپنی چیز اس کے ہاتھ فروخت کر کے اسی مال حرام سے قیمت لینا بھی حلال نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿ولا تتبدلوا الخبيث بالطيب﴾ تو اپنی پاکیزہ مزدوری یا پاکیزہ چیز کو اس ناپاک مال سے بدلنا ناجائز ٹھہرا۔

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لا یحل ثمن الکلب ولا حلوان الکاهن ولا مهر البغی، ص۱۳۶، وقال علیه السلام: ان اللہ حرم الخمر وثمنها. ص۱۳۷

وعن ابن عباس قال رأيت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم جالسا عند الرکن قال فرفع بصره الی السماء فضحك فقال لعن اللہ الیهود ثلاثا ان اللہ تعالیٰ حرم الشحوم فباعوها واکلوا اثمانها وان اللہ تعالیٰ اذا حرم علی قوم اکل شئی حرم علیه ثمنه ص۱۳۷، لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اکل الربا وموکله، ص۱۲۷، سنن ابی داؤد جلد ثانی وغیر ذلك من الآیات والاحادیث.

ہاں جن لوگوں کی آمدنی مشتبہ اور مختلط الحلال والحرام غالب الحلال ہو، مثلاً: یہی لوگ کسبی و مے فروش وسود خور وغیرہم کوئی دوسرا پیشہ مباح مثل حلال تجارت یا اور کچھ بھی کرتے ہوں اس وقت ان کے ہاں نوکری کرنا اور اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ تنخواہ یا قیمت حلال مال میں سے دیں یا غالب الحلال سے دیں۔

نهانا صلى الله عليه و سلم عن كسب الامة الا ما علمت بيدها وقال هكذا باصابعه نحو الخبز و الغزل و النقش . (ابو داؤد : ۲/ ۱۳)

وجہ یہ ہے کہ مشتبہ سے بچنا متعذر اور دشوار ہے پس ضرورت کی وجہ سے جائز ہے:

" لا ن الضرورات تبيح المحظورات و لا يكلف الله نفسا الا وسعها "

اگر چہ خلاف تقویٰ ہے۔

دع ما يريبك الىٰ مالا يريبك هو الموافق .

(امداد الفتاویٰ : ۳/ ۳۷۸)

عورتوں کے لئے ملازمت کرنے کا حکم:

(۱) عورت کے لئے ملازمت اختیار کرنے کی شرعاً کس قدر گنجائش ہے اس سلسلہ میں ایک مفصل فتویٰ و جواب کی صورت میں ملاحظہ فرمائیں۔

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

ا) عورتوں کے لئے دنیاوی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟ اگر کوئی صورت جواز کی ہو تو تحریر فرمائیں؟

ب) عورتوں کے لئے ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر شوہر یا دیگر وسائل کے نہ ہونے کی وجہ سے ملازمت کرنا چاہے تو کیا حکم ہے؟

جواب: پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عورتوں کے لئے بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وقرن في بيوتكن و لا تبرجن تبرج الجاهلية الأولىٰ ﴾

(سورة الأحزاب : ۳۳)

یعنی گھروں میں قرار سے رہو، اگر ضرورت کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا ہو تو درج ذیل شرائط کی پابندی ضروری ہے:

(۱) ایسی بڑی چادر، برقعہ وغیرہ میں لپٹی ہوئی ہو کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مائل نہ ہو۔

(۲) بناؤ سنگھار اور خوشبو لگا کر نہ نکلیں۔

(۳) ان کی چال وچلن ایسی نہ ہو کہ فتنے کا سبب بن جائے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" و حیث أبحنا لها الخروج فبشرط عدم الزینة فی الکل، و تغییر الهیئة الی مالا یکون داعیة الی نظر الرجال و استمالتهم ."

(در المختار: ۳/۱٤٦)

جبکہ عورتوں کا تعلیم کے لئے نکلنا ضرورت میں داخل نہیں، علاوہ ازیں اس خروج میں خروج بلاضرورت کے ساتھ دیگر کئی مفاسد پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱) باہر نکل کر اجانب کو اپنی طرف مائل کرنا۔

۲) برے ماحول میں جانا۔

۳) بے دین عورتوں سے تعلیم حاصل کرنے میں ایمان، اعمال واخلاق کی تباہی۔

٤) نامحرم مردوں سے پڑھنے کی معصیت۔

٥) کافر اور بے دین قوتوں کی نقالی کا شوق۔

٦) اس تعلیم کے سبب حب مال اور حب جاہ کا بڑھ جانا اور اس کی وجہ سے دنیا وآخرت کا تباہ ہونا۔

عورتوں کے لئے اگر لکھنے پڑھنے کا بنیادی علم یا دینی علم کسی دیندار عورت یا محرم مرد سے گھر میں سکھانے کا بندوبست کیا جائے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ اور طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم سے یہی مراد ہے نہ کہ دنیوی فنون، اس لئے ہرگز مغالطے میں نہیں رہنا چاہیے۔

(۲) آج کل کے دور میں یہ ممکن نہیں کہ عورت ملازمت کرے اور ممنوعات میں سے کسی ممنوع امر کا ارتکاب نہ کرے، جو مفاسد اس کے عصری درسگاہوں میں پڑھنے میں بیان ہوئے ہیں ان سے زیادہ اس کی ملازمت کرنے میں پائے جاتے ہیں، نیز یہ کہ عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر ہے، اس لئے عورتوں کے لئے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں۔

اور اگر کوئی عورت مجبور ہو کہ کمانے والا کوئی موجود نہ ہو تو بھی گذر بسر کے لئے اور کوئی جائز تدبیر اختیار کی جائے، سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ مناسب جگہ نکاح ثانی کرے، جب تک یہ

صورت نہ ہو یا کسی وجہ سے عورت نکاح ثانی کے لئے آمادہ نہ ہو تو گھر میں چھوٹے بچے بچیوں کو پڑھانا شروع کر دے یا کوئی گھریلو ہنر اختیار کر کے اس سے اخراجات کا انتظام کرے، اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو سکے تو لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے کسی ایسے اسکول میں جا سکتی ہے جہاں مردوں سے اختلاط یا کسی امر ممنوع کا ارتکاب نہ ہوتا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ دار الافتاء والارشاد کراچی: ۱۰/ ۳۱۱)

قرض وصول کر کے دینے کی اجرت کا حکم:

ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہے اور قرض کی دستاویز بھی موجود ہے اور گواہ بھی موجود ہیں، لیکن وہ مقروض قرض ادا نہیں کرتا، اب یہ شخص کسی با اعتماد شخص سے کہتا ہے کہ میرا قرض فلاں سے وصول کر کے دو میں اس قرض کا تہائی تمہیں دوں گا، تو شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں ''یہ شخص اجیر خاص ہے لہذا تنخواہ معین ہونی چاہیے، خواہ ماہانہ خواہ یکمشت کہ کامیابی حاصل ہونے کے بعد تم کو اتنا فیصد دیں گے، اب یہ شخص اس کام کے انجام دہی کے لئے جو کچھ خرچ کرے اس کی ادائیگی تو ہر حال میں اس کے ذمہ فرض ہوگی خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو باقی اجرت اگر کامیابی کے ساتھ مشروط تھی تو کامیابی کے بعد ملے گی، اگر ماہانہ ہو تو مہینہ کے بعد ملے گی۔

(ماخوذ از امداد الفتاویٰ بتغییر یسیر: ۳/ ۳۶۰)

اجارۂ فاسدہ کا حکم:

ہر وہ شرط جس سے بیع فاسد ہوتی ہے اس سے اجارہ بھی فاسد ہو جاتا ہے اس لئے اجارہ میں شرط فاسد سے بچنا لازم ہے، لیکن اگر کسی شرط فاسد کی وجہ سے اجارہ فاسد ہو گیا ہے تو فیصلہ اس طرح ہوگا، کہ اگر ابھی تک عمل شروع نہیں ہوا تو اس عقد کو ختم کر دیا جائے، نئے سرے سے صحیح شرائط کے ساتھ عقد کیا جائے اور اگر عمل شروع ہو چکا ہے اور کام بھی پورا ہو گیا ہے تو اجیر کو اجرت مثل ملے گی۔

كما في التنوير وشرحه: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد وكل ما افسد البيع كمامر (يفسدها) كجهالة ماجور او اجرة او مدة او عمل، وكشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار او

مغار مها و عشر و خراج أو مؤنة، شباه .

(در المختار : ۵/۳۲ کتاب الاجارة)

وقال العلامة محمد على الصابونى:

والقاعدة انه اذا فسدت الاجارة يجب اجر المثل قياساً على النكاح لقوله صلى الله عليه وسلم :فى النكاح بغير مهر، فان دخل بهافلها مهر مثلها لا وكس ولاشطط (اخرجه ابو داؤد والنسائى والترمذى)

اى من غير تقص ولا مجاوزة للخد، فدل الحديث على وجوب القيمة فى العقد الفاسد ولا يزاد على المسمى الذى اتفق عليه فى الاجارة . (فقه المعاملات)

پیشگی اجرت دینے کا حکم:

اجارہ میں اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ جب کام پورا ہو جائے یا ڈیوٹی پوری کردے اس وقت اجرت کا مستحق قرار پاتا ہے اور مالک کے ذمہ اجرت کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے، تاہم اگر کوئی ملازم پیشگی اجرت کی شرط رکھے یا مالک مکان ودکان پیشگی کرایہ کا مطالبہ کرے اور کرایہ دار اس شرط کو تسلیم کرے یا ادارہ اور کمپنی خود ملازمین کو مہینہ کے شروع میں پیشگی تنخواہ ادا کرے یہ سب صورتیں آپس کی رضامندی سے شرعاً جائز ہیں۔

تحصیل ملازمت کے لئے ستر کھولنے کا حکم:

بعض ملازمتیں حلال ہوتی ہیں لیکن ان میں بھرتی ہونے کے لئے کوئی ناجائز شرط ہوتی ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، ایسے موقع پر کیا کیا جائے، اس بارے میں ایک سوال وجواب پیش کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کے حل میں مدد ملے۔

سوال: حکومت نے ائیر فورس میں مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں ایک نیا شعبہ کھولا ہے جس میں علماء کو وارنٹ افیسر (ریلجس ٹیچر) کے عہدہ پر بھرتی کیا جاتا ہے، سرکاری قانون یہ ہے کہ بھرتی کے وقت طبی معاینہ کروانا ضروری ہے جس میں ستر کھولنا لازمی ہے، کیا مذکورہ صورت میں ستر کھولنا اور اعضاء مخصوصہ کا معاینہ کروانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: یہ کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے جس کی بناء پر کسی کے سامنے ستر کھولنے کی اجازت ہو تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ جن لوگوں کو مذہبی تعلیم کے لئے لیا جا رہا ہے ان ہی کو مذہب کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو لوگ ملازمت کے لئے ایسے گناہ کبیرہ اور حرام کے ارتکاب پر تیار ہوں وہ مذہب کی تعلیم جو کچھ دیں گے وہ ظاہر ہے، ایسے لوگوں سے مذہب کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔

بہر کیف بلا ضرورت شدیدہ کسی کو ستر دکھانا اور دیکھنا سخت گناہ اور حرام ہے اور سوال میں مذکورہ صورت ضرورت شدیدہ میں داخل نہیں۔ (احسن الفتاوی: ۸/۱۸۷)

سودی کاروبار کرنے والے اداروں میں بجلی کی فٹنگ کا حکم:

سودی کاروباری اداروں میں تعمیراتی کام اور اس کی اجرت کا کیا حکم ہے اس بارے میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کا فتویٰ سوال و جواب کی صورت میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: آج کل اکثر ادارے خصوصاً تجارتی ادارے اور کمپنیاں جن کا اکثر کاروبار سودی ہے، ٹھیکیدار کمپنی یا ادارہ سے قرض لیکر تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں بندہ ایسی رقم سے تعمیر شدہ مکانات میں بجلی کا کام ٹھیکے پر کرتا ہے، مجھے جو رقم اجرت میں ملتی ہے وہ سودی ہی ہوتی ہے کیا میرے لئے وہ رقم اجرت میں لینا اور ملازمین کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: آپ کے کام میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، اداروں کا سودی کاروبار ان کا اپنا فعل ہے جس کا وبال اور گناہ انہی پر ہے، لہٰذا آپ کے کام کی اجرت بلاشبہ حلال ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اجرت کی رقم حلال آمدن سے ہو، اس لئے کمپنی سے معاہدہ کرتے وقت یہ شرط کر لی جائے کہ ہمیں اجرت سودی منافع سے نہ دی جائے گی، کمپنی میں یقیناً حلال آمدن کے ذرائع بھی ہوں گے ان سے اجرت دی جائے اگر حلال وحرام آمدن خلط کر دیا جاتا ہے اور حلال کو الگ رکھنے پر ادارہ تیار نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ حلال وحرام مخلوط ہوں لیکن حلال غالب ہو تو اس سے اجرت لینا جائز ہے اور اگر حلال وحرام دونوں برابر ہوں یا حرام غالب ہو تو جائز نہیں۔ (احسن الفتاوی، ص ۳۲۹، ج ۷)

تاخیر کی وجہ سے اجرت میں زیادتی جائز نہیں:

ایک ایجنٹ سے میرا معاملہ طے ہوا کہ وہ اڑھائی ہزار روپے ٹکٹ اور دوسرے کاموں کی

اجرت کے طور پر وصول کرے گا، معاملہ طے ہو جانے کے بعد پانچ سو روپے میں نے نقد ادا کردیئے اور دو ہزار کے بدلے میں سعودی عرب جا کر دو ماہ کے اندر آٹھ سو سعودی ریال ادا کردینے کا وعدہ کیا، لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں وعدہ کے مطابق دو ماہ کے اندر قرض نہیں اتار سکا، بعدازاں دو ماہ کی تاخیر سے آٹھ سو ریال ادا کردیئے، لیکن ایجنٹ تاخیر کرنے پر ایک سو ریال مزید طلب کر رہا ہے، شرعاً یہ زائد سو ریال ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: اگر قرض ادا کرنے کی استطاعت کے باوجود وعدہ خلافی کی ہے تو اس کا گناہ ہوگا، مگر ایجنٹ زائد رقم کے مطالبہ کا حق دار نہیں۔

نیز معاملہ پاکستانی روپے سے طے ہوا ہے، اس کے بعد سعودی ریال سے اس کا مبادلہ بیع الکالی بالکالی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اس لئے آپ کے ذمہ صرف پاکستانی دو ہزار روپے واجب ہوں گے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

قبل المیعاد ملازمت چھوڑنے پر مالی جرمانہ کا حکم:

سوال: ایک کمپنی اپنے ملازمین کو مقرر تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم دیتی ہے، اس شرط پر کہ پانچ سال یہاں ملازمت کرنا پڑے گی، اگر ملازم میعاد سے قبل چلا گیا تو پانچ سال کی رقم بحساب مقرر دیکر جائے گا، اگر کمپنی نے نکال دیا تو پانچ سال کی رقم پوری کی پوری دے دیگی، چاہے ایک سال کے بعد نکال دے، آیا اس قسم کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اور کمپنی والوں کو پیسے ملازم سے لینا اور ملازم کو کمپنی والوں سے لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب: زائد رقم بھی تنخواہ میں داخل ہے اور معیاد سے قبل چھوڑنے کی صورت میں اس کی واپسی کی شرط مفسد اجارہ ہے، لانہ مخالف لمقتضی العقد وفیہ نفع لاحد المتعاقدین۔

لہٰذا جانبین پر توبہ اور اس عقد کا فسخ کرنا فرض ہے، ملازم نے جتنی مدت کام کیا اس کو اس کا اجر مثل ملے گا اور جو مقررہ تنخواہ مع اضافہ سے زائد نہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(احسن الفتاویٰ کتاب الاجارہ)

بدون طے کئے اجارہ منعقد نہیں ہوتا:

سوال: زید اپنے باپ کے ہمراہ عرصہ سات سال سے تجارت کر رہا ہے، زید بالغ اور باقی بھائی سوائے ایک کے نابالغ ہیں، زید نے اپنی تجارت کے عرصہ میں اپنی مزدوری نکالی ہے، کیوں

کہ سامان لینا اور حساب وغیرہ اسی کے سپرد تھا، والد فقط دوکان پر بیٹھتا تھا، زید شادی شدہ اور صاحب اولاد ہے، باقی بھائی غیر شادی شدہ ہیں، زید اور اس کی بیوی کا کھانا اور خرچ والد کے ساتھ مشترک تھا، ان سات سالوں کی کل مزدوری زید نے آٹھ ہزار روپے یعنی سو روپے فی ماہ کے حساب سے سرمایہ سے لی ہے اور کاروبار کپڑے کا ہے، دوکان خوب چلتی ہے، کیا زید کے لئے یہ اجرت لینا جائز ہے، بصورت تقسیم ترکہ زید والد کی ملکیت میں باقی بھائیوں کے مساوی شریک ہوگا یا یہ اجرت بھی ملکیت میں شمار کی جائے گی؟ اور بقدر حصص تقسیم ہوگی، خواہ تقسیم بصورت انتقال پدر ہو یا باپ زندگی میں ہی زید کو الگ کردے۔ بینوا توجروا

جواب: زید نے اپنے والد سے اجرت پر کام کرنا طے نہیں کیا تھا اس لئے اس کا کام کرنا تبرع ہے، اجرت والی رقم بھی ترکہ میں شمار ہوگی اور اس میں سب ورثہ کا حق ہوگا، البتہ والد زندگی میں زید کو الگ کردے تو والد کو چاہیے کہ زید کی محنت کے پیش نظر اس کی مناسب مدد کردے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ کتاب الاجارہ)

مسائل بتانے پر اُجرت لینا:

سوال: ایک علاقہ ہے جس میں مسائل بتانے والا کوئی مفتی نہیں ہے، کوئی مفتی اہل علاقہ کو تین یا چار گھنٹے دیتا ہے اور ایک متعین جگہ بیٹھ جاتا ہے، لوگ آتے ہیں اور اس سے مسائل پوچھتے ہیں، کیا یہ مفتی لوگوں سے اس وقت کی اجرت لے سکتا ہے جبکہ کسی ادارہ یا بیت المال سے اس کی کوئی اجرت مقرر نہیں ہے؟ بینوا توجروا

جواب: لے سکتا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مفتی سے مسئلہ پوچھے اور مفتی کو معلوم ہو تو بتانا فرض ہے لہذا اس پر اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی مفتی لوگوں کی سہولت کے لیے اپنا وقت فارغ کر کے صرف مسائل بتانے کے لئے کسی جگہ بیٹھ جاتا ہے تو چوں کہ ایسا کرنا اس پر فرض نہیں ہے اس لئے وہ حبس اوقات کی اجرت مستفتین سے لے سکتا ہے۔

قال الامام المرغینانی رحمه الله تعالیٰ: (ولا بأس برزق القاضی) لانه علیه السلام بعث عتاب بن اسید رضی الله تعالیٰ عنه الی مکة وفرض له وبعث علیا رضی الله تعالیٰ عنه الی الیمن وفرض له ولانه محبوس لحق المسلمین فتکون نفقته فی مالهم وهو مال بیت المال

وهذا لان الحبس من اسباب النفقة كما فى الوصى والمضارب اذا سافر بمال المضاربة وهذا فيما يكون كفاية فان كان شرطا فهو حرام لانه استجار على الطاعة اذا القضاء طاعة بل هو افضلها ثم القاضى اذا كان فقيرا فالافضل بل الواجب الاخذ لانه لايمكنه اقامة فرض القضاء الا به اذ الاشتغال بالكسب يقعده عن اقامته وان كان غنيا فالافضل الامتناع على ما قيل رفقا ببيت المال وقيل الاخذ وهو الاصح صيانة للقضاء عن الهوان ونظرا لمن يولى بعده من المحتاجين لانه اذا انقطع زمانا يعتذر اعادته ثم تسميته رزقا تدل على انه بقدر الكفاية . (الهداية : ٤٧٦/٣)

وقال ايضا : وينبغى للقاضى ان ينصب قاسما يرزقه من بيت المال يقسم بين الناس بغيرا جر لان القسمة من جنس عمل القضاء من حيث انه يتم به قطع المنازعة فاشبه رزق القاضى ولان منفعة نصب القاسم تعم العامة فتكون كفايته فى مالهم غرما بالغنم (قال فان لم يفعل نصب قاسما يقسم بالاجر) معناه باجر على المتقاسمين لان النفع لهم على الخصوص ويقدراجر مثله كيلا يتحكم بالزيادة والافضل ان يرزقه من بيت المال لانه ارفق بالناس وابعد عن التهمه .

(الهداية : ٤١٠/٣)

وقال الامام طاهر بن عبد الرشيد البخارى رحمه الله تعالىٰ:وفى المحيط وذا اراد القاضى ان يكتب السجل ويأخذ على ذلك اجر ايأخذ منه مقدار مايجوز اخذه لغيره وكذا لوتولى القسمة بنفسه باجر ولو اخذ الاجرة فى مباشرة نكاح الصغار ليس له ذلك لانه واجب عليه ومالا يجب عليه مباشرته جاز اخذ الاجرة عليه .

(خلاصة الفتاوى : ٧/٤)

وقال العلامة علاء الدين الطرابلسى رحمه الله تعالىٰ: (فصل)

واما اجرة السجل علی من تجب قیل علی المدعی اذبه احیاء حقه فنفعه له وقیل علی المدعی علیه اذ هو یأخذ السجل وقیل علی من استأجر الکاتب وان لم یأمره احد وامره القاضی فعلی من یأخذ السجل. (معین الحکام: ۱/۹۵) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۷/۳۳۹)

ملازمت برقرار رکھنے کے لئے رشوت دینا:

بعض لوگ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں اس کے قواعد وضوابط کے مطابق نوکری حاصل کر لیتے ہیں، لیکن دوران ملازمت افسران بالا بعض ناجائز وجوہات کی بناء پر تنگ کرتے ہیں ملازمت سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں اور رشوت طلب کرتے ہیں، جبکہ ملازم کے لئے اس ملازمت کے علاوہ اور کوئی جائز ذریعہ معاش بھی نہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں ملازمت برقرار رکھنے کے لئے حکام بالا کو رشوت دینے کی گنجائش ہے، پھر بھی اس پر استغفار کرے، تاہم حکام کے لئے یہ رشوت ہے اور لینا اس کا حرام ہے، نیز حکام بالا کے لئے ماتحت ملازم کو بلاوجہ تنگ اور پریشان کرنا ملازمت سے فارغ کرنے کی دھمکی دینا، رشوت طلب کرنا، یہ سب امور ناجائز اور حرام ہیں، اس لئے ان کو ایسی ناجائز باتوں سے بچنا ضروری ہے۔

کسٹم ڈیوٹی سے بچنے کے لئے رشوت دینا:

لوگ بیرون ملک سے سامان منگواتے ہیں یا اپنے ساتھ سامان لاتے ہیں تو کسٹم والے اس پر ٹیکس لیتے ہیں اور عموماً حکام اس پر رشوت مانگتے ہیں اور رشوت نہ ملنے کی صورت میں سامان والے کو تنگ و پریشان کرتے ہیں اور زیادہ ٹیکس عائد کر دیتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے آیا ان کو رشوت دیدی جائے یا نہیں؟ تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر حکومت درآمد کردہ اشیاء پر مناسب شرح سے کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے جو کہ ظلم کے دائرہ میں نہیں آتی تو ایسی صورت میں کسٹم ڈیوٹی سے بچنے کے لئے کسٹم والوں کو رشوت دینا جائز نہیں، نیز اس میں حکومت کے ساتھ خیانت اور دھوکہ بھی ہے، جو ناجائز ہے لیکن اگر کسٹم حکام بہت زیادہ کسٹم ڈیوٹی وصول کرتے ہیں جو ظلم کی حد تک پہنچتی ہے تو ایسی صورت میں دفع ظلم کی نیت سے کسٹم حکام کو رشوت دینا تا کہ وہ مناسب شرح کے ساتھ کسٹم ڈیوٹی وصول کریں، اس کی گنجائش ہے، پھر بھی اس پر استغفار کرے، البتہ کسٹم حکام

کے لئے یہ رشوت ہے، ان کے لیے لینا اور استعمال کرنا بہر حال ناجائز ہے۔
(در المختار: ٦/٤٢٣)

ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا:

بعض ٹھیکیدار، کاموں کے ٹھیکے حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات حکام کو رشوت دیتے ہیں اور بعض حکام خود بھی رشوت مانگتے ہیں، رشوت کے بغیر ٹھیکہ کی منظوری نہیں دیتے اور پھر بلوں کو پاس کرانے پر رشوت طلب کرتے ہیں، اس صورت میں بامر مجبوری رشوت دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس طرح ٹھیکیداروں کا افسروں سے رشوت کا لین دین کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ٹھیکیداری کا کام اگر چہ جائز ہے، مگر جس جائز کام کے لئے ناجائز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہو ایسا کام کرنا جائز نہیں، لہٰذا اگر رشوت دیئے بغیر ٹھیکہ نہ ملے اور ٹھیکہ لینے کے بعد بھی بل پاس کرانے کے لئے رشوت دینی پڑتی ہو تو ایسا ٹھیکہ لینا جائز نہیں ہے، کسی دوسرے جائز کاروبار کو اختیار کرنا چاہیے۔

گاڑی والے کا پولیس کو رشوت دینا:

اگر کسی گاڑی والے کے پاس گاڑی کے صحیح کاغذات، لائسنس وغیرہ نہیں، یا سرکاری ٹیکس ادا نہیں کیا یا قانونی طور پر جتنے مسافر یا مال لانے کی اجازت ہے اس سے زیادہ مسافر یا مال لاد لیا یا اس قسم کی کوئی اور قانونی خلاف ورزی کی وجہ سے پولیس والے گاڑی روک لیں اور پھر گاڑی والے چالان سے بچنے کے لئے پولیس والوں کو پیسے دیں تو یہ رشوت ہے جو ناجائز ہے، یہ رشوت دینے اور لینے والے دونوں سخت گناہ گار ہوں گے۔

لیکن اگر گاڑی والے کے پاس اپنی گاڑی کے صحیح کاغذات موجود ہیں اور سرکاری ٹیکس وغیرہ ادا کرنے کی رسید بھی موجود ہے اور کسی طرح کی قانونی خلاف ورزی بھی نہیں کی، پھر بھی بلاوجہ پولیس والے تنگ اور پریشان کریں اور پیسے لئے بغیر نہ چھوڑیں یا چالان کر دیں تو ان حالات میں پولیس کے ظلم سے بچنے کے لئے مجبوراً ان کو رشوت دینی پڑے تو اس کی گنجائش ہے، دینے والا گناہ گار نہیں ہوگا، لیکن پولیس والے گناہ گار ہوں گے اور ان کے حق میں یہ پیسے رشوت کہلائیں گے جو کہ حرام ہے۔ (فتاویٰ هندية: ٣/٣٣١)

دیوالیہ ہونے کا حکم:

کسی تاجر پر لوگوں کا قرض اس قدر بڑھ جائے کہ اس کا تجارتی مال لوگوں کے قرضے اداء

کرنے کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی کمپنی اس طرح دیوالیہ ہو جائے کہ بہت سے ملازمین کی تنخواہیں اس کے ذمہ ہیں، اس کا جاری سرمایہ ختم ہو گیا یا اس قدر کم ہو گیا کہ وہ تجارت جاری رکھ کر لوگوں کے قرض واپس کر سکنے کی اس میں استطاعت نہیں رہی تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے ادارے پر پابندی عائد کرے اور اس کا اثاثہ یعنی سامان ضبط کر کے اپنے قبضہ میں لے لے اس کے بعد دیکھے کہ کمپنی یا دکان میں موجود سامان میں اگر کسی شخص کا متعین مال نکل آئے مثلاً کسی تاجر سے ایک مشین خریدی گئی تھی وہ ابھی غیر مستعمل صحیح سالم موجود ہے یا مثلاً کسی ڈیلر سے دس فریج لئے تھے وہ ابھی تک گودام میں پیک شدہ موجود ہیں تو وہ مال ثبوت وشہادت کی بنیاد پر اصل مالک کو واپس کر دیئے جائیں گے، اس کے بعد بقیہ مال فروخت کر کے قرض خواہوں کے قرض ادا کر دیئے جائیں گے مال فروخت کرنے کی ترتیب یہ رکھے کہ سب سے پہلے سامان تجارت فروخت کرے اس کے بعد اثاثہ یعنی مشین وغیرہ اس کے بعد دکان رکمپنی یا فیکٹری فروخت کی جائے گی۔

قال الشیخ الصابونی : والأصل فی ھذا ماروی کعب بن مالك، أن رسول اللہ ﷺ حجر علی معاذ بن جبل، وباع مالہ واذا فلس الحاکم رجلاً، أی حکم بافلاسہ، فأصاب أحد الغرماء عین مالہ، فھو أحق بہ، الا أن یشاء ترکہ، ویکون أسوۃ الغرماء، لحدیث "من أدرك متاعہ بعینہ، عند انسان قد أفلس، فھو أحق بہ ."

(اخرجہ البخاری : ۱۵۵/۳ ومسلم : ۱۱۹۳/۳)

قال فی الاختیار :

اذا طلب غرماء المفلس الحجر علیہ، حجر علیہ القاضی، ومنعہ من التصرفات والاقرار، حتی لایضر بالغرماء نظر الھم، ویبیع مالہ ان امتنع المدیون من بیعہ ویقسمہ بین الغرماء بالحصص، لان ایفاء الدین مستحق علیہ .

ویباع فی الدین النقود، ثم العروض، یعنی عروض التجارۃ ثم العقار، ویترك لہ ثیاب بدنہ، وینفق من مالہ علیہ، وعلی زوجتہ،

واولاده الصغار وذوی ارحامه، لانها من الحوائج الاصلية، وانها مقدمة على حقهم، وان لم يظهر للمفلس مال. فان كان القاضي يعرف يساره، او قامت البينة ان له مال، حبسه القاضي مدة يغلب على ظنه، انه لو كان له مال اظهره، فان لم يظهر له مال خلى سبيله، ولايحول بينه وبين غرمائه، بعد خروجه من الحبس، يلازمونه، ولايمنعونه من التصرف والسفر، ويأخذون فضل كسبه، يقتسمونه بينهم بالحصص .

وانما يؤذن لهم بملازمته، لأنه ربما كان له مال لا يطلع عليه احد قد اخفاه، وهو يظهر الفقر والعسرة، فاذا لا زموه فربما اضجروه فأعطاهم، والملازمة ان يتابعه الدائن فيدور معه حيث دار، ويجلس على بابه اذا دخل بيته، وبينة اليسار مقدمة على بينة الاعسار، لأنها مثبتة اذالاصل الاعسار .

(الاختيار لتعليل المختار على فذهب الخصی : ۲/۹۹)

البتہ اس کے رہائشی گھر، اس کے اور گھر والوں کے گذارے کے بقدر سامان اس کے پاس چھوڑ دینا مناسب ہے۔

قال العلامة الصابونی:

ویامر القاضی ان یقمیوا منادیاًینادی لهم على المتاع، ويباع ما عنده بالمزاد العلنى، وينبغى ان يترك له ما يقوم به، من معيشته، ومعيشة ابنائه، فلا تباع داره التى يسكنها، ولا الثياب التى يلبسها، ولا كل ما يحتاج اليه حاجة ضرورية، سواء كان له اولاهله وعياله .

انعامی اسکیمیں:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام درج ذیل انعامی اسکیموں کے بارے میں:

(۱) فیوچر اسٹریٹجیز انعامی اسکیم

(۲) بیسٹ فیوچر انعامی اسکیم

(۳) فیوچر کنٹ انعامی اسکیم

(٤) پینٹا گونوانعامی اسکیم

(٥) ڈبلیوٹی ،این کوپن اسکیم

(٦) دیگر مخصوص انعامی اسکیمیں

جواب: آج کل ملکی وبین الاقوامی سطح پر مختلف ناموں اور متنوع عنوانات کے حامل ''انعامی اسکیمیں'' عوام وملک کی فلاح وبہبوداور باہمی تعاون کے دلکش عنوان کے ساتھ سامنے آرہی ہیں، جن میں راتوں رات مال دار بننے کے سنہرے خواب دکھلا کر عوام سے روپیہ اکھٹا کیا جاتا ہے اور پھراس میں سے ایک معمولی مقدار''انعام'' کے نام پرعوام میں تقسیم کر کے باقی رقم ہڑپ کر لی جاتی ہے،ان میں سے اکثر میں ''جوا'' پایا جاتا ہے،بعض میں اس کے ساتھ سود کی خرابی بھی ہے،اس لئے ان کا حکم جاننے سے پہلے''قمار''یعنی جوا کی وضاحت ضروری ہے۔

قمار ہراس معاملے کو کہتے ہیں جس میں کسی مال کا مالک بنانے کوایسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے جس کے ہونے نہ ہونے دونوں کا یکساں امکان ہواوراسی بناء پرنفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانب بھی برابرہوں،بالفاظ دیگر''کسی غیریقینی واقعہ پر اپنا مال داؤ پر لگا دینا۔''

قال العلامة الجصاص رحمه اللّٰه تعالیٰ: وحقيقته تمليك المال علی وجو ...... (الاحكام القرآن : صـ ٥٥٢)

قال فی رد المحتار : "تعليق التمليك على الخطر والمال من الجانبين ." (در المختار :٣/٣٥٥)

قال العلامة الشوكانی رحمه اللّٰه تعالیٰ: الميسر ميسران ميسر اللهو، وميسر القمار، فمن ميسر اللهو النرد، والشطرنج، والملاهی كلها، وميسر القمار ما يتخاطر الناس عليه، ای فيه مخاطرة الربح والخسارة، بانواع من الالعاب او الشروط ككل انواع القمار الموجودة والتی يمكن ان توجد ."

(تفسير فتح القدير للشوكانی : ١/٣٣٦).

وفي الموسوعة الفقهية "قال ابن حجر المكي :الميسر: القمار بأي نوع كان، وقال المحلي "صورة القمار المحرم التردد بين ان يغنم، وان يغرم ." (الموسوعة الفقهية : ٣٩/٤٠٤)

قمار کی مذکورہ بالا تعریف سے معلوم ہوا کہ سوال میں درج شدہ تمام اسکیمیں قمار میں داخل ہیں، نیز ان میں سے بعض میں قمار کے ساتھ ''سود'' بھی پایا جاتا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱ تا ۵) فیوچر اسٹریٹجیز اسکیم اور اس سے ملتی جلتی اسکیموں میں عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ تمام لین دین اسکیم میں حصہ لینے والے شرکاء براہ راست ایک دوسرے سے کریں گے، صرف کمپنی کو اس کے ''سروس چارجز'' یعنی اخراجات کی مد میں کچھ رقم ملے گی، حالانکہ یہ اسکیم اور اس قسم کی دوسری تمام اسکیمیں صاف طور پر ''جوا'' پر مشتمل ہیں اس لئے کہ ان میں رقم لگانے کے بعد جہاں اس بات امکان ہے کہ یہ رقم مع اضافہ کے ملے گی وہاں اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اصل رقم ہی ضائع ہو جائے، مثلاً: اس طرح کہ کمپنی نے نئے ممبر کی طرف جو فارم فروخت کرنے کے لئے بھیجے تھے ممکن ہے وہ کمپنی کی طرف سے مقررہ مدت میں واپس نہ بھیجے جاسکیں، یا جن گاہکوں کو آگے یہ فروخت کئے جائیں وہ اس مدت میں ان کو مکمل کرکے کمپنی کو ارسال نہ کرسکیں، یا فارم میں غلطی ہو جائے اور کمپنی فارم کو مسترد کردے، ان تمام صورتوں میں اصل رقم ضائع ہو جائے گی، لہٰذا یہ ''جوا'' ہے۔

نیز ان اسکیموں کے جاری کرنے والے کا مقصد کوئی کاروبار یا تجارت کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنا ہوتا ہے اور ان میں حصہ لینے والوں کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ ان کی تھوڑی رقم اپنے ساتھ زیادہ رقم کھینچ لائے، لہٰذا ان میں قمار کے ساتھ ''سود'' کی خرابی بھی پائی جاتی ہے۔

سود اور جوا شریعت میں حرام ہیں لہٰذا ان اسکیموں سے اجتناب فرض ہے، اس کے علاوہ مختلف ناموں سے جتنی اسکیمیں ہیں، مثلاً: ڈبلیوٹی، این کوپن اسکیم، فیوچر کنگ کوپن اسکیم، پینٹا گونو انعامی اسکیم، بیسٹ فیوچر کوپن اسکیم وغیرہ ان سب کی یہی حقیقت اور سب کا یہی حکم ہے، البتہ ان میں کسی نے کم لالچ دیا ہوتا ہے کسی نے زیادہ۔

ایک بچی اسکیم اور اس کا حکم:

ایک اسکیم جو ۲۵۰ سے ۳۰۰ ممبران پر مشتمل ہوتی ہے، ہر ممبر ۳۰۰ روپے ماہوار دیتا ہے، ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے جس کا نام نکل آئے اس کو ۱۵۰۰۰ روپے یا اتنی مالیت کے برابر دوسری چیز دی جاتی ہے اور اس سے باقی قسطیں نہیں لی جاتیں۔

اس اسکیم میں بھی دو احتمال ہیں یا تو ہر ممبر کو انعامی رقم ملنا یقینی ہوگا یا اصل رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگا، اگر ملنا یقینی ہے تو یہ "سود" ہے کیوں کہ رقم جمع کروانے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ رقم اور زیادہ رقم لے کر آئے اور اسکیم چلانے والے بھی اس کی ترغیب اور لالچ دلاتے ہیں کہ ممبر قرعہ اندازی میں حصہ لے کر نام نکلنے پر زائد رقم حاصل کرے۔

اگر اصل رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہے تو یہ جوا ہے۔ سود اور جوا دونوں حرام ہیں، ان سے بچنا فرض ہے۔

جوا کے مفاسد:

جوے کا سارا کھیل اس پر موقوف ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے نقصان پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع، ہارنے والے کا نقصان ہی نقصان، پھر اس کاروبار سے دولت کی گردش بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے اور اس کاروبار کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار کی مجموعہ حیثیت سے قوم کی تباہی اور ملکی معیشت کی بربادی ہے، بخلاف تجارت اور لین دین کی جائز صورتوں کے کہ ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلے سے دولت کی گردش بڑھتی ہے اور خریدنے اور بیچنے والے دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں سود اور جوئے کے نئے نئے طریقے اور نئی نئی اسکیمیں ایجاد کر لی گئی ہیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے اور جو نقصان ہوتا ہے وہ سب پر برابر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا اور جس کو رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا حالانکہ اس میں وہ سب نقصانات موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوئے میں پائے جاتے ہیں بلکہ ایک حیثیت سے اس کا نقصان اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے

خراب اثرات دوررس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا اور سرمایہ ایک محدود دائرے میں مرتکز ہو جائے گا حالانکہ اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ اس میں ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم کا اصول بیان فرماتے ہوئے اس طرح فرمادیا:

"کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکم ."

یعنی مال فیئے (جو غنیمت کی ایک قسم ہے) کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کی غرض یہ ہے کہ دولت سمٹ کر سرمایہ داروں کی تجوریوں میں جمع نہ ہو جائے۔

اسلام میں منافع کا تصور:

اسلام منافع کی نفی نہیں کرتا، البتہ اس کے حصول میں کھلی چھوٹ بھی نہیں دیتا، محدود پابندیاں عائد کرتا ہے جن کی رعایت نہ کرنے سے معاشی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اجتماعی نقصان ہوتا ہے ان کی رعایت کرتے ہوئے انسان جتنا نفع چاہے حاصل کرلے، اسلام نے زیادہ سے زیادہ منافع کی کوئی حد مقرر نہیں کی، اگر اسلامی اصول کے مطابق کوئی کاروبار کیا جائے تو اس کا پورے معاشرے پر یہ مفید اثرات مرتب ہوتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہوتی، بلکہ اس منافع کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے معاشرے کے سب افراد اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(ماخوذ از رجسٹر نقل فتویٰ دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی فتویٰ، ۱۴/۳۲۴)

سیمنز (تولیدی جوہر) کی خرید وفروخت:

آج کل جانوروں کی اچھی سے اچھی نسل تیار کرنے کے لئے مصنوعی طریقے سے ان کی نسل کشی کی جاتی ہے، جس میں کسی اعلیٰ نسل کے نر جانور سے نطفہ حاصل کر کے اس سے بڑی تعداد میں سیمنز (تولیدی جوہر) تیار کر لئے جاتے ہیں، پھر بوقت ضرورت ڈاکٹر اپنے ہاتھ سے شیشے کی نلی کے ذریعے اس سیمن کو مادہ کے رحم میں رکھ دیتا ہے اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج کل وسیع پیمانے پر ان سیمنز کی خرید وفروخت کی جاتی ہے، اس شعبہ سے وابستہ بعض حضرات کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ مختلف شہروں میں حکومت کے بڑے بڑے فارم ہیں جہاں نطفہ سے سیمنز حاصل کر کے سرکاری طور پر ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے، جانوروں کے اعلیٰ اور عمدہ نسلیں جو یہاں پاکستان میں دستیاب نہیں ہیں بیرون ملک سے خود حکومت ان کے سیمنز خرید کر بڑی تعداد میں یہاں فروخت کرتی ہے، الغرض یہ کاروبار ایک بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ مصنوعی طریقے سے نسل کشی کرنا اور اس کے نتیجے میں حاصل شدہ جانوروں کا دودھ اور گوشت جائز اور حلال ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے تو جب ان سیمنز کا استعمال اور ان سے انتفاع جائز طریقے سے ممکن ہے تو کیا اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی یا شرعاً اس خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟

ہمارے علماء کرام اور اکابر رحمہم اللہ مادہ منویہ کی بیع کو اس کے نجس، غیر متقوم اور غیر مال ہونے کی بناء پر ناجائز کہتے ہیں تاہم فقہاء کرام رحمہم اللہ کی کچھ عبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر نجس چیز کسی دور میں جائز طریقے سے قابلِ انتفاع ہو جائے تو اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی چنانچہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ امداد الاحکام میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان اقوال کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی بھی قیمت عرفاً ہو جائے تو اس کی بیع وشراء صحیح ہے۔'' (۳/۵۵۳)

اور فقہاء مالکیہ میں سے بعض فقہاء بیع النجس کو بوجہ منتفع بہ ہونے کے عند الضرورت جائز اور بعض مکروہ قرار دیتے ہیں جبکہ فقہ شافعی کے اصول وقواعد سے واضح طور پر اس کا جواز معلوم ہوتا ہے اور بر مذہب شافعی اس بیع کی صحت میں بظاہر کوئی مانع بھی نہیں ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات دریافت طلب ہے کہ آج کل جبکہ یہ سیمنز قابل انتفاع ہو گئے ہیں، ان کا ضبط واحصاء بھی ممکن ہے، نیز عرفاً متقوم بھی سمجھے جاتے ہیں تو آیا ان کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہوگی یا اب بھی ان کو ناجائز ہی کہا جائے گا؟ آں محترم سے مفصل اور محقق جواب کی درخواست ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ (عبدالرؤف سکھروی)

جواب: واضح ہو کہ جانوروں کی افزائش نسل ایسی چیز ہے جو مختلف انسانی ضروریات کے حوالے سے مفید بلکہ محتاج الیہ ہے، اب اس کی دو صورتیں ہیں ایک فطری یعنی نر و مادہ کا جفتی کرانا جس

کے لئے عموماً اسے کرایہ پر لئے جانے کی ضرورت پڑتی ہے، دوسرے مصنوعی یعنی سوال میں مذکورہ طریقہ سے جو ہر تولیدی کو مادہ کے رحم میں پہنچانا، اب جہاں تک نر کو اجارہ پر لینے کا تعلق ہے تو منسلکہ عبارات ملاحظہ کرنے اور کتب فقہ کی مراجعت سے ظاہر ہوا کہ ''اجارہ لعسب التیس'' جیسا کہ پہلے ناجائز تھا اس زمانے میں بھی اس کا یہی حکم ہے کیوں کہ اگر اس ''ماء مہین'' کو ضرورت وحاجت کی بناء پر متقوم اور مباح الانتفاع مانا جائے اور اس کی بیع وشراء کو فی نفسہ جائز بھی کہا جائے تب بھی اجارہ کی بنیادی شرائط میں خلل ہونے کی وجہ سے مثلاً: مستاجر کے غیر مقدور التسلیم ہونے اسی طرح اس کے مجہول ہونے کی وجہ سے یہ اجارہ جائز نہیں، جیسا کہ منسلکہ حوالہ جات وعبارات میں ''الکوکب الدری'' ج ۲، ص ۳۲۱ ''المبسوط'' ج ۱۶، ص ۴۱ '' الدر مختار'' ج ۶، ص ۵۵ ''اعلاء السنن'' ج ۱۶، ص ۱۶۸ سے ظاہر ہے۔

البتہ اس مادہ یا اس سے اخذ کئے گئے جوہر کے منفصل ہونے اور علیحدہ طور پر حاصل ہونے کے بعد اس کی بیع وشراء صحیح ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فقہی طور پر مبیع کے لئے جو بنیادی دو شرطیں ہیں یعنی مال ہونا اور متقوم ہونا تو ان میں سے پہلی چیز عرف وعادت پر مبنی ہوتی ہے اور آج کل جب یہ مادہ عرفاً ضرورت کی بناء پر محتاج الیہ ہونے کی وجہ سے مرغوب فیہ ہے جو کہ مدخر لوقت الحاجۃ بھی ہے، لہٰذا اسے مال مانا جائے گا۔

قال ابن عابدین رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: المراد بالمال ما یمیل الیہ الطبع ویمکن ادخارہ لوقت الحاجۃ، والمالیۃ تثبت بتمول الناس کافۃ او بعضھم، والتقوم یثبت بھا وباباحۃ الانتفاع شرعا، فما یباح بلا تمول لا یکون مالا کحبۃ حنطۃ وما یتمول بلا اباحۃ انتفاع لایکون متقوما کالخمر، واذا عدم الامر ان لم یثبت واحد منھما کالدم، بحر ملخصا...... وحاصلہ ان المال اعم من المتقوم لان المال مایمکن ادخارہ ولو غیر مباح کالخمر والمتقوم مایمکن ادخارہ مع الاباحۃ......وفی البحر عن الحاوی القدسی : المال اسم لغیر الآدمی، خلق لمصالح الآدمی وامکن احرازہ والتصرف فیہ علی وجہ الاختیار.'' (در المختار: ۴/ ۵۰۱ـ ۵۰۲)

البتہ متقوم ہونا چونکہ ''حل الانتفاع شرعاً'' پر موقوف ہے اس لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے شرعاً انتفاع جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک یہ مادہ ''سیمنز'' چونکہ نجس العین ہے اور مبیع کے لئے طاہر ہونا شرط ہے۔

كما في مجموعة الفتاوىٰ نقلا عن احياء علوم الدين و الزبد ونور الانوار وغيره " فيعتبر فيه (المبيع) ستة شروط : الاول ان لا يكون نجسا في عينه، فلا يصح بيع كلب و خنزير و لا يجوز بيع الخمر، في المنهاج: وللمبيع شروط: طهارة عينه فلا يصح بيع الكلب و خمر المتنجس الذى لا يمكن تطهيره كالخل و اللبن، وفي الزبد: و يشترط في المبيع ان يكون طاهرا، وفي نور الانوار : وله شروط : الاول ان يكون طاهرا، او يطهر بالغسل فلايصح بيع كلب و خنزير وفروعهما و الميتة كالعاج و جلدها قبل الدباغ و السرقين و الخمر ." (٣/ ٣٢-٣٣)

تو اس بناء پر اس کی خرید وفروخت ناجائز ہونی چاہیے لیکن دوسری طرف فقہاء کرام نے بیع العذرة والسرقین اور شراء شعر الخنزیر کو منتفع بہ ہونے کی وجہ سے اور اس کی طرف حاجت ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، یہ ضرورت وحاجت سیمنز کی بیع وشراء اور استعمال میں بھی ہے، لہٰذا یہ بھی مال متقوم اور اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہونی چاہیے کیوں کہ ''سیمنز'' کے استعمال سے جو مقصد ہے، عادی طریقۂ تناسل سے اتنے وسیع پیمانے پر اس کا حصول اگر متعذر نہیں تو متعسر ضرور ہے۔ وھو ظاہر

نیز یہ کہ نجس چیز سے فائدہ اٹھانے کا جواز اور اس کی بیع وشراء کی صحت اس کے متبادل کے متعسر ہونے پر بھی موقوف نہیں، صرف حاجت کا تحقق ہی کافی ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے:

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: تنبيه : لم يذكروا حكم دود القرمز :اما اذا كانت حية فينبغي جريان الخلاف الآتي في دود القز وبزره وبيضه، واما اذا كانت ميتة وهو الغالب فانها على ما بلغنا

تخنق في الكلس او الخل، فمقتضى ما مر بطلان بيعها بالدراهم لانها ميتة،، قد ذكر سيدى عبد الغنى النابسى فى رسالة ان بيعها باطل وانه لا يضمن متلفها لانها غير مال .

قلت: وفيه انها من اعز الاموال اليوم، ويصدق علها تعريف المال المتقوم ويحتاج اليها الناس كثيرا فى الصباغ وغيره، فينبغى جواز بيعها كبيع السرقين والعذرة المختلطة بالتراب كما ياتى، مع ان هذه الدودة ان لم يكن لها نفس سائلة تكون ميتة لها طاهرة كالذباب والبعوض وان لم يجز اكلها وسياتى ان جواز البيع يدور مع حل الانتفاع، انه يجوز بيع العلق للحاجة مع انه من الهوام، وبيعها باطل، كذا بيع الحيات للتداوى، وفى القنية: وبيع غير المسك من دواب البحر لو له ثمن كالسقنقور وجلود الخز ونحوها يجوز والا فلا، وجمل الماء قيل يجوز حيا لا ميتا والحسن اطلق الجواز اه فتأمل ." (درالمختار : ۵/ ۵۱_۵۲)

وقال فى شرح التنوير: " عن ابى يوسف: يكره الخرزبه (بشعر الخنزير) لانه نجس ."

قال ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ(قوله لا نه نجس) : فيه ان النجاسة لا تنافى حل الانتفاع عند الضرورة كما علمت، لكن علل الزيلعى للكراهة بأن الخرز يتأتى بغيره، ومثله فى الفتح، وحيث تأتى بغيره فلا ضرورة فلا يحل الانتفاع بالنجس، قال فى الفتح: الا ان يقال ذلك فردتحمل مشقة فى خاصة نفسه فلا يجوز ان يلزم العموم حرجا مثله اه:وحاصله ان تاتى الخرز بغيره من شخص حمل نفسه مشقة فى ذلك لا تزول به ضرورة الا حتياج اليه من عامة الناس " (ج۵،ص ۷۲)فعلم من هذا جواز حل الانتفاع بالنجس عند الحاجة وان لم تتحق الضرورة المصطلحة۔

وفی التنویر وشرحه: "کره بیع العذرة رجیع الآدمی خالصة، لا یکره بل یصح بیع السرقین ای الزبل خلافا للشافعی، وصح بیعها مخلوطة بتراب ...... کما صح الانتفاع بمخلوطها، ای العذرة بل بها خالصة علی ما صححه الزیلعی ...... وفی الملتقی ان الانتفاع کالبیع ای فی الحکم فافهم" قال ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ: "قوله فی الملتقی ان الظاهر انه اشار بنقله الی ان تصحیح الانتفاع بالخاصة تصحیح لجواز بیعها ایضا، وقوله فافهم تنبیه علی ذلك" (٦/٣٨٥) وظاهر ان جواز البیع السرقین والعذرة المخلوطة بل والخالصة لیس مبنیا علی الضرورة المصطلحة بل عَلی الحاجة الی نموِ المستغلات ای علی جلب النفع، والحاجة فی مسئلتنا لیس بأدون من هذا کما لا یخفیٰ علی متبصر .

حاجت یہاں بہرحال متحقق ہے کیوں کہ موجودہ دور میں تیز رفتار اور کثیر آبادی والی دنیا کو اتنے زیادہ وسائل درکار ہیں کہ ایسی چیزوں میں مصنوعی طریقہ اختیار کئے بغیر چارۂ کار نہیں۔

دوسری بات یہ کہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح کے مطابق کسی چیز کا نجس ہونا اس کی بیع کے عدم جواز کی وجہ نہیں ہوسکتی بلکہ اس سے جو انتفاع کیا جاتا ہے، اگر وہ فی نفسہ مباح ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں، کما فی بیع العذرة والسرقین .

اب سیمنز سے انتفاع کی جو صورت ہے کہ اسے رحمِ مادہ میں پہنچا کر جودۃ نسل اور افزائش نسل کے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہ فی نفسہ ایک جائز انتفاع ہے اور اس کی طرف حاجت بھی ہے، نیز یہاں انتفاع چونکہ استعمال الشئی فی محلّہ وموضعہ کی صورت میں ایک فطری مقصد کے حصول کے لئے ہے، اس بناء پر متقوم اور قابل انتفاع ہے اور اس (یعنی نفسِ انتفاع) جواز میں قید الحاجۃ کی بھی حاجت نہیں، لہٰذا اس کی بیع وشراء جائز ہے۔

یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیع دودالقز اس لئے جائز نہیں کہ بذاتہ منتفع بہ نہیں بلکہ انتفاع اس سے حاصل شدہ چیز سے ہے۔ کما فی الهدایة والفتح وغیرها من الکتب .

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہاں سیمنز کی ذات میں تبدیل ماہیت ہوکر اس سے بچہ حاصل ہوتا ہے، لہٰذا یہ لذاتہ منتفع بہ ہے، کیوں کہ مادیات میں ارتقاء اور تطور کا طریقہ یہی ہے کہ ہر پہلا مرحلہ دوسرے کے لئے بذاتہ موقوف علیہ ہوتا ہے اگر چہ دوسرے مرحلے پر پہنچنے کے بعد پہلا مرحلہ معدوم ہوجاتا ہے۔ کما ھو قاعدۃ المعدات .

فی الهداية : "ولا يجوز بيع جلود الميتة قبل ان تدبغ لانه غير منتفع به .

قال المحقق بعد ذكر سوال يرد على المصنف : وهذا السوال ليس فی تقرير المصنف ما يرد عليه ليحتاج الى الجواب منه، فانه ما علل المنع الا بعدم الانتفاع به وانما يرد على من علل بالنجاسة ولا ينبغی ان يعلل بها بطلان البيع اصلا، فان البيع دائر مع حرمة الانتفاع وهی عدم المالية، فان بيع السرقين جائز وهو نجس العين لانتفاع به كما ذكرنا، واما جواز بيعها (الجلود) بعد الدباغة، فلحل الانتفاع بها حينئذ شرعاً، والحكم بطهارتها زيادة تثبت شرعا ." (هدايه مع الفتح : ج٦، ص٦٨) .... والله سبحانه وتعالىٰ اعلم . (ماخوذ از رجسٹر نقل فتوىٰ : ١٦٦/٤٣ دارالافتاء والارشاد كراچی)

شینل کمپنی کے کاروبار کا حکم:

سوال: ایک کمپنی ''شنیل'' کے نام سے موسوم ہے وہ ''ہیلتھ مشین'' جس کی قیمت تقریبا دس ہزار روپے ہے، بیچتی ہے، اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ جو یہ مشین خریدے گا اس کو کمپنی ممبر ایجنٹ بھی بنائے گی اور یہ ممبر بلاواسطہ صرف دو یا تین گاہک لانے کا مجاز ہوگا اور اس کو ہر گاہک پر تقریبا ایک ہزار چالیس روپے کمیشن دیا جائے گا۔

چونکہ اس کے لائے جانے والے گاہک بھی خریداری کے بعد ممبر اور ایجنٹ بن جائیں گے، وہ بھی اول کی طرح گاہک لانے کے مجاز اور کمیشن کے حقدار ہوں گے اور ان کے لائے ہوئے گاہکوں کی وجہ سے اول کو بھی کمپنی کچھ کمیشن دیتی ہے، اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، ممبر اور ایجنٹ زیادہ آنے کی وجہ سے اول ممبر اور ایجنٹ کا منصب بھی بڑھتا رہتا ہے، جس کو کمپنی مختلف ناموں

سے موسوم کرتی ہے، مثلاً: ایڈوانس منیجر وغیرہ، اسی منصب کی وجہ سے ان کو موبائل فون، گاڑی وغیرہ کی صورت میں انعامات بھی خاص اصول کے تحت ملتے ہیں، مندرجہ بالا تفصیل کے پیش نظر درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں

(۱) ''ہیلتھ مشین'' کی پوری قیمت ادا کرنا اور ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کمپنی کی رعایت کے مطابق ''ہیلتھ مشین'' کی قیمت میں سے تقریباً ساڑھے چھ ہزار روپے نقد ادا کرنا ہوتا ہے اور بقیہ ساڑھے تین ہزار روپے بعد میں جب اس خریدار کو محنت کی وجہ سے بونس اور کمیشن ملتا ہے اس سے وصول کئے جاتے ہیں، یہ نقد، ادھار کا معاملہ کرنا اور اس صورت میں ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) ہر ممبر کو بلاواسطہ گاہک لانے پر جو کمیشن ملتا ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟

(۴) ہر ممبر کو بالواسطہ ممبروں کی وجہ سے جو کمیشن ملتا ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟

(۵) منصب کے لحاظ سے موبائل فون وغیرہ کی شکل میں جو انعامات ملتے ہیں وہ جائز ہیں یا نہیں؟ (متعدد سائلین)

جواب: شریعت میں تجارت وکاروبار کے مشروع ہونے کی اصل حکمت وفلسفہ یہ ہے کہ روپے کی گردش سے حقیقی اثاثے اور خدمات وجود میں آئیں تاکہ معاشرے میں ہر فرد کے لئے ذریعہ معاش فراہم ہو سکے اور حقیقی اثاثوں وخدمات کی لین دین سے صحت مند معاشی سرگرمیاں وجود میں آسکیں، صرف ظاہری ہیر پھیر پر جس سے کوئی عملی فائدہ حاصل نہ ہو نفع کما لینا تجارت کے اصل منشاء کے خلاف ہے اور اس کی وجہ سے معیشت پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

[illegible] کمپنی کے کاروبار میں بھی یہی صورتحال ہے، ایک تو بنیادی عقد میں کئی خرابیاں ہیں [illegible] کے علاوہ بالواسطہ ممبر بننے پر پہلے گاہک کو رقم ملنا اور اس کو ایک مستقل منصوبہ بندی کے تحت تشکیل دینا شرعی تجارت کے مقاصد کے خلاف ہے اور اس جیسی تجارت کے لئے جو ایک بین الاقوامی کمپنی کی مصنوعات کو مہنگے داموں فروخت کرنے کا ایک سرمایہ دارانہ حربہ ہے، صحیح محمل تلاش کرنا اور جواز کی صورتیں نکالنا بھی شریعت کے مزاج ومذاق کے خلاف ہے کیوں کہ یہ سارے وصول الی الحرام اور اکتنازِ دولت کے حیلے ہیں جو کہ اسلامک فائنانس کے اغراض کے قطعاً خلاف ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے پہیے ہیں جس سے معاشرے کے افراد کی صلاحیتیں تعمیری

سرگرمیوں سے ہٹ کر ایک محدود مانگ کی چیز کو عام کرنے اور ترغیبات کے زور سے زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے میں صرف ہوتی ہیں، جو معاشرے کے لئے نقصان دہ اور ضرر عام کا باعث ہونے کی وجہ سے شرعاً غیر مستحسن ہے، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لا یجوز للمفتی تتبع الحیل المحرمة والمکروهة، ولا تتبع الرخص لمن اراد نفعه، فان تتبع ذلك فسق و حرم استفتاؤه ."

(اعلاء المواقعین : ٢/٥٣٥ ، دار البیان السعودیة)

وفی الطحطاوی علی الدر:" ویحرم التساهل فی الفتوی واتباع الحیل ان فسدت الاغراض . (١٧٥/٣)

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

(١) کمپنی کے پورے حالات کا جائزہ لینے اور بار بار غور وفکر کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ "شینل"، کمپنی کا موجودہ کاروبار اور اس کا طریقہ کار شرعی نقطہ نظر سے صحیح نہیں لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ جو لوگ وہاں جاتے ہیں ان کا اصل مقصد کمپنی کا ایجنٹ بن کر مقررہ اصول کے تحت کمیشن حاصل کرنا ہے، لہٰذا اس کا شرعی حکم بھی اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے لگایا جائے گا۔ لأن الأمور بمقاصدھا .

کسی کمپنی کا ایجنٹ بننا اور شرعی اصول کے مطابق دیانتداری سے محنت کر کے اجرت حاصل کرنا تو بلاشبہ جائز ہے، لیکن اس جیسے عقود ومعاملات کیلئے شریعت نے کچھ خاص قوانین مقرر فرمائے ہیں، جن کی رعایت انتہائی ضروری ہے اور ان میں کسی ایک شرط میں خلل آنے سے پورا معاملہ اور کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے۔

ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا شریعت کے رو سے "عقد اجارہ" ہے اس کی بہت سی شرائط ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ایسی خاص شرط نہ لگائی جائے جو اس معاملے کا حصہ نہ ہو بلکہ خارجی چیز ہو اور اس میں ایک طرف یا دونوں کا فائدہ ہو، لہٰذا اگر کوئی ایسی شرط لگائی جائے تو یہ معاملہ اور اس سے حاصل شدہ کمیشن وغیرہ شرعی رو سے ناجائز ہوگا۔

"شینل"، کمپنی میں ایجنٹ بننے کے لئے کمپنی کی طرف سے "ہیلتھ مشین" خریدنا شرط اور

ضروری قرار دیا گیا ہے جس کے بغیر کمپنی ایجنٹ بنانے پر تیار نہیں اور ظاہر بات ہے کہ ایجنٹ بنانے میں مشین خریدنے کی شرط لگانا شرعاً نہ اس معاملے کا حصہ ہے اور نہ اس کا تقاضا ہے اور اس کمپنی کا فائدہ ہے، لہٰذا ایجنٹ بننے بنانے کا یہ معاملہ شرعی رو سے ناجائز ہے، واضح رہے کہ اس صورت میں یہ تاویل صحیح نہیں کہ اجارہ اس وقت محقق ہی نہیں ہوتا اس لئے وہ مشین کی خریداری سے مشروط نہیں، کیوں کہ کمپنی مشین خریدنے کے بعد گاہک کو اس وقت ایجنٹ نہیں بناتی بلکہ اس کو ایک حق اختیار دے رہی ہے کہ اگر آپ چاہیں تو ہمارے ایجنٹ بن سکتے ہیں۔

یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں کہ یہ بات تو اس شخص کے بارے میں ٹھیک ہے جو علاج وغیرہ کے لئے مشین خریدنا چاہتا ہو، لیکن جو شخص اس غرض سے جائے کہ مشین خرید کر ایجنٹ بنا چاہتا ہوں تو وہ مشین خریدتے ہی عملی طور پر ان کا ایجنٹ بن جاتا ہے، اس پر کئی قرائن وشواہد موجود ہیں، مثلاً:

۱۔ اگر مقصود صرف ایجنٹ بننے کا حق لینا دینا ہے تو پھر شرعی رو سے بھی اور عقلی اعتبار سے بھی ایجنٹ بنتے وقت ایجاب وقبول ضروری ہے، جبکہ یہاں کام اور محنت شروع کرتے وقت کمپنی اور ملازم کے درمیان الگ ایجاب وقبول نہیں ہوتا بلکہ خریدتے ہی طے شدہ معاہدہ کی بناء پر وہ کام شروع کر دیتا ہے اور کمپنی اسے بونس دینا شروع کر دیتی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسی وقت سے یہ اجیر اور ایجنٹ ہے نہ کہ بعد میں کسی مرحلے پر ایجنٹ بنے گا۔

۲۔ یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ لوگوں کا وہاں جانے سے مقصد ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا ہوتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ یہ جس مقصد سے وہاں جاتے ہیں یعنی ایجنٹ بننے کے لئے، تو ایجنٹ بن کر ہی واپس ہوتے ہیں نہ کہ صرف ایجنٹ بننے کا حق حاصل کر کے۔

۳۔ کمپنی ہر اس شخص کے ساتھ ادھار کی رعایت کرتی ہے جو وہاں کا ایجنٹ بننے کی غرض سے حاضر ہو کر مشین خریدے اور طرفین یہ عقد اس بناء پر کرتے ہیں کہ خریدار محنت کر کے بونس کما کر بقیہ رقم ادا کر دے گا، تو اگر کمپنی کا مقصد ایجنٹ بنانا نہیں بلکہ ایجنٹ بننے کا حق دینا ہے تو پھر ہر ایک گاہک کے ساتھ ادھار کی رعایت کا کیا مطلب ہے؟ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ عملی طور پر ایجنٹ بنے ہی نہیں تو بقیہ رقم کہاں سے وصول کی جائے گی؟ لہٰذا ہر ایک گاہک کو ادھار کی رعایت دینا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کمپنی اسے عملی طور پر مشین خریدتے ہی ایجنٹ بنا دیتی ہے، ورنہ اس کی بقیہ رقم وصول ہونے کی کوئی معقول صورت نہیں ہوگی۔

٤۔ وہاں جانے والے عام طور پر بے روزگار اور پیسہ کمانے کے خواہشمند لوگ ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ وہاں جا کر محنت کر کے کچھ کمانے کیلئے جاتے ہیں نہ کہ صرف ایجنٹ بننے کا حق اور کاغذی دستاویز حاصل کرنے کیلئے۔

٥۔ ہر آدمی کو ایک (OPP) کلاس میں بٹھایا جاتا ہے، جس میں اسے ایجنٹ بننے کے فوائد وثمرات کے ساتھ ساتھ اصول وضوابط سے آگاہ کیا جاتا ہے، اگر صرف وہ ایجنٹ بننا چاہے گا تو اس وقت آ کر اصول وضوابط معلوم کر کے کام شروع کرے گا، لہٰذا اسی وقت کلاس میں شرکت کرنا کروانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ابھی سے ایجنٹ بن کر آگے محنت شروع کرے گا۔

مذکورہ بالا وجوہ سے واضح ہو گیا کہ اس کاروبار کے جائز ہونے کے لئے جو تاویل کی جاتی ہے وہ درست نہیں۔

(۲) اس میں مذکورہ مفاسد کے علاوہ بعض صورتوں میں جہالت اجل کی قباحت بھی ہے جو بیع کو فاسد اور ناجائز بنا دیتی ہے۔

(۳) جائز نہیں کیوں کہ جس کام پر کمیشن دیا جا رہا ہے وہ بذات خود ایک ناجائز کام ہے، لہٰذا اس پر ملنے والا کمیشن یا اجرت بھی جائز نہیں۔

(٤) یہ بھی ایک گناہ کے کام (کمپنی کے کلائنٹ بنانے) پر دیا جاتا ہے جو کہ جائز نہیں۔

(٥) اس کا بھی یہی حکم ہے۔

حاصل یہ کہ کمپنی کے اس کاروباری ڈھانچہ میں بعض چیزیں تو فی نفسہ ناجائز ہیں اور بعض میں اگرچہ بذات خود جواز کا پہلو ہے لیکن اسلامی تجارت کے نقطۂ نظر کے ہم آہنگ نہیں، لہٰذا اس کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

(ماخوذ از رجسٹر نقل فتوی : دارالافتاء والارشاد کراچی)

ٹریڈ مارک (TRAD-MARK) خرید وفروخت کا حکم:

ٹریڈ مارک یا تجارتی ناموں کی خرید وفروخت اس وقت یورپی ممالک کے علاوہ اسلامی ملکوں میں بھی جاری ہے کیا شرعاً بھی ٹریڈ مارک کو تجارتی طور پر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم کی تحقیق پیش خدمت ہے:

تجارتوں کی ترقی کے ساتھ تجارتی نام اور تجارتی علامت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ایک تاجر یا ایک تجارتی کمپنی مال تیار کرتی ہے اور اپنے تیار کردہ مال بہت سے لوگوں کو فراہم کرتی ہے اور بہت سے ممالک کو ایکسپورٹ کرتی ہے ایک ہی قسم کی مصنوعات اوصاف کے اختلاف کی بنیاد پر بہت مختلف ہوگئی ہیں اور یہ اوصاف مال تیار کرنے والی کمپنیوں یا افراد کے نام سے جانے جاتے ہیں، جب صارفین دیکھتے ہیں کہ منڈی میں فلاں کمپنی کے تیار کیے ہوئے مال کی اچھی شہرت ہے تو کمپنی کا نام سنتے ہی یا سامان پر اس کا ٹریڈ مارک دیکھتے ہی اسے خرید لیتے ہیں۔

اس طرح مصنوعات پر تجارتی نام اور ٹریڈ مارک گاہکوں کی زیادہ رغبت یا بے رغبتی کا سبب بن گیا ہے، اس لئے تاجروں کی نظر میں تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کی قیمت ہوگئی ہر وہ تجارتی نام جس نے لوگوں میں اچھی شہرت حاصل کر لی اس کے نام سے منڈی میں آئے ہوئے مال کی طرف خریداروں کا جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جو تاجر اس نام سے منڈی میں مال لاتا ہے اس کا نفع بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

جب سے یہ بات شروع ہوئی کہ لوگ ان کمپنیوں کے نام کو استعمال کرنے لگے جنہیں صارفین میں اچھی شہرت حاصل ہے تاکہ اس نام سے ان کی مصنوعات بازار میں کھپ جائیں اور اس کی وجہ سے عامۃ الناس کے دھوکہ کھانے کا مسئلہ پیدا ہوا اس وقت سے حکومت کی طرف سے تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کا رجسٹریشن ہونے لگا اور تاجروں کو دوسروں کے رجسٹر کرائے ہوئے ناموں اور ٹریڈ مارکوں کو استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا۔ تاجروں کے عرف میں رجسٹریشن کے بعد ان تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کی مادی قیمت ہوگئی اور تاجران ناموں کو مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے کیوں کہ انہیں ان تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں سے یہ امید ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے لوگ ان کی مصنوعات کی خریداری کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع جائز ہے؟ ظاہر ہے کہ نام یا علامت مادی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اس نام یا علامت کے استعمال کا حق ہے اور یہ حق اصالۃ صاحب حق کے لئے اسبقیت اور حکومتی رجسٹریشن کی وجہ سے ثابت ہوا ہے یہ حق فی الحال ثابت ہے مستقبل میں متوقع نہیں ہے نیز یہ ایک ایسا حق ہے جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوسکتا ہے لیکن یہ ایسا حق نہیں ہے جو پائیدار مادی چیز کے ساتھ متعلق ہو، لہٰذا فقہاء کے کلام سے ہم

نے جو قواعد نکالے ہیں ان کی روشنی میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دست برداری کے طور پر اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہیے، فروختگی کے ذریعہ جائز نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ حق ثابت اور مادی چیز میں استقرار پانے والی منفعت نہیں ہے۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہی فتویٰ دیا ہے اور انہوں نے اس مسئلہ کو مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کے مسئلہ پر قیاس کیا ہے اور اس سلسلہ میں ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کی وہ عبارت نقل کی ہے، جس کو ہم نزول عن الوظائف کے مسئلہ میں پیچھے نقل کر چکے ہیں پھر انہوں نے فرمایا:

اور کارخانے کا نام بھی مشابہ حق وظائف کے ہے کہ ثابت علی وجہ الاصالۃ ہے نہ کہ دفع ضرر کے لئے اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے، پس اس بنا پر اس عوض کے دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، گو لینے والے کے لئے خلاف تقوی ہے، مگر ضرورت میں اس کی بھی اجازت ہو جائے گی۔ (امداد الفتاوی: ۳/۸۷)

احقر کا خیال یہ ہے کہ تجارتی نام کا حق اور ٹریڈ مارکوں کا حق اگرچہ اصل میں حق مجرد ہے جو کسی مادی محسوس چیز میں ثابت نہیں لیکن حکومتی رجسٹریشن جس کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے اور بے تحاشا مال خرچ کرنا پڑتا ہے اور جس کے بعد اس نام پر ٹریڈ مارک کی قانونی حیثیت ہو جاتی ہے جس کا اظہار اس تحریری سرٹیفکیٹ کے ذریعہ ہوتا ہے جو رجسٹریشن کرانے والے کو حکومت کے کاغذات میں اندارج کے بعد حاصل ہوتا ہے ان تمام مراحل کے بعد تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کا حق اس حق کے مثل ہو گیا جو کسی مادی چیز میں مستقر ہو اور تاجروں کے عرف میں یہ حق اعیان (مادی اشیاء) کے حکم میں ہو گیا لہٰذا بیع کے ذریعہ اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہیے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بعض اشیاء کو اعیان میں داخل کرنے میں عرف کا بڑا دخل ہے کیوں کہ علامہ ابن عابدین کے بیان کے مطابق مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اس کی مثال بجلی اور گیس ہے جو گزشتہ زمانوں میں اموال واعیان میں شمار نہیں ہوتی تھیں کیوں کہ یہ دونوں ایسی مادی چیز نہیں ہیں، جو قائم بالذات ہوں اور ان کا قبضہ میں کرنا بھی انسان کی طاقت میں نہیں تھا لیکن اب یہ دونوں چیزیں ان اہم قیمتی اموال میں سے ہیں جن کی خرید وفروخت کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کیوں کہ ان دونوں چیزوں میں حد درجہ نفع ہے اور ان کا احراز بھی ممکن ہے

لوگوں کے عرف میں بھی یہ دونوں چیزیں مال اور قیمتی چیز مانی جاتی ہیں۔

اسی طرح تجارتی نام ٹریڈ مارک رجسٹریشن کے بعد تاجروں کے عرف میں بڑی قیمتی چیزیں ہوتی ہیں اور ان پر یہ بات بھی صادق آتی ہے کہ حکومت کی طرف سے تحریری سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے ان پر قبضہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہر چیز کا قبضہ اس کے حسب حال ہوتا ہے اور ان پر یہ بات بھی صادق ہے کہ وقت ضرورت کے لئے ان کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے غرض یہ کہ کسی چیز کی مالیت پیدا کرنے کے لئے جو عناصر لازمی ہیں وہ سب تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں میں موجود ہیں صرف اتنی بات ہے کہ یہ ایسی مادی چیز نہیں جو قائم بالذات ہو اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں شرعاً کوئی مانع موجود نہیں ہے کہ ان کی خرید وفروخت کے جائز ہونے میں ان پر اموال کا حکم لگایا جائے لیکن اس جواز کی دو شرطیں ہیں۔

۱۔ پہلی شرط یہ ہیکہ وہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک حکومت کے یہاں قانونی طور پر رجسٹرڈ ہو کیوں کہ جو نام ٹریڈ مارک رجسٹر نہیں ہوتا اسے تاجروں کے عرف میں مال نہیں شمار کیا جاتا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع سے صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ لازم نہ آئے مثلاً اس کی صورت یہ ہو کہ خریدار کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب اس سامان کو بنانے والا وہ فرد یا وہ ادارہ نہیں ہے جو پہلے اس نام سے سامان تیار کرتا تھا اور اس نام یا ٹریڈ مارک کو خریدنے والا اس نیت سے اس کو خریدے کہ وہ حتی الامکان کوشش کرے گا کہ اس کی مصنوعات سابقہ مصنوعات کے معیار کے برابر ہوں گی یا اس سے بہتر ہوں گی۔

لہٰذا اس اعلان کے بغیر تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کا دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا چونکہ صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ کا باعث ہوگا اور التباس اور دھوکا حرام ہے، جو کسی حال میں بھی جائز نہیں۔(فقہی مقالات: ۱/۲۲۰)

تجارتی لائسنس کی خرید وفروخت کا حکم:

حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

ہم نے تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کا جو حکم اوپر بیان کیا ہے کہ ان دونوں کا عوض لینا جائز ہے بالکل یہی حکم تجارتی لائسنس پر بھی جاری ہوگا اس لائسنس کی حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں اکثر

ممالک اس کی بات اجازت نہیں دیتے کہ حکومتی لائسنس کے بغیر ایکسپورٹ یا امپورٹ کیا جائے بظاہر یہ چیز تاجروں پر ایک طرح کی پابندی ہے جسے اسلامی شریعت شدید ضرورت کے بغیر پسند نہیں کرتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر ملکوں میں یہی ہو رہا ہے لہذا موجودہ حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس شخص کے پاس امپورٹ یا ایکسپورٹ کا لائسنس ہو وہ دوسرے تاجر کے ہاتھ اس لائسنس کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ لائسنس کوئی مادی چیز نہیں ہے بلکہ دوسرے ملک میں سامان بیچنے یا دوسرے ملک سے سامان خریدنے کے حق کا نام ہے لہذا یہاں بھی یہی بات آئے گی جو ہم نے تجارتی نام کے بارے میں ذکر کی ہے کہ حق اصالۃً ثابت ہے لہذا مال کے بدلے میں اس سے دست برداری جائز ہوگی نیز حکومت کی طرف سے یہ لائسنس حاصل کرنے میں بڑی کوشش وقت اور مال صرف کرنا پڑتا ہے اور اس لائسنس کے حامل کو ایک قانونی پوزیشن حاصل ہو جاتی ہے جس کا اظہار تحریری سرٹیفکیٹ میں ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے حکومت یہ لائسنس رکھنے والے کو بہت سی سہولتیں مہیا کرتی ہے اور تاجروں کے عرف میں یہ لائسنس بڑی قیمت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ اموال والا معاملہ کیا جاتا ہے لہذا یہ بات بعید نہیں ہے کہ خرید وفروخت کے جائز ہونے میں اسے مادی اشیاء کے ساتھ شامل کر دیا جائے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب کہ حکومت یہ لائسنس دوسرے آدمی کے نام منتقل کرنے کی اجازت دیتی ہو اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کے نام ہو اور قانون دوسری کمپنی کی طرف اس کی منتقلی کی اجازت نہیں دیتا ہو تو اس لائسنس کی بیع جائز نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیوں کہ اس صورت میں لائسنس کی فروختگی سے جھوٹ اور دھوکہ لازم آئے گا اس لئے کہ لائسنس خریدنے والا بیچنے والے ہی کے نام سے استعمال کرے گا، نہ کہ اپنے نام سے، لہذا ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا، البتہ اگر لائسنس یافتہ شخص کسی کو اپنی طرف سے بیچنے اور خریدنے کا وکیل بنا دے تو اس صورت میں اس وکیل کے لئے اس لائسنس کے ذریعہ خرید وفروخت جائز ہوگی۔ (فقہی مقالات: ۱۱/۲۲۳)

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ لائسنس مال نہیں ہے جبکہ مبیع کا مال ہونا انعقاد بیع کیلئے شرط لازم ہے لہذا تجارتی اجازت نامہ (لائسنس) کی بیع جائز نہیں۔ (ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۶/۵۲۶)

لہذا احتیاط اسی میں ہے کہ اس کی خرید وفروخت نہ کی جائے۔

حق تصنیف فروخت کرنے کا حکم:

حق تصنیف فروخت کرنا اور اس کا عوض لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں اس بارے میں علماء کی دو رائے ہیں۔ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ کوئی ایسا ثابت شدہ حق نہیں جس کو فروخت کر کے عوض لیا جاسکے چنانچہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تصنیف کی مروج بیع جائز نہیں اس لئے مصنف کا کوئی مخصوص حق ہے ہی نہیں ہاں صرف مسودہ اس کی ملک ہے اس کو بیچ سکتا ہے۔(احسن الفتاوی : ٦/ ٥٣)

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم کی تحقیق یہ ہے کہ حق تصنیف مستقل حق ہے اس کو فروخت کرنا جائز ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

حق ایجاد ایک ایسا حق ہے جو عرف اور قانون کی بنیاد پر اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی ہو یا کسی چیز کی نئی شکل ایجاد کی ہو،حق ایجاد کا مطلب یہ ہے کہ تنہا اسی شخص کو اپنی ایجاد کردہ چیز بنانے اور منڈی میں پیش کرنے کا حق ہے پھر بسا اوقات ایجاد کرنے والا یہ حق دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو اس حق کو خریدنے والا ایجاد کرنے والے کی طرح تجارت کے لئے وہ چیز تیار کرتا ہے اسی طرح جس شخص نے کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی ہے اسے اس کتاب کی نشر واشاعت اور تجارتی نفع حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے بسا اوقات کتاب لکھنے والا یہ حق دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو اس حق کا خریدار نشر واشاعت کے بارے میں ان حقوق کا مالک ہو جاتا ہے، جو مصنف کتاب کو حاصل تھا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حق ایجاد اور حق تصنیف وحق اشاعت کی فروختگی جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہائے معاصرین کی دو رائیں ہیں، کچھ علماء نے اسے جائز کہا ہے اور کچھ علماء نے ناجائز کہا ہے۔

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا حق ایجاد یا حق اشاعت شریعت اسلامیہ کی طرف سے تسلیم شدہ حق ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے کوئی نئی چیز ایجاد کی، خواہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی چیز، بلاشبہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اسے اپنے انتفاع کے لئے تیار کرنے اور نفع کمانے کے لئے بازار میں لانے کا زیادہ حق دار ہے کیوں کہ ابوداؤد میں حضرت اسمر بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر بیعت کی تو

آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اس چیز کی طرف سبقت کی جس طرف کسی مسلمان نے سبقت نہیں کی تو وہ چیز اس کی ہے۔

(ابو داؤد فی الخراج قبیل احیاء الموات : ٤/٢٦٤ ، حدیث نمبر ٢٩٤٧)

علامہ مناویؒ نے اگر چہ اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ یہ حدیث افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے کے بارے میں آئی ہے، لیکن انہوں نے بعض علماء سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ہر چشمہ، کنواں اور معدن کو شامل ہے اور جس شخص نے ان میں کسی چیز طرف سبقت کی تو وہ اسی کا حق ہے، اس بات میں شبہ نہیں کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خاص ہونے کا اعتبار نہیں ہوتا۔

(فیض القدیر : ٦/١٣٨)

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حق ایجاد ایک ایسا حق ہے جسے اسلامی شریعت اس بنیاد پر تسلیم کرتی ہے کہ اس شخص نے اس چیز کے ایجاد کرنے میں سبقت کی ہے تو حق ایجاد پر وہی سارے احکام منطبق ہوں گے جو ہم نے حق اسبقیت کے بارے میں ذکر کئے ہیں وہاں ہم نے ثابت کیا تھا کہ بعض شافعیہ اور حنابلہ نے اس حق کی بیع کو جائز کہا ہے لیکن ان حضرات کے یہاں بھی راجح قول یہی ہے کہ حق اسبقیت کی بیع جائز نہیں ہے لیکن مال کے بدلہ میں اس حق سے دست بردار ہونا جائز ہے، وہاں ہم نے شرح منتہی الارادات سے بہوتی کی وہ عبارت بھی نقل کی ہے جو تحجیر اور حق جلوس فی المسجد سے دست برداری کے جواز کے بارے میں ہے اور اس کے علاوہ حق اسبقیت اور حق اختصاص کے دوسرے احکام بھی بیان کئے ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ حق ایجاد یا اشاعت سے عوض لے کر دوسرے شخص کے حق میں دست بردار ہونا جائز ہے، لیکن یہ حکم اصل حق ایجاد اور حق اشاعت کے سلسلہ میں ہے لیکن اگر اس حق کا حکومتی رجسٹریشن بھی کرالیا گیا ہو جس کے لئے موجد اور مصنف کو محنت کرنی پڑتی ہے مال اور اور وقت خرچ کرنا پڑتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ حق ایک قانونی حق ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ جاری کردیا جاتا ہے اور تاجروں کے عرف میں اسے قیمتی مال شمار کیا جاتا ہے تو یہ بات بعید نہیں ہوگی کہ اس رجسٹرڈ حق کو مروجہ عرف کی بنیاد پر اعیان واموال کے حکم میں کردیا جائے اور ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ بعض اشیاء کو اموال واعیان کے حکم میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے اس لئے کہ مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور رجسٹریشن کے بعد اعیان کی طرح اس حق کا

احراز بھی ہوتا ہے اور وقت ضرورت کے لئے اس کا ذخیرہ بھی کیا جاتا ہے تو اس عرف کا اعتبار کرنے میں کتاب وسنت کے کسی نص کی ممانعت نہیں ہے بہت سے بہت قیاس کی مخالف ہے اور قیاس کو عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے جیسا کہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہو چکی ہے۔

انہی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے علماء معاصرین کی ایک جماعت نے اس حق کی بیع کے جائز ہونے کا فتوی دیا ہے ان میں برصغیر کے علماء میں سے مولانا فتح محمد لکھنوی (مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد) مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا مفتی نظام الدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیو بند مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حق ایجاد اور حق تصنیف کی بیع کو ناجائز کہنے والوں نے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حق ایجاد مجرد حق ہے عین نہیں ہے اور حقوق مجردہ کا عوض لینا جائز نہیں، لیکن فقہاء کا جو کلام پیچھے تفصیل سے آچکا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقوق کا عوض لینے کا عدم جواز ہر حال میں نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے جو ہم نے حقوق کی مختلف قسموں میں بحث کرتے ہوئے بیان کی ہے۔

مانعین جواز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جس شخص نے کوئی کتاب دوسرے کے ہاتھ فروخت کی اس نے خریدار کو اس کتاب کا اس کے پورے اجزاء کے ساتھ مالک بنا دیا، لہٰذا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس کتاب میں جس طرح چاہے، تصرف کرے، لہٰذا اس کے لئے اس کتاب کی اشاعت بھی جائز ہونی چاہیے اور بیچنے والے کو خریدار پر اس سلسلے میں پابندی لگانے کا اختیار نہ ہونا چاہیے۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ کسی چیز میں تصرف کرنا الگ چیز ہے اور اس کی مثل دوسری چیز بنانا دوسری چیز ہے، کتاب خرید کردہ پہلی قسم کے تصرف کا تو مالک ہو گیا کہ اسے پڑھ کر نفع اٹھائے یا بیچے یا رعایت پر دے یا ہبہ کر دے اور اس طرح کے دوسرے تصرفات کرے لیکن اس جیسی دوسری کتاب کی اشاعت خریداری کے منافع میں شامل نہیں کہ کتاب کا مالک بننے سے اس کی حق اشاعت کا بھی مالک ہو جائے، اس کی مثال حکومت کے ڈھالے ہوئے سکے ہیں، ان سکوں کو اگر کسی نے خریدا تو ان سکوں کے دوسرے سکے ڈھالنا جائز نہیں ہوگا اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کسی چیز کی ملکیت اس بات کو مستلزم نہیں کہ مالک کو اس جیسی دوسری چیز بنانے کا حق ہو۔

مانعین کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ایجاد کردہ چیز کو تیار کرنے اور تصنیف کردہ کتاب کو طبع کرنے

سے موجد اور مصنف کا خسارہ نہیں ہوتا بہت سے بہت یہ ہوتا ہے کہ موجد اور مصنف کا نفع کم ہو جاتا ہے نفع کم ہونا الگ چیز ہے اور خسارہ ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ نفع کم ہونا اگر چہ خسارہ نہ ہو لیکن ضرر ضرور ہے، خسارہ اور ضرر میں واضح فرق ہے یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ جس شخص نے کوئی چیز ایجاد کرنے یا کتاب تصنیف کرنے کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقتیں جھیلیں، بے پناہ مال اور وقت صرف کیا، اس کے لئے راتوں کو جاگا، راحت و آرام قربان کیا وہ اس ایجاد اور کتاب سے نفع حاصل کرنے کا اس شخص سے زیادہ حقدار ہے جس نے معمولی سی رقم خرچ کر کے ایک منٹ میں وہ ایجاد شدہ چیز یا کتاب خرید لی پھر موجد اور مصنف کے لئے مارکیٹ تنگ کرنے لگا۔

مانعین جواز کی طرف سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ فرد واحد کے لئے حق اشاعت تسلیم کر لینا کتمان علم کا سبب بنتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کتمان علم تو اس صورت میں ہوتا، جب مصنف لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے اور دوسروں تک پہنچانے سے روکتا، لیکن جو شخص حق اشاعت محفوظ کرتا ہے وہ کسی کو کتاب پڑھنے، پڑھانے اور اس کے مضامین کی تبلیغ و اشاعت سے نہیں روکتا بلکہ وہ اس کی فروخت اور تجارت سے بھی نہیں روکتا وہ تو صرف اس بات سے روکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر کتب طبع کر کے نفع اٹھائے، یہ بات ہرگز کتمان علم کے دائرے میں نہیں آتی۔

مانعین جواز کی آخری دلیل یہ ہے کہ حق طباعت محفوظ کرنے سے کتاب کی اشاعت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اگر ہر شخص کو کتاب کی طباعت کا حق ہو تو اس کی نشر و اشاعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے گا اور اس کی افادیت زیادہ عام اور ہمہ گیر ہو جائے گی۔

یہ بات بلاشبہ امر واقعہ ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اگر ہم دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ دلیل ان کے خلاف پلٹ جاتی ہے، وہ پہلو یہ ہے کہ اگر ایجاد کرنے والوں کو اپنی ایجادات سے نفع حاصل کرنے میں اسبقیت کے حق میں محروم کر دیا جائے تو نئی ایجادات کے لئے بڑے منصوبوں کا خطرہ مول لینے سے ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی کیوں کہ ان کو احساس یہ ہوگا کہ انہیں معمولی نفع ہی ملے گا اور اسی طرح کے امور جن میں دو پہلو ہوں فقہی مسائل کا فیصلہ نہیں کرتے، جب تک کہ کسی چیز میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو، اس لئے کہ تمام مباح چیزوں میں ضرر و نفع

دونوں کے پہلو ہوتے ہیں۔

خاتمہ:

یہاں یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حقوق طبع و اشاعت کی بیع کے عدم جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے، چنانچہ اس مسئلہ پر انہوں نے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا جو ''جواہر الفقہ'' کا جز بن کر شائع ہو چکا ہے، لیکن اس رسالے کو لکھنے کے بعد انہوں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ اس مسئلہ پر دوبارہ تحقیق اور غور وخوض کر کے اس کو اور زیادہ منقح کیا جائے اور اس غور وخوض اور بحث و تمحیص کے بعد جو رائے بھی سامنے آئے، اس کو قبول کر لیا جائے، مگر حضرت والد ماجدؒ کو اس کی تحقیق کی فرصت نہ ملی تو انہوں نے دو مرتبہ یہ مسئلہ میرے سپرد فرمایا کہ میں اس کی مکمل تحقیق کروں، چنانچہ میں نے اس مسئلے کا مواد اسی وقت سے جمع کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں اس کی تکمیل مقدر نہیں تھی، چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے کافی عرصہ بعد اس مسئلہ کی تحقیق مکمل کرنے کی توفیق ہوئی .... اس طرح یہ بحث حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی بجا آوری میں لکھی گئی ہے، اگرچہ جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں وہ بظاہر ان کی رائے کے خلاف ہے، مگر وہ خود بھی اس مسئلے پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور آج یہ بات معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ان کی رائے کے موافق ہے یا مخالف۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ماخوذ از فقہی مقالات: ۱/۲۲۴)

کاریز کے پانی کی باری فروخت کرنا:

بعض علاقوں میں باغات کو کاریز سے سیراب کیا جاتا ہے وہاں کاریز کے مالک پانی کی باری کو ایسے لوگوں پر فروخت کر دیتے ہیں جن کا حصہ کاریز کے پانی میں نہیں ہوتا، اس طرح زمین کے بغیر صرف پانی کی باری فروخت کرنا مفتیٰ بہ قول کے مطابق درست نہیں، درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کاریز کے پانی کو بیچنے کی صورت میں دھوکہ (غرر) اور مقدار میں جہالت پائے جانے کا قوی احتمال موجود ہے کیوں کہ ہوسکتا ہے پورے سال کاریز میں پانی ہی نہ آئے اور آنے کی صورت میں مخصوص دنوں کم وزیادہ ہوسکتا ہے، اس لئے عام حالات میں اس کا بیچنا جائز نہیں، البتہ اگر کوئی خاص جگہ ایسی ہو کہ جہاں کاریزوں کے پانی ایک مقررہ مقدار میں ہر وقت موجود رہتا ہو جس سے

غرر اور جہالت ختم ہو جائے تو اس صورت میں ایسی جگہ کی باری چند متعین دنوں کے لئے بیچنا جائز ہوگا۔ (بحوث قضایا فقهیه : ص۹۳)

بینک کے کاغذات کی چھپوائی کا کام کرنا:

بینک اپنے اکاؤنٹ نمبرز کے کارڈ، فائلیں، چیک بک اور دیگر کاغذات وغیرہ چھاپنے کا ٹھیکہ دیتا ہے، تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ بینک میں جو کام حلال ہوتے ہیں، جیسے چیک بک اور کرنٹ اکاؤنٹ کے کاغذات وغیرہ، ان کے چھپوانے کا ٹھیکہ لینا درست ہے اور بینک کے حلال مال سے اس کی اجرت لینا جائز ہے (یعنی کام لیتے وقت یہ شرط رکھے کہ اجرت حلال مال سے دی جائے) البتہ جو کام بینک میں سودی لین دین کا ہوتا ہے اس کے کاغذات چھپوانے کا ٹھیکہ لینا جائز نہیں اور اس کی اجرت بھی حلال نہیں۔

(امداد الفتاوی : ۳۹۹/۳، جواہر الفقه : ۴۵۳/۲)

بیوی کے نام زمین خریدی تو مالک کون ہوگا؟

بعض لوگ پلاٹ یا مکان خریدتے وقت اپنے نام کے بجائے بیوی یا بچوں میں سے کسی کا نام لکھوادیتے ہیں یا بعض علاقوں میں زمین / پلاٹ قرعہ اندازی کے ذریعہ فروخت کئے جاتے ہیں، بہر حال کسی مصلحت سے اپنے نام کے بجائے گھر کے کسی فرد کے نام لکھدیا جاتا ہے، سرکاری کاغذات میں اسی کے نام پر ہوتا ہے جس کا نام ابتداء میں لکھوایا گیا ہے اب نام لکھوانے کی وجہ سے وہ شخص حقیقۃً مالک بن جائے گا یا نہیں اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے امداد المفتیین سے ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: زید نے کسی وجہ سے زمانہ ملازمت میں اپنے روپے سے اپنی بیوی کے نام ایک قطعہ زمین خریدا اور پھر اس پر اپنی رقم سے مکان تعمیر کرایا، اس کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا، ورثاء میں ایک لڑکا، ایک لڑکی اور شوہر ہے اور مکان بیوی کی وفات سے تا حال زید کے قبضہ میں ہے زید نے بچوں کی شادی کرادی اب زید خود اس کا مکان میں تنہا مقیم ہے تو مکان زید ہی کا ہوگا یا بیوی کا ترکہ شمار ہو کر بیوی کے ورثہ میں تقسیم ہوگا۔

جواب: صورت مذکورہ میں جس وقت زمین بیوی کے نام خریدی گئی اگر شوہر کی نیت یہ تھی کہ بیوی کو یہ زمین ہبہ کرتا ہوں پھر بیوی کو ہبہ کر کے مالکانہ قبضہ دیدیا ہو تب تو یہ زمین متوفیہ بیوی

کے ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگی اور اس پر تعمیر شدہ مکان زید کی ملک رہے گا اور اگر زید کی نیت ھبہ کرنے کی نہ تھی اور ایسے الفاظ بھی استعمال نہیں کئے کہ میں نے تجھے ہبہ کر دی (دیدی ہے) بلکہ محض کسی مصلحت سے سرکاری کاغذات میں بیوی کا نام اندارج کرادیا تھا تو اس سے بیوی مالک نہیں ہوئی بلکہ شوہر ہی مالک رہا، اب صرف شوہر ہی کا حق ہے، بیوی کے ورثاء کو اس میں حصہ نہ ملے گا، صرح بہ فی الفتاوی الاسعدیہ۔ (امداد المفتیین: ص ۷۰۰)

اس سے معلوم ہوا کہ صرف نام اندارج کرانے سے ملک ثابت نہ ہوگی بلکہ ثبوت ملک کے لئے ہبہ اور قبضہ ضروری ہے، جب تک خریدتے وقت یا خریدنے کے بعد باضابطہ ہبہ کر کے قبضہ میں نہ دیدیا جائے صرف نام لکھوانے کی بناء پر ملک کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔

والدین کی زندگی میں بیٹے کا اپنے نام جائیداد خریدنا:

سوال: عمرو نے اپنے والد زید کی حیات میں اس کے سرمایہ سے ایک مکان اور کچھ جائیداد اپنے نام سے خریدی، لیکن مرحوم نے کوئی تعرض نہیں کیا نہ اپنے نام منتقل کرایا، جائیداد مذکورہ پر ۱۹ سال تک زید مرحوم ہی قابض و متصرف رہے، اس کی آمدن کو اپنے تصرف میں لاتے رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زید کے انتقال کے بعد وہ زمین عمرو کی ہی رہے گی یا زید کے ترکے میں شامل سمجھی جائے گی؟

جواب: عمرو نے جو زمین اپنے والد کی حیات میں اپنے نام سے خریدی ہے اور باپ نے اس سے تعرض نہیں کیا اور نہ اپنے نام کروائی اور نہ انتقال رسمی کا مطالبہ کیا اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت کا ہے کہ عمرو کے نام فرضی بیع نامہ کسی مصلحت سے کی گیا نہ اصل بیع وشراء زید کے لئے تھی تو اس صورت میں وہ زمین عمرو ہی کی قرار پائے گی اور باپ کا اس کی آمدن میں تصرف کرتے رہنا یہ ملک والد کی علامت نہ ہوگی کیوں کہ اس کا مبنی اشتراک مصارف واختلاط ہے۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیه: نقلا عن البزازیه والوالجیة وعبارتها رجل تصرف زمانا فی ارض ورجل اخر ای الارض والتصرف ولم یدع ومات علی ذلك لم تسمع بعد ذلك دعوی ولده فتترك فی یدالمتصرف لان الحال شاهد او قلت وشراء ه علی اسمه تصرف قوی و كذا الادخال والاخراج علی اسمه واداء خراج

الحکومة وغیر ھا من لوازم البیع باسمہ .

(امداد الاحکام : ۳/۳۷۱)

مروج کمیٹی (بی سی) کا حکم:

آج کل ہر علاقے میں یہ رواج ہے کہ چند افراد مل کر ایک کمیٹی بنا لیتے ہیں، ہر ماہ کمیٹی کا ہر رکن ایک متعین مقدار میں رقم جمع کرتا ہے، پھر جمع شدہ رقم پر قرعہ اندازی ہوتی ہے، ارکان کمیٹی میں سے جس کا نام قرعہ میں برآمد ہو، اس کو جمع شدہ کل رقم ادا کر دی جاتی ہے، ایسے ہر ماہ چکر چلتا ہے، باری باری ہر رکن کمیٹی کو اس اکٹھی رقم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا رہتا ہے، اس کو امداد باہمی کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا شرعاً یہ صورت جائز ہے؟

بندہ کو اس معاملے میں چند شبہات ہیں:

(۱) ہر رکن اس امید پر شریک ہوتا ہے کہ اس کی تھوڑی رقم ایک کثیر رقم کھینچ کر لائے گی، گویا ایک بڑی رقم بطور قرض حاصل کرنے کے لئے ایک چھوٹی رقم اپنی جیب سے نکالتا ہے، استقراض کی یہ شکل غلط ہے کیوں کہ کل قرض "جر نفعا فھو ربوا" فرمایا گیا ہے۔

(۲) موجودہ صورت میں قرعہ اندازی سے قرض حاصل کرنا قمار نہ سہی، قمار کے مشابہ ضرور ہے۔

(۳) کوئی ممبر قرض کی رقم حاصل کرنے کے بعد اگر اپنا ماہانہ چندہ بند کر دے تو نزاع پیدا ہوگا، ظاہر ہے کہ ایسے معاملات شرعاً غلط ہوتے ہیں۔

(٤) یہ ممکن ہی نہیں بلکہ امر واقع ہے کہ جو واقعۃً ضرورت مند ہے، قرعہ میں نام نہ نکلنے کی وجہ سے عرصہ تک قرض حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود ہر ماہ چندہ کی رقم اداء کر کے مزید مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ امداد باہمی نہیں بلکہ ایک حاجت مند پر ظلم ہے۔

(۵) ہر رکن کمیٹی کو ہر ماہ چندہ دیتا ہے جس کمیٹی کا وہ خود بھی رکن اور جزء ہے، سو ہر فرد اپنے آپ کو قرض دینے والا ہوا یہ ایک مہمل امر ہے، بینوا توجروا۔

جواب: کمیٹی کا مروجہ طریقہ بلاشبہ ناجائز ہے، البتہ جواز کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ شرائط ذیل کی مکمل پابندی کی جائے۔

(۱) بنام کمیٹی جمع کردہ رقم سب شرکاء کی رضا سے بلا قرعہ کسی ایک کو بطور قرض دی جائے یا بذریعہ قرعہ دی جائے مگر قرعہ کے نتائج کو لازم نہ قرار دیا جائے بلکہ سب شرکاء کی رضا کو صرف تسہیل انتخاب کا ایک ذریعہ سمجھا جائے۔

(۲) ہر شریک کو ہر وقت الگ ہو جانے کا اختیار رہے، کوئی جبر نہ ہو بلکہ ایک یا چند مرتبہ رقم کسی شریک کو دے دینے کے بعد بھی ہر شریک کو علیحدہ ہو جانے کا پورا اختیار ہو اور اسے دی ہوئی رقم واپس لینے کے مطالبہ کا پورا حق ہو، اس پر شرکاء میں سے کسی کو اعتراض نہ ہو۔

(۳) ایک ماہ کی مدت کو لازم نہ قرار دیا جائے، ہر شریک کو ہر وقت بطور قرض دی ہوئی اپنی رقم کی واپسی کے مطالبہ کا حق ہو۔

شرائط مذکورہ کے تحت معاملہ کیا جائے تو اس پر سوال میں مندرج اشکالات وارد نہ ہوں گے، تفصیل یہ ہے:

(۱) اس اشکال کے دو جواب ہیں:

الف یہاں جر نفع مستقرض سے نہیں غیر سے ہے۔

ب جب ہر شخص کو ہر وقت الگ ہونے کا اختیار ہو گا تو یہ نفع مشروط نہ ہوا۔

(۲) شرط اول کے تحت قمار رہا نہ قمار سے مشابہت۔

(۳) یہ صورت تو ہر قرض میں ہوتی ہے کہ قرض خواہ کو مطالبہ کا حق ہوتا ہے، البتہ ایک ماہ کی تأجیل باطل ہے اور یہ بطلان شرط ثالث سے مرتفع ہو گیا۔

(٤) شرط ثانی کے تحت ہر شریک کو ہر مرحلہ پر اختیار ہو گا اور وہ جب چاہے اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکے گا تو یہ اشکال نہ رہا۔

(٥) قرض کمیٹی کو نہیں دیا جاتا بلکہ جس کے نام قرعہ نکلتا ہے اسے دیا جاتا ہے، کمیٹی کے منتظمین کا قبضہ وکالۃ ہے۔

سیاہ خضاب تیار کرنا اور فروخت کرنا:

خالص سیاہ خضاب کا استعمال سر میں ہو یا داڑھی میں مرد و عورت دونوں کے لئے حرام ہے، البتہ سیاہ خضاب تیار کرنا اور فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ایک محل اس کے جواز کا بھی موجود ہے یعنی دشمن پر ہیبت بٹھانے کے لئے مجاہدین استعمال کریں البتہ بنانا بیچنا خلاف اولیٰ ہے مگر

ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں جس کے متعلق یقین ہو کہ ناجائز طور پر استعمال کرے گا۔

(کما فی رد المحتار وغیرہ، احسن الفتاوی، ۸/۳۷٤)

تالاب میں مچھلی کی بیع جائز نہیں:

سوال: تالاب میں مچھلیوں کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: اگر یہ تالاب شروع ہی سے مچھلی کے لئے تیار نہیں کیا گیا، یا مالک نے خود اس میں مچھلیاں نہیں چھوڑیں تو یہ مچھلیاں تالاب کے مالک کی ملک نہیں اور غیر مملوک کی بیع باطل ہے۔

اور اگر ابتداء ہی سے تالاب مچھلیاں پکڑنے کے لئے تیار کیا گیا ہے یا اس میں مچھلیاں خود مالک نے چھوڑدی ہوں یا نہر وغیرہ سے مچھلیاں تالاب میں آئیں اور تالاب کے مالک نے پانی کا راستہ بند کرکے مچھلیاں تالاب میں محبوس کرلیں تو یہ مچھلیاں اس کی مملوک ہیں، مگر غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع فاسد ہے، البتہ اگر تالاب اس قدر چھوٹا ہو کہ بدوں تکلیف وحیلہ اس سے مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہوں اور مچھلیوں کی مقدار بھی معلوم ہو تو بیع درست ہے۔

قال فی شرح التنویر :وبیع مالیس فی ملکه لبطلان بیع المعدوم وماله خطر العدم لا بطریق السلم فانه صحیح .

وایضاً فیه: وفسد بیع سمك لم یصد(الی قوله)او صید ثم القی فی مکان لا یؤخذ منه الا بحیلة للعجز عن التسلیم وان اخذ بدونها صح وله خیار الرؤیة الا اذا دخل بنفسه ولم یسد مد خله فلو سده ملکه (الی قوله) وبیع طیر فی الهواء لا یرجع بعد ارساله من یده اما قبل صیده فباطل اصلاً لعدم الملك .

وفی الشامیة تحت (قوله وفسد بیع سمك لم یصد الخ)وفیه ان بیع مایس فی ملکه باطل کما تقدم لانه بیع المعدوم لیس بمال فینبغی ان یکون بیعه باطلا .

وایضا فیها: (قوله فلو سده ملکه) ای فیصح بیعه ان امکن اخذه بلا حیلة والا فلا لعدم القدرة علی التسلیم والحاصل کما فی الفتح انه اذا دخل السمك فی حظیرةفاماان یعدها لذلك اولا ففی الاول

یملکہ ولیس لاحد اخذہ ثم ان امکن ۔

(احسن الفتاوی : ٦/٤٨١)

وکیل بالشراء کا زیادہ قیمت وصول کرنا:

کمپنی بعض ملازمین کو اس مقصد کے لئے رکھتی ہے کہ وہ بازار سے سامان خرید کر لایا کریں، وہ کم قیمت میں سامان خرید کر دکاندار سے زیادہ قیمت کا بل بنواتے ہیں اور کمپنی سے زائد رقم وصول کرتے ہیں، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اسی طرح تعمیر مکان وغیرہ کا ٹھیکیدار لوہا وغیرہ کم قیمت پر خرید کر مالک مکان سے حساب میں زیادہ رقم ظاہر کر کے وصول کرتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ ملازم اور ٹھیکیدار وکیل بالاجرۃ ہیں ان پر لازم ہے کہ مالک کے ساتھ امانت داری کا معاملہ کریں اور صرف اصل قیمت وصول کرے، اصل قیمت سے زیادہ وصول کرنا، ناجائز اور حرام ہے۔

ایک حیلہ باطلہ:

اگر ٹھیکیدار یا ملازم مذکورہ بالا صورت میں یہ حیلہ اختیار کریں کہ یہ اشیاء پہلے اپنے لئے خریدیں پھر مہنگی کر کے کمپنی کو فروخت کریں شرعاً اس کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟ تو یاد رہے یہ ایک حیلہ باطلہ ہے، شرعاً اس کی ہرگز گنجائش نہیں کیوں کہ وکیل امین ہوتا ہے اس کا اپنے لئے خریدنا جائز نہیں۔

چوکیدار کی دھوکہ دہی:

سوال: میں ایک زیر تعمیر بنگلہ میں چوکیدار ہوں، مجھے مالک نے کہا کہ ہمیں تقریباً ۴۰ ٹرک ریتی، بجری کی ضرورت ہے آپ کسی ٹرک والے سے بات کریں میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کی اس نے کہا ویسے تو بارہ سو کا ٹرک ہے آپ کو ساڑھے گیارہ سو کے حساب سے دوں گا، یہ رعایت صرف آپ کے لئے ہے اب میں نے مالک کو اصل قیمت بتادی ہر دفعہ ۵۰ روپے خود رکھتا رہا تو کیا یہ پچاس روپے میرے لئے حلال ہیں یا نہیں؟

جواب: فی ٹرک پچاس روپے کے حساب سے جو آپ نے مالک سے زائد رقم وصول کی یہ شرعاً آپ کے لئے حلال نہیں کیوں کہ آپ مالک کے تنخواہ دار ملازم ہیں اور ریتی کی خریداری میں وکیل ہیں تو درمیان میں آپ کے لئے ۵۰ روپے وصول کرنا ہرگز حلال نہیں اس کا مالک کو واپس

کرنا لازم ہے۔

وکیل کا دکاندار سے کمیشن وصول کرنا:

بعض دکاندار کمپنی کے ملازم سے معاہدہ کرتے ہیں اگر آپ کمپنی کا سامان ہم سے خریدیں گے ہم آپ کو اتنے فیصد رعایت دیں گے، تو ملازم کے لئے یہ کمیشن رکھ لینا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب: یہ کمیشن کے نام سے سامان کی قیمت میں رعایت ہے جو کمپنی کا حق ہے کیوں کہ اگر وہ کمپنی کے لئے سامان نہ خریدتے تو اتنے کی اس کو نہیں ملتی تو معلوم ہوا کہ یہ اس شخص کا کمیشن نہیں بلکہ زیادہ سامان خریدنے کی وجہ سے سامان پر رعایت ہے، لہٰذا ملازم پر لازم ہے اصل قیمت کمپنی سے وصول کرے اور رعایت کمپنی کو واپس کردے اگر اب تک اپنے پاس ہی رکھتا رہا تو اتنی رقم حساب کر کے کمپنی میں جمع کرانا لازم ہے۔

آخری گذارش یہ ہے کہ حرام خوری سے بچنا اس زمانہ میں اگر چہ ایک مشکل کام ہے تاہم ناممکن نہیں ہے اگر آدمی ذرا سا ہمت سے کام لے تو اللہ تعالیٰ دست گیری فرماتے ہیں، لیکن یہ ہمت پیدا ہوگی اہل ہمت کو دیکھنے ان کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کے مشورے پر عمل کرنے سے، کسی نئی تجارت میں رقم لگانے یا نئی اسکیم میں شرکت، یا نیا کاروبار شروع کرنے سے پہلے کسی صالح دیندار عالم سے ضرور مشورہ کریں یہ کام شرعاً حلال بھی ہے یا نہیں مبادا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہری گھاس کو دیکھ کر نجاست کے ڈھیر میں کود پڑیں پھر برسوں دھونے سے پاکی نصیب نہ ہو اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو رزق حلال نصیب فرمائے۔

" اللّٰھم اکفنی بحلالک عن حرامک واغننی بفضلک عمن سواک. "

اس دعا کا بھی ورد رکھیں، ساتھ ہی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کثرت سے پڑھتے رہا کریں۔

" اللّٰھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه. "

وصلی اللہ تعالی علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ اصحابه اجمعین.

احسان اللہ شائق عفا اللہ عنہ

خادم افتاء و تدریس

جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی